عرض مترجم

ابتدا میں یہ کتاب ''لا بائیبل لے کوران اے لا سیانس (LA BIBLE LE CORAN ET LA SCIENCE) کے نام سے فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ پھر مصنف کتاب ''موریس باکائے اور الاستیر دی پانیل'' نے مل کر اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جس کی وجہ سے اس کی اشاعت خوب ہوئی۔ بہ کثرت لوگوں نے اس کو پڑھا اور پسند کیا۔ اس مقبولیت کو دیکھ کر ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا اردو میں بھی ترجمہ کر دیا جائے تا کہ خالص اردو دان طبقہ بھی مستفید ہو سکے۔ یہ کوشش اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کی گئی ہے۔

مترجم نے مصنف کے مافی الضمیر کو ادا کرنے کا پورا اہتمام کیا ہے۔ لیکن ترجمہ پھر بھی ترجمہ ہے۔ وہ بھی ایک مغربی زبان سے ایک مشرقی زبان میں۔ ظاہر ہے کہ دونوں زبانوں کی ساخت میں بعد المشرقین ہے۔ اس لئے ہر جگہ ترجمہ میں وہ زور نہ پیدا ہو سکا اور نہ بیان کی لطافت آ سکی۔ جو اصل کتاب کا وصف خاص ہے۔ تاہم بمصداق ''گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است'' اس کا مطالعہ بھی افادیت سے خالی نہ ہوگا۔

ترجمہ کو بعض اور لحاظ سے زیادہ جامع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تفصیلی حواشی کے ذریعہ بہت سی ایسی معلومات میں اضافہ کیا گیا ہے جو اصل کتاب میں نہیں تھیں۔ بعض مقامات کی توضیح وتشریح کر دی گئی ہے۔ اور بعض جگہ اختلافی نوٹ دیئے گئے ہیں۔ بائیبل کی عبارتوں کے ترجمے مترجم نے خود کرنے کی کوشش نہیں

کی بلکہ بائیبل کے اردو ترجمہ شائع کردہ پاکستان بائیبل سوسائٹی سے ہو بہو نقل کر دیا ہے۔تا کہ قارئین کے سامنے معیاری چیز آئے۔جہاں مصنف علام نے بائیبل سے کسی واقعہ کا صرف حوالہ دینے پر اکتفا کیا ہے۔وہاں مترجم نے حاشیہ میں بائیبل سے پوری پوری عبارتیں نقل کر دی ہیں۔قرآن مجید کا مصنف نے صرف ترجمہ دیا تھا۔مترجم نے آیات کو نقل کر کے ان کے سامنے اردو ترجمہ دیا ہے۔تا کہ قارئین ک وساتھ ہی ساتھ اصل متعلقہ آیات سے بھی واقفیت ہو جائے۔آیات کا ترجمہ کرنے کی مترجم نے خود جرات نہیں کی، بلکہ مروجہ تراجم میں صحیح ترین ترجمہ قرآن سے استفادہ کیا ہے۔غرض بائیبل اور قرآن کے ترجمے میں صحت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ترجمہ میں یہ اختلاف نمایاں طور پر نظر آئے گا۔کہ مترجم نے قرآن کے ساتھ اکثر جگہ تعظیمی لفظ مجید یا کریم لگا دیا ہے۔اس کے علاوہ اسکی طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آئے وہاں وہ آپ ﷺ پر درود بھیجے بغیر گذر جائے۔لہذا اس نے بالالتزام آپ ﷺ کے نام مبارک کے ساتھ ﷺ کا اضافہ کر دیا ہے۔

غرض مترجم نے جرات سے کام لے کر اس طرح کی بعض چیزیں اپنی طرف سے بڑھا دیں،اور ان کے حسن و قبح کی ذمہ داری سراسر اس پر عائد ہوتی ہے۔ترجمہ میں جہاں تک ممکن ہوا اصل کے قریب رہنے کی کوشش کی گئی ہے۔اور اس میں کسی قسم کا تجاوز نہ برتا گیا۔سہو ونسیان سے نہ کوئی بشر خالی ہے نہ مترجم اپنے سے خطا نہ ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔یقیناً اس کام میں بہت سی لغزشیں ہوئی ہوں گی۔لہذا قارئین سے درخواست ہے کہ جہاں کہیں وہ کسی قسم کی کوتاہی محسوس

کریں اس کو تقاضائے بشریت سمجھ کر نظر انداز فرمائیں۔

مترجم حضرت مولانا نور احمد صاحب مدیر الدعوۃ والارشاد مئوتمر العالم الاسلامی پاکستان وامین عام دعوۃ الحق وادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کا صمیم قلب ممنون ومشکر ہے کہ انہوں نے اس بلند پایہ تصنیف کے ترجمہ کی ذمہ داری اس کو سونپی ۔خدا کرے مترجم اپنی سعی میں کامیاب ہوا ہو۔اور حضرت مولانا کا اعتماد مجروح نہ ہوا ہو۔

واخر دعونا ان الحمدللہ رب العالمین والصلواۃ والسلام علی رسولہ الکریم O

مترجم

تعارف

موریس بوکائلے نے متون کے معروضی مطالعہ میں عہد نامہ قدیم، اناجیل اور قرآن کریم کے قائم کردہ بہت سے خیالات کو صاف کر دیا ہے۔ اپنی نگارشات کے اس مجموعہ میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ جو باتیں وحی و الہام سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو ان باتوں سے علیحدہ کر دیں۔ جو سہویا انسانی تاویلات وتشریحات کا نتیجہ ہیں۔ ان کے بیانات سے صحف مقدسہ پر ایک نئی روشنی پڑتی ہے۔ ایک قابل توجہ بیان کے آخر میں وہ اہل ایمان کے سامنے ایک نہایت اہم نکتہ پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ وحی وتنزیل کا جو سلسلہ ایک ہی خدا کی طرف سے جاری رہا۔ اس کے اظہار کے طریقوں میں تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ یہ بات ہمیں ان عوامل پر غور کرنے کی جانب مائل کرتی ہے۔ جو ہمارے زمانہ میں روحانی طور پر یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کا موجب بنیں نہ کہ تقسیم کرنے کا سبب ہوئیں۔

ایک سرجن کی حیثیت سے موریس بوکائلے کو اکثر ایسی حالت سے گزرنا پڑا، جس میں ان کو نہ صرف لوگوں کے جسموں کا معائنہ کرنا پڑا، بلکہ ان کی روحوں کا جائزہ لینے کا بھی موقع ملا۔ اس طرح ان کی توجہ مسلمانوں کی خدا پرستی اور اسلام کے ان پہلوؤں کی جانب مبذول ہوئی جن سے غیر مسلموں کی اکثریت قطعاً ناواقف تھی۔ ان توضیحات کے لئے جن کا سمجھنا کسی دوسری طرح مشکل تھا۔ انہوں نے عربی زبان سیکھی اور قرآن کا مطالعہ کیا۔ اس میں ان کو قدرتی حوادث

سے متعلق ایسے بیانات دیکھ کر حیرت ہوئی جن کا مفہوم صرف جدید سائنسی معلومات کے ذریعے ہی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ پھر وہ اس سوال کی جانب متوجہ ہوئے جو ایک خدا پر عقیدہ رکھنے والے مذاہب کے مقدس صحیفوں کی تحریروں کی صداقت سے متعلق ہے جہاں تک بائبل کا معاملہ ہے۔ وہ بالاخران تحریرات اور سائنسی معلومات میں مقابلہ و موازنہ کرنے کی جانب مائل ہوئے۔

یہودی عیسائی تنزیل اور قرآن کریم کے بارے میں تحقیقات کے نتائج کتاب ہذا میں مرتب کیے گئے ہیں۔

دیباچہ

عیسائی اور اسلامی دنیاؤں کے درمیان جو مناظرہ بیسویں صدی کے آخری تیس سال کے دوران ہوا ہے۔ وہ وحدانیت پر یقین رکھنے والے ان مذاہب کے مابین تعلقات میں ایک نکتہ انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے وہ صورت اختیار کرلی ہے جو طرابلس، قرطبہ اور دیگر مقامات کے مناظروں کی تھی۔ جن کا بہت کچھ تذکرہ سننے میں آتا ہے۔ ہمیں سعودی عرب کے عظیم علماء کے اس خیر مقدم کو نہیں بھولنا چاہیے جو ۱۹۷۴ء میں ویٹیکن کے مقام پر پوپ پال ششم کی جانب سے کیا گیا تھا۔ نہ ان عیسائی اور مسلم جماعتوں کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ جنہوں نے ایک دوسرے کو بہتر طور پر جاننے اور سمجھنے کے لئے بعض اقدامات کیے ہیں اسلام کے بارے میں صدیوں کی عدم واقفیت اور عام غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ لیکن غلط خیالات نے جو فی الحقیقت مغرب میں پھیلے ہوئے ہیں، برابر فضا کو مسموم کیے رکھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ حالات بدلیں۔ اس از سر نو شروع ہونے والے مناظرے نے بہت سے مسائل کو منظر عام پر لا کر اس چیز کو ممکن بنا دیا ہے۔ ان میں وہ مسائل نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ جو صحف مقدسہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ کیوں کہ دیگر تمام مسائل براہ راست ان ہی کا نتیجہ ہیں۔ لہذا یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے، کہ اس نظریے کو جانا اور سمجھا جائے جو عیسائی اور مسلمان دونوں اپنے صحیفوں کے بارے میں رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے انفرادی عقائد کی وہی بنیاد ہیں۔

مفسرین کے نقطہ نظر کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔

حسب ذیل بیان سے مختصراً عیسائی نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔بائبل میں شامل کتابیں الہام ووجدان کا نتیجہ ہیں ژین گیتوں کی کتاب ''میرا مختصر سوال نامہ'' کے اس باب میں جس کا عنوان ہے صداقت کا نزول۔بائبل اور اناجیل'' ہم یہ عبارت پڑھتے ہیں ۔خدا نے ان کتابوں کو خود نہیں لکھا۔اس کے بجائے اسنے نبیوں اور پیغمبروں کے قلوب میں وہ باتیں جو وہ ہمیں بتانا چاہتا تھا،ڈال کر اس نے لکھوائیں۔اور اس طرح دل میں ڈالنے کو ہی الہام کہا جاتا ہے۔لہذا جو کتابیں پیغمبروں نے لکھی ہیں۔وہ الہامی کتابیں کہلاتی ہیں۔

ان تمام مصنفین نے اپنی اپنی کتابیں مختلف اوقات میں اور اپنے اپنے زمانے کے طور طریقے اور رسوم ورواج کے مطابق لکھیں،اسی لئے ہم پوری بائبل میں مختلف نوعیت کے ادبی نمونے پاتے ہیں۔یہ خیال عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔اسی لیے عہد نامہ قدیم یا اناجیل کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی کہ الہامی موضاعات ان امور کے پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔جو ان دینوی معتقدات سے ماخوذ ہیں۔جن کی بنیاد ایسی روایات پر ہے۔جن کی اصل کا کچھ پتا نہیں ہے۔مثال کے طور پر ہم ان دو بیانات میں سے ایک کو پیش کرتے ہیں جو تخلیق کے بارے میں کتاب پیدائش میں شامل ہے۔

اب اگر ہم مسلمان مفسرین کی توضیحات پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ قرآن کریم کو بالکل ہی مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں۔تقریباً چودہ صدی کا عرصہ ہوا حوالی مکہ میں جب حضرت محمد ﷺ عالم استغراق میں تھے تو آپ ﷺ

کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے اللہ کا پہلا پیغام ملا۔ پھر پہلے پیغام کے بعد فترت وحی کا ایک طویل عرصہ گزرنے پر مسلسل نزول وحی ہوتا رہا۔ جس کا پھیلاؤ تقریباً تیس سال کی مدت پر ہے۔ یہ وحی نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی حیات میں ضبط تحریر میں لے آئی گئی تھی بلکہ السابقون الاولون اور بعد کے وہ صحابہ جن کو آپ ﷺ کی صحبت نصیب ہوئی، زبانی اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی رحلت (۶۳۲ء) کے بعد مختلف اجزا کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیا گیا۔ جس کے بعد وہ کتاب قرآن کے نام سے موسوم ہو گئی۔ یہ خدا کا کلام ہے اور انسان کی جانب سے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ وہ خطی نسخے جو اسلام کی پہلی صدی کے وقت سے ہماری دسترس میں ہیں۔ آج کے متن کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں۔

ایک خوبی جو پوری طرح قرآن کریم کے ساتھ مخصوص ہے یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے بحث کی جاتی ہے تو اس میں متعدد مقامات پر تمام انواع کے قدرتی حوادث سے متعلق اظہار خیال دکھائی دیتا ہے۔ یعنی فلکیات سے لے کر انسانی توالد و تناسل، کرہ ارض عالم حیوانی و نباتاتی تک سب ہی کچھ اس میں موجود ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ قرآن کریم نے تخلیق کے موضوع پر کیا کہا ہے۔ ان باتوں کے اظہار سے ان موضوعات کی جانب توجہ مبذول ہوئے بغیر نہیں رہتی جن میں سے بیشتر بائبل میں مذکور نہیں ہیں۔ جہاں تک ان موضوعات کا تعلق ہے، جو دونوں صحیفوں میں مشترک ہیں۔ ان کے درمیان ایک دل چسپ موازنہ کرنا ممکن نظر آتا ہے۔ اس صورت حال سے ایسے

نتائج ابھر کر سامنے آتے ہیں جن کی آج کے دور میں تشخیص کی جا سکتی ہے۔

موجودہ زمانے میں سائنس نے جو ترقی کی ہے اس نے ہمیں اس قابل کر دیا ہے کہ قدرتی حوادث کے سلسلے میں ایسے نظریات قائم کر سکیں جن کو قطعیت سے مان لیا گیا ہو۔ اور جو تجرباتی طور پر تسلیم کر لیے گئے ہوں۔ اس طرح وہ نظریات خارج ہو جاتے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تغیر پذیر ہیں۔

اس کی وجہ سے ان کے کچھ پہلوؤں کا جو بائیبل میں پیش کیے گئے ہیں۔ مطالعہ کرنا اور ان خیالات کا موجودہ معلومات سے موازنہ کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ اس طرح جو نتائج برآمد ہوئے، وہ قطعاً واضح ہیں۔ چنانچہ ایسے مضامین کے سلسلے میں جیسا کہ تشکیل کائنات کا مسئلہ (تخلیق کا بیان) سطح ارض پر انسان کے ظہور کی تاریخ، طوفان عالم گیر اور اس کے زمانے کا تعین ۔۔۔۔۔ یہ بات صریحاً واضح ہے کہ بائیبل کے مصنفین نے ۔۔۔۔۔ جن میں انجیلوں کے مرتبین بھی شامل ہیں، بالخصوص لوقا جہاں وہ حضرت عیسیٰ علیہ سلام کا نسب نامہ دیتے ہیں اپنے زمانے کے مروجہ خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ جن کا موازنہ جدید معلومات سے کیا جا سکتا ہے۔ آج کل یہ بات ناممکن ہے کہ بائیبل میں سائنسی تسامحات کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔ ان جملہ امور کی روشنی میں جو بائیبل کے مفسرین نے ہمیں اس طریقے کے بارے میں بتائے ہیں۔ جس طریقے سے یہودی عیسائی کتابیں مرتب کی گئی تھیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں تسامحات نہ ہوں۔ لہٰذا ہم ژین گیتوں سے اس معاملہ میں متفق ہیں۔ کہ بائیبل میں سائنسی تسامحات انسانوں کی غلطیاں ہیں، اس لئے کہ زمانہ قدیم میں انسان عالم طفولیت میں اور سائنس سے

نابلد تھا۔ بائبل کے متون کے بارے میں بعض عیسائی مفسرین کے جو خیالات ہیں۔ جو آج مختلف سائنسیں ہمیں ان کے اور بائبل کے متون کے بعض پہلوؤں کے مابین مطابقت کی کمی کے بارے میں بتاتی ہیں۔

کیا یہی بات مسلمان مفسرین کی استصدیق وتوثیق کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو بائبل کے الہام ووجدان کے برخلاف نزول قرآن سے متعلق ہے؟ کیا قرآن کریم میں ایسے بیانات ملنے کا کچھ امکان دکھائی دیتا ہے، جو ان خیالات کی عکاسی کرتے ہوں۔ جو اس زمانے میں ذائع وشائع تھے۔ اور جن سے بعد میں جدید معلومات کی تردید ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، قرآن کریم میں قدرتی حوادث سے متعلق بے شمار اقوال وبیانات موجود ہیں، ان کے سلسلے میں متعدد سائنسی تسامحات کے ہونے کا امکان تھا۔ جس کا سبب ان مضامین کی نوعیت تھی، جن سے اس دور میں بحث کی گئی تھی۔ جو سائنسی تحقیقات کی مخالفت کا دور تھا۔ یہاں ہمیں اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآن کا نزول کم وبیش اس زمانہ میں ہوا جب شاہ داکوبر کی فرانس میں حکومت تھی (۶۲۹ تا ۶۳۹)

ایک بار جب سائنسی معلومات اور صحیفوں میں شامل بیانات کا مقابلہ کیا گیا تو پھر مصنف نے اس کے نتائج ۱۹۷۶ء میں فرانسیسی ایڈیشن میں پیش کردیئے۔ شروع میں وہ بڑے اچنبھے کے موجب ہوئے۔ قرآن میں واضع طور پر ایک بیان بھی ایسا شامل نہیں تھا، جو مستحکم بنیادوں پر قائم شدہ جدید معلومات سے عدم مطابقت رکھتا ہو۔ نہ ہی اس میں ان موضوعات سے متعلق جو اس میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس دور کے مروجہ خیالات میں سے کوئی ایک دکھائی دیا۔ بلکہ اس

سلسلے میں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں وہ حقائق بڑی تعداد میں بیان ہوئے ہیں، جن کی تحقیق دور جدید سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ سچ پوچھیئے تو ایسے حقائق اس کثرت سے ہیں کہ مصنف ہذا نے ۹ نومبر ۱۹۷۶ء کو فرانسیسی طبی اکادمی کے سامنے "قرآن میں عضویاتی اور جنسی معلومات" کے موضوع پر ایک پورا مقالہ پیش کر دیا۔ یہ معلومات مختلف مضامین پر بہت سی اور معلومات کی طرح، انسانی توضیح وتشریح کے لئے ایک حقیقی چیلنج ہے۔ وہ بھی ان معلومات کے پیش نظر جو مختلف ادوار میں مختلف علوم کی تاریخ کے بارے میں ہمیں حاصل ہیں۔ جب یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم ایک الہامی کتاب ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ خداوند قدوس کی جانب سے کسی غیر صحیح بات کا اظہار نہیں ہو سکتا تھا۔

صحف مقدس اور سائنس سے متعلق مذکورہ بالا خیالات مصنف ہذا کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، اور نہ ہی بائیبل میں سائنسی تسامحات کی نشان دہی کوئی نئی چیز ہے۔ بلکہ جو چیز نئی کہی جا سکتی ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ ان باتوں کو ان خیالات کے مطابق جو بائیبل کی عیسائی تفسیر میں درج ہیں، اس قدر جامعیت سے بیان کر دیا گیا ہے اور ان کی اتنی وضاحت کر دی گئی ہے۔ جہاں تک کہ قرآن کریم کا تعلق ہے، اس مقدس کتاب اور جدید سائنس میں مکمل ہم آہنگی ہے نہ کہ اختلاف۔ اور یہ موافقت اور ہم آہنگی انسان کی وضع کردہ اصطلاحوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کو مغربی ماہرین علوم اسلامی نے قطعاً نظر انداز کیے رکھا، تاہم یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ بہت سے مختلف سائنسی قواعد سے

واقفیت اس سوال کو تفصیل سے جاننے کے لئے ضروری ہے۔ جو ماہرین علوم اسلامی کوان کے عملی پس منظر کے ساتھ عموماً حاصل نہیں ہے۔ صرف وہی سائنس دان جو عربی ادب میں مہارت رکھتا ہو، وہ نکات قائم کر سکتا ہے۔ جو قرآن ۔۔۔۔۔ جس کو عربی ہی پڑھنا چاہیئے ۔۔۔۔اور سائنس کے مابین مشترک ہیں۔ اس جائزہ کے پیش کرنے والے نے اپنے مشاہدات کی بنیاد حقائق پر رکھی ہے۔ اوران سے لازمی طور پر برآمد ہونے والے منطقی نتائج کو پیش کردیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اگر وہ اپنی تحقیقات کو منظر عام پر نہ لاتا تو جلد یا بدیر کوئی دوسرا شخص یہ کام کرگزرتا۔ اگر پیسٹر جراثیم کے وجود کو دریافت نہ کرتا تو کوئی اور کر لیتا۔ حقائق بالاخر اپنے وجود کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ لوگ ان کی راہ میں کتنی ہی رکاوٹیں پیش کردیں۔ جن کو ان کی دریافت سے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یا جن کو کوئی اذیت ہوتی ہے یا صدمہ پہنچتا ہے۔

اس جائزہ سے جونئی روشنی قرآن کریم پر پڑتی ہے اس سے ہٹ کر زیادہ عمومی سطح پر ۔۔۔۔ یہ بات مشکل ہے کہ اس عظیم فائدہ سے کوئی شخص متاثر نہ ہو۔ جو مصحف مقدس کے بعض پہلوؤں کا جائزہ لینے کے کام آتے ہیں۔ یہ چیز ہمیں ان نتائج کے درمیان مطابقت قائم کرنے پر آمادہ کرتی ہے، جو سائنسی معلومات سے اخذ کیے گئے ہیں، اوران تصورات سے حاصل ہوئے، جو مفسرین نے قائم کیے ہیں۔

حواشی

''مون پیج کا تے شرزم'' شائع کردہ ویکلی رے برٹر، پاری ۱۹۷۸ء

ابتدائیہ

توحید پر عقیدہ رکھنے والے تینوں مذہبوں میں سے ہر ایک کا اپنے اپنے صحیفوں کا مجموعہ موجود ہے۔ اہل ایمان کے لئے خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی اور خواہ مسلمان یہ صحیفے ان کے عقیدے کی بنیاد ہیں۔ وہ ان کے لئے الہام وتنزیل کی تحریری شکلیں ہیں۔ خواہ یہ الہام براہ راست ہوا ہو جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ سلام اور حضرت موسیٰ علیہ سلام کا معاملہ ہے۔ کہ انہیں خود باری تعالیٰ سے احکام ملے خواہ بالواسطہ طور پر ہوا ہو، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ سلام اور حضرت محمد ﷺ کے سلسلہ میں ہوا۔ جن میں سے اول الذکر نے بیان کیا کہ وہ اپنے آسمانی باپ کی جانب سے ہم کلام ہو رہے ہیں۔ اور موخر الذکر نے انسانوں کو وہ پیغام پہنچایا جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے سے آپ ﷺ کو ملا تھا۔

اگر ہم مذہبی تاریخ کے حقائق پر معروضی طور سے غور کریں تو ہمیں عہد نامہ عتیق، اناجیل اور قرآن کو وحی کے تحریری مجموعوں کی حیثیت سے ایک ہی سطح پر رکھنا پڑے گا۔ اگرچہ اس طرز عمل کو اصولی طور پر مسلمان اختیار کیے ہوئے ہیں۔ لیکن مغرب کے مذہبی حلقے یہودی و نصرانی اثرات کے تحت قرآن کو ایک الہامی کتاب کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اس طرح کے طرز عمل کی وضاحت اس نقطہ نظر کی روشنی میں کی جا سکتی ہے جو ہر مذہبی فرقہ صحیفوں کے اعتبار سے باقی دو مذاہب کے متعلق رکھتا ہے۔

یہودیت کی اپنی مقدس کتاب عبرانی بائبل کی شکل میں ہے۔ یہ عیسائیوں

کے عہد نامہ قدیم سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ موخر الذکر میں کئی ایسی کتابیں شامل ہیں، جو عبرانی میں موجود نہیں تھیں۔ اس اختلاف سے عملاً کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن یہودیت اپنے سوا بعد کی کسی بھی تنزیل و وحی کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔

عیسائیت نے عبرانی بائبل کو اپنا لیا ہے اور اس میں چند ضمیمہ جات کا اضافہ کر دیا ہے لیکن اس نے ان تمام شائع شدہ تحریروں کو تسلیم نہیں کیا جن کا مقصد ہی انسانوں کو حضرت عیسیٰ کے مشن سے آگاہ کرنا تھا۔ کلیسا نے ان کتابوں کی اشاعت میں قطع و برید سے کام لیا ہے جن میں حضرت عیسیٰ کی حیات اور تعلیمات کا ذکر ہے۔ اس نے عہد نامہ جدید میں صرف ایک محدود تعداد میں تحریروں کو محفوظ رکھا ہے جن میں اہم ترین وہ چار اناجیل ہیں جن کو شرعی حیثیت حاصل ہے۔ عیسائیت کسی ایسی وحی کو تسلیم نہیں کرتی جو حضرت عیسیٰ اور آپ کے حواریوں کے بعد نازل ہوئی لہٰذا وہ قرآن کو مسترد کر دیتی ہے۔

نزول قرآن حضرت عیسیٰ کے چھ سو سال بعد ہوا۔ وہ بہت سی ان معلومات کو قائم و برقرار رکھتا ہے جو عبرانی بائبل اور اناجیل میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے اس میں اکثر توریت اور انجیلوں کے حوالے ملتے ہیں۔ قرآن میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ ان تمام صحیفوں پر ایمان لائیں جو اس سے پہلے نازل ہوئے (سورہ ۴ آیت ۱۳۶)۔ یہ اس اہم مقام پر زور دیتا ہے جو وحی و تنزیل کے معاملہ میں خدا کے پیغمبروں کو حاصل ہے۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت کو اناجیل کی طرح قرآن بھی ایک فوق الفطرت واقعہ قرار دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت مریم کو بھی

ایک خصوصی مقام دیا گیا ہے، جیسا کہ ان حقیقت سے ظاہر ہے کہ انیسویں سورۃ ہی ان کے نام پر ہے۔

اسلام کے بارے میں مذکور الصدر واقعات کا مغرب کو عام طور پر علم نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ کوئی حیرت خیز بات نہیں رہتی، جب ہم اس طریقہ پر غور کرتے ہیں جس طریقہ سے مغرب میں اتنی بہت سی نسلوں کو ان مذہبی مسائل کی جن سے بنی نوع انسان کو سابقہ تھا تلقین کی گئی اور اسلام سے متعلق ہر بات سے ان کو تاریکی میں رکھا گیا۔ ایسی اصطلاحوں کا استعمال جیسے دین محمدی (محمڈن ریلجن) اور محمدیت (محمڈن ازم) زمانہ حال تک اس غلط خیال کو برقرار رکھنے میں معین و مددگار ثابت ہوا کہ اسلامی عقائد ایک شخص کی جدوجہد سے پھیلے جس میں (عیسائیت کے نقطہ نظر سے) خدا کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ اس وقت بھی بہت سے مہذب لوگ ایسے ہیں جو اسلام کے فلسفیانہ، معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے تو دلچسپی رکھتے ہیں لیکن جیسا کہ فی الواقع انہیں چاہیے، وہ اسلامی وحی و تنزیل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے سلسلہ میں ذرا بھی غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔

بعض نصرانی حلقوں میں مسلمانوں کو کس قدر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے! مجھے اس بات کا تجربہ اس وقت ہوا جب میں نے ایک ہی موضوع پر بائبل اور قرآن کے بیانات کے تقابلی تجزیہ سے پیدا ہونے والے مسائل پر تبادلہ خیالات شروع کرنے کی کوشش کی۔ میں نے معمولی غور و فکر کی غرض سے کہ قرآن موضوع زیر بحث کے بارے میں کیا کہتا ہے، سامنے لانا چاہا تو مجھے باقاعدہ طور پر

انکار سے دو چار ہونا پڑا۔ گویا قرآن سے کسی بات کو نقل کرنا ایسا ہی ہے جیسا شیطان کا حوالہ دینا۔

تاہم ان دنوں عیسائی دنیا میں بلند سطح پر ایک قابل ذکر تبدیلی دکھائی دے رہی ہے۔ ویٹیکن کے غیر مسیحی امور کے شعبہ سے فرانسیسی زبان میں ''اورینتاسیوں پوراں دایالوگ انتر کرستیاں اے مسلمانس'' (عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین بات چیت کے لیے نئی راہیں) کے عنوان سے ایک دستاویز شائع ہوئی ہے۔ جس کی تیسری فرانسیسی اشاعت مورخہ ۱۹۷۰ء سرکاری رویہ میں ایک گہری تبدیلی کی نشان دہی کرتی ہے۔ ایک جانب تو اس دستاویز نے قاری کو اس فرسودہ تصور کو ذہن سے محو کر دینے کی دعوت دی ہے جو اسلام کے بارے میں عیسائیوں کے یہاں بطور ورثہ چلا آ رہا ہے یا تعصب اور الزام تراشی کے سبب جس کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ دوسری طرف ویٹیکن کی اس دستاویز میں اس نا انصافی کا اعتراف کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی گئی ہے اور جس کے لیے مغرب اپنی عیسائیت کی تعلیم کی بناء پر مورد الزام قرار پاتا ہے۔ اس میں ان غلط تصورات پر بھی تنقید کی گئی ہے جو مسلمانوں کے عقیدۂ قضا و قدر، اسلامی شریعت پرستی، جبر و تشدد وغیرہ کے بارے میں عیسائی قائم کیے ہوئے ہیں۔ یہ دستاویز اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر زور دیتی ہے اور اس چیز کی یاد دہانی کراتی ہے کہ الازہر کی جامعہ اسلامیہ قاہرہ میں سامعین اس وقت کس قدر حیران و ششدر رہ گئے جب کاردینال کونگ نے مسجد جامع میں مارچ ۱۹۶۹ء کو ایک سرکاری کانفرنس کے دوران اس توحید کا اعلان کیا۔ اس میں ہمیں اس بات کی بھی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ ۱۹۶۷ء میں ویٹی کن کے

دفتر میں عیسائیوں کو اس غرض سے مدعو کیا گیا تھا کہ وہ ماہ رمضان المبارک کے اختتام پر مسلمانوں کے لیے بہ صمیم قلب نیک تمناؤں کا اظہار کریں۔

رومن کیتھولک کی مجلس اور اسلام کے مابین قریبی تعلقات قائم کرنے کے لیے ان ابتدائی اقدامات کے بعد مختلف مظاہر سامنے آئے اور دونوں کے درمیان ملاقاتوں سے ایک گونہ استقامت پیدا ہوئی۔ لیکن مغربی دنیا میں جہاں یہ سب کچھ ہوتا رہا اور جہاں پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی شکل میں ابلاغ عامہ کے کافی ذرائع موجود ہیں، اس قدر بڑی اہمیت کے واقعات کی بہت کم اشاعت ہوئی۔

اخبارات نے غیر مسیحی امور کے ویٹی کن کے دفتر کے صدر کارڈینال پگینڈولی کی ۲۴ اپریل ۱۹۷۴ء کو ہونے والی سعودی عرب کے شاہ فیصل کے ساتھ سرکاری ملاقات کو اپنے صفحات میں بہت کم جگہ دی۔ فرانسیسی اخبار لے موند (دنیا) نے ۲۵ اپریل ۱۹۷۴ء کو اشاعت میں اس واقعہ کو چند سطروں میں نمٹا دیا۔ لیکن ان سطور میں کس قدر مہتم بالشان خبر تھی۔ یہ ہمیں اس وقت معلوم ہوا جب ہم نے پڑھا کہ کس طرح کارڈینال نے شاہ موصوف کو پوپ پال ششم کی جانب سے ایک ایسا پیغام پہنچایا جس میں ہزہولی نس کی طرف سے جلالۃ الملک شاہ فیصل کی خدمت میں اسلامی دنیا کے سربراہ کی حیثیت سے اس گہرے یقین کے ساتھ بہترین تمنائیں پیش کی گئی تھیں کہ خدائے واحد کی عبادت کے معاملہ میں اسلامی اور عیسائی دنیائیں متحد ہو جائیں۔

چھ ماہ بعد اکتوبر ۱۹۷۴ء میں پوپ نے سعودی عرب کے علماء کو ایک سرکاری دورے پر ویٹی کن میں باریاب کیا۔ اس موقع پر ''اسلام میں انسان کے تمدنی

حقوق'' پر عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان بات چیت ہوئی۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو ویٹی کن کے اخبار ''آ نبر رویٹر رومانو'' نے اس تاریخی واقعہ کو صفحہ اول کے بیان میں پیش کیا اور اس خبر کو روم میں منعقدہ ارکان کلیسا کی میٹنگ کے آخری دن کی اطلاع کے مقابلہ میں زیادہ جگہ دی گئی۔

بعد میں سعودی عرب کے علمائے کرام کو کلیسائے جنیوا کی عالمگیر کونسل اور اسٹرا سبرگ کے لاٹ پادری ہز گریس ایلنگر نے خوش آمدید کہا۔ پادری صاحب نے ان کو اپنے گرجا میں دوپہر کی دعا میں شرکت کے لیے مدعو کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس واقعہ کی وجہ سے اس کی اس قدر تشہیر ہوئی، وہ اس کی غیر معمولی نوعیت تھی، نہ کہ ایک بے انتہا ذہبی اہمیت کا واقعہ، ان تمام موقعوں پر میں نے جن لوگوں سے بھی اس کے بارے میں سوال کیا ان میں اسے بہت ہی کم ایسے تھے جنہوں نے یہ جواب دیا کہ ہمیں اس کے متعلق کچھ واقفیت ہے۔

پوپ پال ششم کا اسلام کی جانب یہ فراخدلانہ طرز عمل دونوں مذاہب کے درمیان تعلقات میں سنگ میل ثابت ہوگا۔ انہوں نے خود بھی کہا کہ:

''مجھے پختہ یقین ہے کہ خدائے واحد کی عبادت کی بنیاد پر اسلامی اور عیسائی دنیاؤں میں اتحاد ممکن ہے۔''

مسلمانوں کے بارے میں کیتھولک گرجا کے سربراہ کے جذبات و تاثرات کا تذکرہ یقیناً ضروری ہے۔ عیسائیوں کی ایک کثیر تعداد جس کی تربیت کھلی دشمنی کی فضا میں ہوئی ہے، وہ اصولی طور پر اسلام کے بارے میں غور کرنے کے بھی خلاف ہے۔ ویٹی کن کی دستاویز میں اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔ ان کے اس طرز

عمل کا سبب یہ ہے کہ انہیں اسلام کی حقیقت سے قطعاً ناواقف رکھا گیا ہے اور یہ کہ انہوں نے اسلامی وحی و الہام کے بارے میں جو خیالات قائم کیے ہیں وہ سر بسر غلط ہیں۔

اس کے باوجود جب ایک توحید پرست مذہب کی وحی و تنزیل کے کسی ایک پہلو کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جائے کہ اس موضوع کے سلسلے میں باقی دو مذاہب کا کیا موقف ہے۔ کسی ایک مسئلہ کا وسیع مطالعہ ایک محدود جائزہ سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ لہٰذا بعض ان مضامین کے جن صحیفوں میں بحث کی گئی ہے۔ اور ۲۰ ویں صدی کے سائنسی حقائق کے مابین مقابلہ میں تینوں ہی مذاہب آ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب مادیت کی غارتگری کا خطرہ لاحق ہو، اس وقت تینوں مذاہب کا اپنے قریبی روابط کے لحاظ سے مضبوط اتحاد کارآمد رہے گا۔

یہ تصور کہ سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف ہیں، یہودی اور عیسائیت کے زیر اثر ممالک میں بھی اسی طرح پھیلا ہوا ہے جیسا کہ اسلامی دنیا میں ہے۔ خصوصیت سے سائنسی حلقوں میں اگر اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی جائے تو طویل مباحث کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کتاب میں میرا ارادہ صرف ایک پر گفتگو کرنے کا ہے، وہ ہے خود صحیفوں کا جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں جائزہ۔

اپنے کام کا آغاز کرنے سے پہلے ہمیں ایک بنیادی سوال کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ متون کس حد تک مستند ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب کے

لیے ان حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے، جن حالات میں ان کو مرتب کیا گیا اور جس طرح سے چل کر وہ ہم تک پہنچے۔

مغرب میں صحیفوں کے تنقیدی جائزے کا کام حالیہ زمانہ کا ہے۔ سینکڑوں سال تک لوگ بائبل کو جس میں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید دونوں شامل ہیں، بالکل اسی صورت میں ماننے پر قانع تھے، جس صورت میں وہ موجود ہیں۔ اس کے مطالعہ کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا کہ اس کے معتبر ہونے کی توثیق و تصدیق کر دی جائے۔ اس پر ذرا سی بھی تنقید کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ صرف پادریوں کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ بائبل کا تفصیلی علم حاصل کریں جب کہ عوام میں سے اکثریت کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ کسی وعظ یا دعا کے دوران اس کے منتخب حصوں کو سن لیں۔

خصوصی مطالعہ کی سطح پر ابھر کر متن پر تبصرہ ایسے مسائل کو بے نقاب کرنے اور ان کی اشاعت کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے جو بسا اوقات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس طرح کی تنقیدی نوعیت کی تحریروں کا مطالعہ اس صورت میں کس درجہ مایوس کن ہوتا ہے جب ان میں توضیح و تشریح کے مسائل سے سابقہ ہو لیکن وہاں معذرت خواہانہ انداز کی ایسی عبارتیں پیش کر دی جائیں جن کے ذریعہ مصنف اپنی گومگو کی کیفیت کو چھپانے کی ترکیبیں نکالتا ہو۔ ایسے موقعوں پر جو کوئی اپنے معروضی فیصلہ اور غور و فکر کی قوت کو برقرار رکھتے ہوئے کام کرتا ہو اس کو ناممکنات اور تضادات میں ذرا سی بھی کمی ہوتی ہوئی محسوس نہ ہوگی۔ اس رویہ پر سوائے اظہار افسوس کے اور کیا کیا جا سکتا ہے کہ تمام منطقی دلائل کی موجودگی میں بائبل کے صحیفوں کی بعض عبارتوں کی اس صورت میں بھی حمایت کی جائے

جب کہ وہ غلطیوں سے بھری پڑی ہوں۔ اس اصرار سے عقیدۂ الوہیت کے سلسلہ میں سنجیدہ طبائع پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ لیکن تجربہ سے پتہ چلتا ہے کہ اگر اس قسم کے مغالطوں میں امتیاز کرنے والے چند لوگ ہیں تو عیسائیوں کی اکثریت ایسی ہے جس نے اس قسم کے تناقضات پر اپنی دنیوی معلومات کی روشنی میں کبھی کوئی غور نہیں کیا، خواہ وہ تناقضات معمولی درجہ کے ہوں۔

اسلام کی اگر کسی چیز کا مقابلہ اناجیل سے کیا جا سکتا ہے تو وہ کچھ حدیثیں ہیں، وہ حضرت محمد ﷺ کے جمع شدہ اقوال اور آپ کے افعال کے تذکرے ہیں۔ اناجیل کی بہت بڑی تعداد کا مسئلہ مختتم طور پر طے کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے صرف چار کی تشریعی حیثیت مان لی گئی ہے باوجودیکہ بہت سے نکات ایسے ہیں جن پر ان میں بھی اتفاق نہیں ہے۔ باقی کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان کو مسترد قرار دیا جائے۔ چنانچہ اسفار محرفہ کی اصطلاح کام میں لائی گئی۔

عیسائیت اور اسلام کے صحیفوں میں ایک بنیادی چیز جو مابہ الامتیاز ہے، یہ حقیقت ہے کہ عیسائیت میں کوئی ایسا متن نہیں ہے جو منزل من اللہ ہو اور جس کو ضبط تحریر میں لے آیا گیا ہو لیکن اسلام میں قرآن ایک ایسی چیز ہے جو اس شرط کو پورا کرتا ہے۔

قرآن وحی کا وہ اظہار ہے جو حضرت جبرائیلؑ کے ذریعہ حضرت محمد ﷺ کو پہنچی جس کو فوراً بعد قلم بند کر لیا گیا اور اہل ایمان نے حفظ کر لیا۔ وہ اپنی نمازوں خصوصاً ماہ رمضان المبارک میں اس کی قرأت و ترتیل کرتے رہے۔ خود حضرت محمد ﷺ نے اس کی سورتوں میں ترتیب قائم کی اور یہ سب سورتیں نبی کریم ﷺ کی رحلت

کے فوراً بعد حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں (رحلت رسول اللہ ﷺ کے بعد ۱۲ تا ۲۴ سال) متن کو موجودہ شکل دینے کے لیے جمع کرلیا گیا۔(۱)

اس کے برخلاف مسیحی الہام متعدد انسانی بیانات پر مبنی ہے۔ حقیقت میں بہت سے عیسائیوں کے خیال کے برعکس ہمارے پاس حضرت عیسیٰ کی زندگی کے واقعات کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے۔ عیسائی اور اسلامی متون کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی وہ صورت ہے جواب قائم ہوئی ہے۔

صحیفوں کے متون اور سائنسی معلومات کے مابین تناقض نے ہمیشہ انسان کے غور وفکر کے لیے غذا فراہم کی ہے۔

شروع میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مقدس متن کے قابل استناد ہونے کے لیے صحیفوں اور سائنس کے مابین توافق ایک ضروری عنصر ہے۔ سینٹ آگسٹائن نے مکتوب ۸۲ میں جس کو ہم بعد میں نقل کریں گے، باقاعدہ طور پر یہ اصول پیش کیا تھا لیکن جیسے جیسے سائنس میں ترقی ہوتی گئی، یہ بات صاف ہوتی چلی گئی کہ بائبل اور سائنس کے مابین اختلافات ہیں لہذا یہ بات طے کردی گئی کہ آئندہ اس قسم کا موازنہ نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے جس کو آج ہم تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، وہ یہ کہ بائبل کے مفسرین اور سائنس دانوں کے درمیان مخالفت و مغائرت پیدا ہوگئی ہے۔ بہر حال ہم کسی ایسی وحی کو تسلیم نہیں کر سکتے جس میں ایسی باتیں ہوں جو کلیتہً غیر صحیح ہوں، ان میں مصالحت کرانے کا صرف ایک ہی منطقی طریقہ ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ کسی ایسی عبارت کو جس میں ناقابل قبول سائنسی معلومات دی ہوئی ہوں حقیقی نہ سمجھا جائے لیکن یہ طرز عمل اختیار نہیں

کیا گیا۔ اس کی بجائے متن کو درست تسلیم کرنے پر اصرار کیا گیا اور ماہرین کو مجبور کیا گیا کہ وہ بائبل کے صحیفوں کی صحت کے سلسلہ میں ایسا رویہ اختیار کریں جو سائنس دانوں کے لیے مشکل سے قابل قبول ہو۔

جس طرح بائبل کے معاملہ میں سینٹ آگسٹائن نے کہا تھا اسی طرح اسلام نے بھی ہمیشہ سے یہ طرز عمل اختیار کر رکھا ہے کہ صحف مقدس میں جو معلومات شامل ہیں، وہ سائنسی حقائق سے مطابقت رکھتی ہوں۔ اسلامی وحی کے حالیہ جائزے نے اس صورت حال میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، قرآن کریم میں مقدس بائبل سے کہیں زیادہ سائنسی دلچسپی کے مضامین زیر بحث آئے ہیں۔ بائبل میں یہ بیانات محدود تعداد میں ہیں لیکن سائنس سے متبائن ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن میں بکثرت مضامین سائنسی نوعیت کے ہیں۔ اس لیے دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں۔ موکرالذکر میں کوئی بیان بھی ایسا نہیں جو سائنسی نقطہ نظر سے متصادم ہوتا ہو۔ یہ وہ بنیادی حقیقت ہے جو ہمارے جائزہ لینے سے ابھر کر سامنے آئی ہے۔ ہم اسی کتاب کے آخر میں دیکھیں گے کہ حدیثوں کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ وہ نبی کریم ﷺ کے ان اقوال کا مجموعہ ہیں جو قرآنی تنزیل و الہام سے ہٹ کر ہیں، جن میں سے بعض سائنسی اعتبار سے نا قابل قبول ہیں۔ زیر غور احادیث کا قرآن کریم کے ان سخت اصولوں کے مطابق جائزہ لیا گیا ہے جن میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اگر ان کو نا قابل اعتماد ثابت کرنا ضروری ہو تو ہمیشہ سائنس اور دلیل و برہان کو کام میں لایا جائے۔

کسی صحیفہ کے سائنسی اعتبار سے قابل اعتماد اور نا قابل اعتماد ہونے کے مسئلہ

پر غور و فکر کرنے کے لیے کچھ وضاحت درکار ہے۔ یہاں اس بات پر زور دینا پڑتا ہے کہ جب سائنسی معلومات سے متعلق گفتگو کی جاتی ہے تو اس سے وہ حقائق مراد ہوتے ہیں جو قطعی طور پر تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ اس اصول سے ایسے توضیحی نظریات خارج از بحث ہیں جو کسی ایک وقت میں کسی خاص حادثہ پر روشنی ڈالنے کے لیے مفید معلوم ہوتے ہیں لیکن جن کو کسی ایسی توضیح کے لیے ترک کر دیا جاتا ہے جو سائنسی ترقی کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں میرا ارادہ جس چیز پر غور کرنے کا ہے وہ مسلمہ حقائق ہیں یا پھر وہ مسائل ہیں جن پر اگرچہ سائنس ابھی نامکمل معلومات فراہم کر سکی ہے۔ تاہم آگے چل کر وہ کسی غلطی کے اندیشہ کے بغیر کام میں لانے کے لیے پوری طرح استوار ہو جائیں گے۔

مثال کے طور پر سائنس دانوں کے پاس کرہ ارض پر انسان کے ظہور کی تقریبی تاریخ بھی موجود نہیں ہے۔ تاہم انھوں نے انسانی صنعت کی ایسی باقیات دریافت کر لی ہیں جن کا تعین بغیر کسی شک وشبہ کے دس ہزار سال قبل مسیح سے پہلے کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہم تسلیم نہیں کر سکتے کہ اس موضوع پر بائبل کی بیان کردہ حقیقتیں سائنس کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ کتاب پیدائش کے بائبل کے متن میں جو تاریخیں اور نسب نامے دیئے گئے ہیں، وہ نسل انسانی کی پیدائش (یعنی تخلیق آدمؑ) کو تقریباً ۳۷ صدی قبل مسیح قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے مستقبل میں سائنس ہمارے لیے ایسی معلومات فراہم کر دے جو ہمارے موجودہ حسابات سے زیادہ صحیح ہو لیکن اس بات کا کامل یقین ہے کہ وہ ہمیں کبھی یہ نہیں بتائے گی کہ انسان کا سطح ارض پر ظہور ۵۷۳۶ سال پہلے ہوا تھا جیسا کہ ۱۹۷۵ء کے اعتبار سے

عبرانی تقویم میں بتایا گیا ہے۔(۲) لہٰذا انسان کی قدامت سے متعلق بائبل کی معلومات غیر صحیح ہیں۔

سائنس کے ساتھ اس مقابلہ میں مذہبی نوعیت کے مسائل کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔مثال کے طور پر سائنس کے پاس اس بات کی کوئی تشریح وتاویل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنا جلوہ کیسے دکھایا۔یہی بات فطرے کے اس راز کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ حضرت عیسیٰ ایک جسمانی باپ کے بغیر کیسے تولد ہوئے۔علاوہ ازیں صحیفے بھی اس نوع کی معلومات کے لیے کوئی مادی توضیح وتشریح نہیں کرتے۔لہٰذا ہمارا موجودہ جائزہ ان باتوں سے متعلق ہے، جو صحف ساوی ہمیں مختلف النوع مظاہر کے بارے میں بتاتے ہیں اور جن کی کسی نہ کسی حد تک وضاحت کی جاسکتی ہے۔یہ بات ذہن میں رکھ کر ہمیں اس اختلاف کو دیکھنا چاہیے جو ایک ہی موضوع سے متعلق قرآن میں کثیر تعداد میں اور باقی دوصحیفوں میں محدود تعداد میں معلومات کے بارے میں ہے۔

جب میں نے پہلے پہل قرآنی وحی وتنزیل کا جائزہ لیا تو میرا نقطہ نظر کلیتہً معروضی تھا۔پہلے سے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ تھا۔میں یہ دیکھا چاہتا تھا کہ قرآنی متن اور جدید سائنس کی معلومات کے مابین کس درجہ مطابقت ہے۔تراجم سے مجھے پتہ چلا کہ قرآن ہر طرح کے قدرتی حوادث کا اکثر اشارہ کرتا ہے۔لیکن اس مطالعہ سے مجھے مختصر سی معلومات حاصل ہوئیں۔جب میں نے گہری نظر سے عربی زبان میں اس کے متن کا مطالعہ کیا اور ایک فہرست تیار کی تو مجھے اس کام کو مکمل کرنے کے بعد اس شہادت کا اقرار کرنا پڑا جو میرے سامنے تھی۔قرآن میں ایک

بھی بیان ایسا نہیں ملا جس پر جدید سائنس کے نقطہ نظر سے حرف گیری کی جا سکے۔

اسی معیار کو میں نے عہد نامہ قدیم اور اناجیل کے لیے آزمایا اور ہمیشہ وہی معروضی نقطہ نظر قائم رکھا۔ اول الذکر میں مجھے پہلے ہی کتاب آفرینش سے آگے نہیں جانا پڑا اور ایسے بیانات مل گئے جو جدید سائنس کے مسلمہ حقائق سے کلی طور پر عدم مطابقت رکھتے تھے۔

اناجیل کو شروع کرتے ہی فوری طور پر ایک سنجیدہ مسئلہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ پہلے ہی صفحہ پر ہمیں حضرت عیسیٰؑ کا نسب نامہ ملتا ہے۔ لیکن اس موضوع سے متعلق متی کا متن واضح طور پر لوقا کے متن سے مختلف ہے۔ ایک اور مسئلہ اس لحاظ سے بھی سامنے آیا ہے کہ موخر الذکر میں کرہ ارض پر انسان کی قدامت سے متعلق معلومات جدید معلومات سے متبائن ہیں۔

یہ تضادات، ناممکنات اور تناقضات ایسے ہیں جن کی وجہ سے میرا الوہیت کے بارے میں عقیدہ متزلزل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ان کوتاہیوں میں انسان کی ذمہ داری کو دخل ہے۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ ابتدائی متون کیا رہے ہوں گے۔ نہ ہی خیالی عبارت آرائیوں، دانستہ طور پر انسانوں کی جانب سے الحاقات اور غیر شعوری طور پر جو ردو بدل ہوا ہے ان کی کوئی شخص پوری طرح نشان دہی کر سکتا ہے۔ جب ہم بائبل کے تضادات اور تناقضات کو سائنس کی ٹھوس معلومات کے مقابلہ میں دیکھتے ہیں تو جو بات آج بھی کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ جو ماہرین ان متنوں کا مطالعہ کرتے ہیں وہ یا تو ان تضادات وتناقضات سے ناواقفیت کا بہانہ کر دیتے ہیں یا لفظی بازیگری سے ان نقائص کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب

ہم متی اور لوقا کی اناجیل کا جائزہ لیں گے، اس وقت میں تفاسیر کے ماہرین کے معذرتی طرز بیان کی بعض مثالیں پیش کروں گا۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی ناممکن بات یا تضاد بیانی کو چھپانے کے لئے بڑی بڑی کامیابی سے ''مشکل'' کی اصطلاح استعمال کر دی جاتی ہے۔ ان کے اس طرز عمل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اتنے بہت سے عیسائی ان بڑی بڑی کوتاہیوں سے کیوں بے خبر ہیں جو عہد نامہ قدیم اور اناجیل میں موجود ہیں۔ قاری ان چیزوں کی واضح مثالیں اس کتاب کے پہلے دوسرے حصہ میں پائیں گے۔

اس کتاب کے تیسرے حصہ میں ایک مقدس صحیفہ میں سائنس کے غیر معمولی طور پر استعمال کی مثال پیش کی گئی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید دنیوی علوم نے قرآن کریم کی ان بعض آیات کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد دی ہے جو اس سے پہلے اگر نا قابل فہم نہیں تھیں تو معمہ ضرور بنی ہوئی تھیں۔ یہ بات ہمارے لیے اس وجہ سے تعجب خیز نہیں رہتی کہ ہمارے علم کے مطابق اسلام کے نقطہ نظر سے مذہب اور سائنس کی حیثیت ہمیشہ دو جڑواں بہنوں کی سی رہی ہے۔ شروع ہی سے اسلام تمدن کے دور عروج میں سائنس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے جس سے نشاۃ الثانیہ سے قبل خود مغرب نے بھی استفادہ کیا ہے۔ موجودہ سائنسی معلومات نے قرآن کی آیات پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے صحیفوں اور سائنس کے درمیان مقابلہ کے لیے فہم و ادراک کی ایک نئی راہ نکل آئی ہے۔ پہلے یہ آیتیں اس معلومات کے عدم حصول کی بناء پر مبہم تھیں جو ان کی توضیح و تشریح میں مدد و معاون ہو سکتی ہے۔

حواشی

۱۔ یہاں مصنف موصوف کو تسامح ہوا۔ مصحف کی صورت میں قرآن حضرت عثمانؓ کے دور خلافت سے پہلے ہی جمع ہو چکا تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے تو امت کو اختلاف سے بچانے کے لیے تمام مسلمانوں کو ایک قرأت پر جمع کیا تھا اور وہ قرأت قریش کی تھی (مترجم)

۲۔ ۱۶۵۰ء میں آئر لینڈ کے آرچ بشپ جیمس آشیر نے انکشاف کیا تھا کہ تخلیق آدم کا واقعہ ۲۳ اکتوبر ۴۰۰۴ ق۔ م کو ۹ بجے دن کے وقت ہوا تھا (مترجم)

باب ۱

عہد نامہ قدیم

عمومی خاکہ

عہد نامہ قدیم کا مصنف کون ہے؟ (۱)

جب مذکورہ بالا سوال کیا جاتا ہے تو ہر شخص یہ معلوم کرکے حیران رہ جاتا ہے کہ عہد نامہ قدیم کے کتنے ہی قارئین جواب میں وہ بات دہرا دیتے ہیں جو انہوں نے کتاب مقدس (بائبل) کے افتتاحیہ میں پڑھی ہوتی ہے۔ان کی جانب سے ایک جواب یہ بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ اس کو بطور الہام روح القدس (حضرت جبرئیلؑ) کے ذریعہ حاصل کر کے انسان تحریری شکل میں لائے ہیں تاہم اس کا مصنف خود خداوند کریم ہے۔

بعض اوقات تو کتاب مقدس کے وجود میں آنے کے متعلق اطلاع دینے والا شخص قارئین کو معلومات فراہم کرتے ہوئے خود کو اسی مختصر بیان تک محدود رکھتا ہے، جس سے مزید سوالات کی گنجائش ہی نہیں رہتی اور بعض اوقات وہ جواب دیتے وقت یہ توضیح کر دیتا ہے کہ ابتدائی متن میں آگے چل کر تفصیلات تو انسان ہی فراہم کرتے رہے لیکن اس کے باوجود کسی عبارت کی متنازع فیہ خصوصیت اس

کی عمومی صداقت میں جو اس سے برآمد ہوتی ہے، کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ پھر اس صداقت پر بڑے بھونڈے پن سے زور دیا جاتا ہے۔ ارباب کلیسا جو اس قسم کے نکات کے بارے میں معتقدین کو معلومات فراہم کرنے والی واحد جماعت ہے، روح القدس کی مدد سے اس کا جواب دیتے ہیں۔ چوتھی صدی سے، جب کونسل کے اجلاس منعقد ہوئے، یہ کلیسا ہی کا کام تھا کہ وہ مقدس کتابوں کی فہرستیں نکالتی رہی اور ان کی توثیق فلورنس (۱۴۴۱ء) ٹرینٹ (۱۵۴۶ء) کی کونسلوں اور پہلی ویٹی کن کونسل نے کردی، جس سے وہ شے منصۂ شہور پر آئی جس کو آج ہم فہرست اناجیل کہتے ہیں۔ حال ہی میں اتنے بہت سے پاپائی فتاویٰ کے بعد دوسری ویٹی کن کونسل نے ایک متن شائع کیا جو الہام سے متعلق تھا اور جو نہایت اہم اور ضروری ہے۔ اس کو تخلیق کرنے کی جان توڑ کوشش میں تین سال (۱۹۶۲ء۔۱۹۶۵ء) کی مدت صرف ہوئی۔ کتاب مقدس کے قارئین کی اکثریت جو اس نہایت تسلی بخش تحریر کو بائبل میں دیکھتی ہے وہ اس کے اصل ہونے کی اس تصدیق وتوثیق سے کلی طور پر مطمئن ہو جاتی ہے اور گزشتہ صدیوں میں جو کچھ ہوتا رہا اس پر بحث کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھتی۔

لیکن جب کوئی شخص ان کتابوں کی جانب رجوع کرتا ہے جو پادریوں نے تحریر کی ہین اور جو عام مطالعہ کے لیے نہیں ہوتیں، اس وقت اس کو محسوس ہوتا ہے کہ کتاب مقدس (بائبل) میں جو کتابیں (صحیفے) شامل ہیں ان کے مصدقہ ہونے کے متعلق سوال اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جتنا پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی شخص اس فرانسیسی بائبل کی جداگانہ اقساط میں

جدید اشاعت کی جانب متوجہ ہوتا ہے جو یروشلم کے دبستان کی زیر نگرانی ترجمہ کی گئی ہے تو اسے انداز بالکل مختلف دکھائی دیتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ عہد نامہ قدیم، عہد نامہ جدید کی طرح ایسے متنازعہ امور سے متعلق مسائل اٹھاتا ہے جو بیشتر تفاسیر کے مصنفین نے نہیں چھپائے ہیں۔

ہمیں نہایت معروضی نوعیت کے نسبتاً زیادہ مختصر سے مطالعہ میں انتہائی واضح مفروضات بھی ملتے ہیں، جیسے پروفیسر ایڈمنڈ جیکب کا پیش کردہ خاکہ ''عہد نامہ عتیق۔'' اس کتاب میں ایک شاندار عمومی نوعیت کا تبصرہ دکھائی دیتا ہے۔

بہت سے لوگ اس بات سے ناواقف ہیں اور ایڈمنڈ جیکب اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ عہد نامہ قدیم کے ابتدا میں ایک نہیں بلکہ کئی متن تھے، چنانچہ تیسری صدی قبل مسیح کے لگ بھگ عبرانی زبان میں ہی تین متن موجود تھے: ایک وہ متن جو میسوری متن بنا اور کم از کم جزوی طور پر یونانی ترجمہ میں استعمال کیا گیا، نیز اسفار خمسہ (توریت کی پہلی پانچ کتابوں کا سامری متن)۔ پہلی صدی قبل مسیح میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ سب کے لیے ایک متن مقرر کر دیا جائے لیکن حضرت عیسیٰ سے ایک صدی بعد تک بھی یہ امر ممکن نہ ہو سکا کہ کسی ایک متن پر سب کا اتفاق ہو جائے۔

اگر ہمارے سامنے متن کے وہ تینوں نمونے ہوتے تو ان میں مقابلہ کرنا آسان ہوتا۔ اور ہم یہ رائے قائم کر لیتے کہ شروع میں اس کی کیا شکل رہی ہوگی۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے پاس اس کا تھوڑا سا بھی نمونہ نہیں ہے۔ بحیرہ میت کے قریب دستیاب ہونے والے مخطوطہ (۲) (غار قمران) (۳) جس کا زمانہ حضرت

عیسیٰ کے عہد سے ملحق قبل مسیح کا کوئی سنہ ہے۔ یہ دوسری صدی عیسوی کے احکام عشرہ کا ایک مخطوطہ پیپرس ہے اور اس میں قدیم متن سے اختلافات ظاہر کیے گئے ہیں۔ اگر پانچویں صدی عیسوی کے چند نامکمل نسخوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر بائبل کے عبرانی زبان میں قدیم ترین متن کا زمانہ نویں صدی عیسوی کا ماننا پڑتا ہے۔

غالباً سپٹو اجنٹ (۴) (ہفتادی ترجمہ) یونانی زبان کا سب سے پہلا ترجمہ ہے اس کا زمانہ تیسری صدی قبل مسیح کا ہے اور اس کو اسکندریہ کے مقام پر یہودیوں نے تحریر کیا تھا۔ یہی وہ متن ہے جس پر عہد نامۂ جدید کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ ترجمہ ساتویں صدی عیسوی تک مستند سمجھا جاتا رہا۔ بنیادی یونانی متن جو عیسائی دنیا میں بالعموم رائج ہے، ان مخطوطات سے تیار کیے گئے تھے جو کوڈیکس ویٹ کن (کتاب ویٹ کن) کے نام سے ویٹ کن میں اور کوڈیکس سیٹیوکس (کتاب سنٹیک) کے نام سے برطانوی عجائب گھر لندن میں درج رجسٹر ہیں۔ ان کا زمانہ چوتھی صدی عیسوی کا ہے۔

پانچویں صدی عیسوی کے شروع میں سینٹ جیروم (۵) نے عبرانی تحریروں کو کام میں لا کر لاطینی میں ایک متن پیش کیا جو بعد میں چل کر ساتویں صدی عیسوی کے بعد عالمگیر اشاعت کے سبب ولگیٹ (عوامی) کے نام سے موسوم کیا گیا۔

ضمناً ہم آرامی اور شامی ترجموں کا حوالہ دیں گے لیکن واضح رہے کہ یہ نامکمل ہیں۔

ان تمام ترجموں نے ماہرین کو نام نہاد صراط الوسطیٰ متنوں کو باہم مجتمع کرنے

میں مددوی ہے۔ یہ ترجمے مختلف ترجموں کے درمیان ایک نوع کی مفاہمت ہے۔ اس کے علاوہ ہفت لسانی مجموعے شائع کیے گئے جن میں عبرانی، یونانی، لاطینی، شامی، آرامی یہاں تک کہ عربی ترجمے کو پہلو بہ پہلو ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ چیز مشہور ویٹ کن ترجمہ میں اختیار کی گئی ہے۔ (لندن۔ ۱۶۵۷ء) اس ذکر کو مکمل کرنے کی خاطر ہم یہ بھی بتائے دیتے ہیں کہ بائبل کے مختلف تصورات کا یہ نتیجہ نکلا کہ مختلف عیسائی کلیسا تمام کے تمام ایک ہی کتابوں کو نہیں مانتے اور ایک ہی زبان میں ترجمہ پر ابھی تک ان کے خیالات میں یکسانیت نہیں ہے۔ قدیم عہد نامہ کا عالم عیسوی کا (عالمگیر) ترجمہ جس کو متعدد کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ماہرین نے مل کر تحریر کیا ہے، ایک ایسا کام ہے جو وحدت پیدا کرے گا۔ یہ کام تکمیل کی منزل میں ہے اور اس کو امتزاج کے ایک کام کی شکل میں منتج ہونا چاہیے۔

اس طرح عہد نامہ قدیم میں انسانی ہاتھ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ایک اشاعت سے دوسری اشاعت اور ایک ترجمہ سے دوسرے ترجمہ میں ان تمام تصحیحات کے ساتھ جن کو وجود ناگزیر تھا یہ بات ممکن ہوئی کہ ابتدائی متن پچھلے دو ہزار سال سے زیادہ کی مدت میں بالکل بدل گیا ہے۔

بائیبل کے ماخذ

کتابوں کا ایک مجموعہ بننے سے پیشتر یہ (بائبل) ایک متداول روایت کی شکل میں تھی جس کا انحصار تمام تر انسانی حافظہ پر تھا جو حالات کو منتقل کرنے کا واحد ذریعہ تھا۔ یہ روایت گیتوں کے ذریعہ سے قائم رکھی جاتی تھی۔

ای جیکب رقمطراز ہیں کہ ''ابتدائی مرحلہ میں ہر قوم نغمہ سنجی کرتی ہے۔ ہر جگہ کی طرح اسرائیل میں بھی نظم کا آغاز نثر سے پہلے ہوا۔ اسرائیل نے طویل عرصے تک نہایت خوش اسلوبی سے نغمہ سنجی کی۔ کبھی اپنی تاریخ کے واقعات سے متاثر ہو کر فرحت و انبساط کی رفعتوں پر پہنچے، کبھی مایوسیوں کی گہرائیوں میں ڈوبے'' ان کی نگاہ میں ہر شے کا ایک مفہوم تھا۔ اسرائیلیوں نے اپنے نغموں کا متعدد طریقوں پر اظہار کیا۔ انہوں نے متعدد وجوہ سے نغمہ سنجی کی اور ای جیکب ان نغموں میں سے بہت سوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہمیں بائبل میں نظر آتے ہیں مثلاً اکل و شرب کے گیت، (غلہ) کی فصل کے گیت، عمل سے متعلق گیت جیسے کنویں کا مشہور گیت (۶) (گنتی ۲۱، ۱۷) شادی کا گیت جیسے غزل الغزلات (۷) میں اور ماتمی گیت۔ بائبل، میں جنگ و پیکار سے متعلق بھی بہت سے گیت ہیں۔ چنانچہ ان گیتوں میں ہمیں دبورہ (۸) کا گیت (قضاۃ ۵، ۱-۳۲) ملتا ہے اور اسرائیل کی وہ فتح جو یہووہ (خداوند) کو مطلوب تھی اور جو اس نے انجام کو پہنچائی۔ (گنتی ۱۰، ۳۵) اور صندوق کے کوچ کے وقت موسیٰ کہا کرتا ''اٹھ اے خداوند، تیرے دشمن پراگندہ ہو جائیں اور جو تجھ سے کینہ رکھتے ہیں وہ تیرے آگے سے بھاگیں۔''

اس میں دانشمندوں کے مقولے اور ضرب الامثال بھی ہیں (ضرب الامثال کی کتاب، تاریخی کتابوں کی ضرب الامثال اور ان کے مقولے) برکتوں اور بد دعاؤں کے الفاظ اور وہ احکام بھی ہیں جو پیغمبروں سے انسان کو الہام کے ذریعہ حاصل ہوئے۔

ای جیکب لکھتے ہیں کہ یہ الفاظ یا تو ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل کر دیئے جاتے تھے یا خدا کے برگزیدہ بندوں کے تاریخی واقعات کی شکل میں معبدوں کے ذریعہ پہنچائے جاتے تھے۔ تاریخ نے جلد ہی کہانیوں کی شکل اختیار کر لی۔ جیسے کہ یوتام کی داستان میں (قضاہ ۹، ۷۔۲۱) جہاں درخت ایک بادشاہ مقرر کرنے کے لیے خود چل کر گئے اور ان میں سے ہر ایک نے باری باری زیتون کے درخت سے، انجیر کے درخت سے، انگور کی بیل سے اور اونٹ کٹارے سے پوچھا تھا (۹) جس سے ای جیکب کو یہ لکھنے کا موقع فراہم ہوتا ہے ''ایک کہانی کہنے کی ضرورت سمجھ کر، داستان میں مضامین کے اعتبار سے یا ایسے زمانوں کے لحاظ سے خلط مبحث نہیں ہو سکا جن کی تاریخ پوری طرح معلوم نہیں تھی۔'' اس سے وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

''اغلب ہے کہ عہد نامہ قدیم میں حضرت موسیٰ اور بزرگوں کے بارے میں جو داستان بیان کی جاتی ہے وہ صرف تاریخی واقعات کے تواتر کے ساتھ تخمیناً مطابقت رکھتی ہو۔ لیکن داستان بیان کرنے والوں نے زبانی منتقل کرنے کے موقع پر بھی ان میں ایسا انداز تخیل اختیار کیا ہے، جس کی وجہ سے بیچ بیچ میں انتہائی مختلف النوع واقعات کو باہم مربوط کیا جا سکا اور جب سب کچھ کہا اور کیا جا چکا تو

انہیں یہ موقع مل گیا کہ وہ اس مواد کو ایک ایسی تاریخ کے طور پر پیش کریں جو تنقیدی نظر رکھنے والے مفکرین کے لیے یہ بتانے کو خاصا قابل تحسین ہو کہ نوع انسانی اور دنیا کے آغاز کے وقت کیا واقعات رونما ہوئے تھے۔''

یہ یقین کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک معقول دلیل موجود ہے کہ جب یہودی کنعان (۱۰) میں آباد ہو گئے جو تیرھویں صدی قبل مسیح کے آخر کی بات ہے، اس وقت روایت کو محفوظ رکھنے اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے تحریر کا فن وجود میں آ چکا تھا لیکن جو شے انسانوں کے لیے سب سے زیادہ استحکام کی طالب ہو سکتی ہے، یعنی قانون، اس میں پوری طرح صحت نہیں تھی۔ ان مین وہ قوانین جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ خدا نے خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیے ہیں، یعنی احکام عشرہ دو روایتوں کے ذریعے منتقل ہوئے۔ خروج (۲۰، ۱۔۲۱) اور استثناء (۵، ۱۔۳۰) روح سب کی وہی ہے لیکن اختلافات نمایاں ہیں۔ ایک ایسا ادارہ بھی ہے جس میں معاہدات، مراسلات، شخصیات کی فہرستوں (قضاۃ، شہر کے اعلی افسران۔ نسب نامے) چڑھاووں اور غنیمت کی فہرستوں کا ایک طویل ریکارڈ موجود ہے۔ اس طرح محافظ خانوں (آرکائیوز) کا وجود عمل میں آیا جنہوں نے آئندہ ان کتابوں کی ترتیب کے لیے دستاویزی مواد فراہم کیا جو آج کل ہمارے پاس موجود ہے۔ اس طرح ہر کتاب میں مختلف طرزوں کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ اب یہ امر ماہرین پر منحصر ہے کہ وہ اس عجیب و غریب شہادتوں کی آمیزش کے اسباب کا پتہ چلائیں۔

عہد نامہ قدیم ابتدائی زبانی روایت پر مبنی مختلف عناصر پر مشتمل ایک مجموعہ

ہے۔لہذا جو طریق کار ان واقعات کو جو دوسرے زمانہ اور دوسرے مقام پر رونما ہوئے، ابتدائی دور کے پیدا شدہ ادب کے ساتھ ملانے میں اختیار کیا گیا، اس کا جائزہ ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔

مثال کے طور پر ہم فرینکس کے دور فرمان روائی کے فرانسیسی ادب کی تخلیق کے مسئلہ کو لیتے ہیں۔ اس وقت کی زبانی روایتوں نے بھی اہم واقعات کو محفوظ رکھا۔ چنانچہ عیسائیت کے دفاع میں جنگیں، مختلف سنسنی خیز واقعات جن میں مشاہیر نے خود کو نمایاں کر کے پیش کیا۔ اور جن سے صدیوں بعد درباری شاعروں، وقائع نگاروں اور مختلف سلسلۂ منظومات کے مرتب کرنے والوں میں جوش پیدا ہوتا تھا۔ اس طریقہ سے گیارہویں صدی عیسوی کے بعد یہ بیانیہ نظمیں جن میں حقیقت افسانہ کے ساتھ ملی جلی ہوئی ہے، شاعری کے پہلے نمونوں کی تشکیل اور ان کی پیشکش کا ذریعہ بنیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور رولینڈ (۱۱) کا گیت ہے، جو ایک جنگی کارنامہ سے متعلق ایک سوانحی گیت ہے جس میں رولینڈ، اسپین کی ایک مہم سے واپسی کے وقت شہنشاہ شارلیمان کی فوج ساقہ کا کماندار تھا۔ رولینڈ کی جانثاری کا واقعہ کوئی ایسا سانحہ نہیں ہے جو کسی قصہ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ یہ واقعہ ۱۵ اگست ۷۷۸ء کو رونما ہوا تھا۔ حقیقت میں یہ پہاڑوں میں بسنے والی ایک قوم باسک کا حملہ تھا۔ اور اس لیے یہ ادبی تحریر قطعی طور پر ایک فرضی داستان نہیں کہی جا سکتی۔ اس کی ایک تاریخی بنیاد ہے۔ پھر بھی کوئی مورخ اس کو لفظاً صحیح نہیں سمجھے گا۔

بائبل اور دنیوی ادب کی تخلیق کے درمیان یہ یکسانیت حقیقت سے پوری

طرح مطابقت رکھتی محسوس ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہرگزنہیں ہے کہ بائبل کے تمام متن کوجس سے آج ہم روشناس ہیں کلیتاً علم الاصنام اوراساطیری مجموعہ کے انبار میں ڈال دیا جائے جیسا کہ بہت سے وہ لوگ کرتے ہیں، جو باقاعدہ طور پر خدا کے تصور سے منکر ہیں۔یہ بات پوری طرح ممکن ہے کہ تخلیق کے حق ہونے پر یقین رکھا جائے۔خدا کی جانب سے حضرت موسیٰ کو احکام عشرہ کے دیئے جانے کو صحیح سمجھا جائے۔انسانی معاملات میں تائیدغیبی پر عقیدہ رکھا جائے جیسے کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ہوا۔اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ بات ہمیں اس بات پر غور کرنے سے نہیں روکتی کہ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ ان حقائق کی تلخیص ہے اور یہ کہ بیان میں جو تفصیلات ہیں ان پر سختی سے نقد وتبصرہ کیا جانا چاہیے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں جو زبانی روایات منتقل ہوئیں ان میں انسانی تخلیق کا عنصر بہت زیادہ ہے۔

حواشی

۱۔ بائبل یا کتاب مقدس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) عہد نامہ قدیم یا میثاق بنی اسرائیل (۲) اسفار محرفہ (۳) عہد نامہ جدید۔ چونکہ اسفار محرفہ ابتدا میں عبرانی زبان میں نہیں لکھی گئی تھیں بلکہ اس یونانی ترجمہ میں شامل تھیں جو ۲۷۰ ق۔م میں ۷۰ علماء کی نگرانی میں کیا گیا تھا (ہفتادی ترجمہ) اس لیے یہودی انہیں معتبر نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ عہد اصلاح میں کتاب مقدس سے نکال دی گئیں اور اب بائبل صرف عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کو کہا جاتا ہے۔

عہد نامہ قدیم دراصل ان کتابوں کا مجموعہ ہے جن کو یہودی مستند سمجھتے ہیں۔ ان کتابوں یا صحیفوں کو انہوں نے اس طرح تقسیم کیا ہے۔ (i) اسفار خمسہ (ii) انبیاء (یشوع، قضاۃ، سموئیل، سلاطین، یسعیاہ، یرمیاہ حزقی ایل اور ۱۲ انبیاء خورد جن میں ہوسیع سے ملاکی تک کے انبیاء شامل ہیں۔ (iii) باقی کتابیں جو ۹۰ء سے ۱۰۰ء تک تسلیم کی گئیں۔ عہد نامہ قدیم کا جزو اعظم دو کتابیں ہیں۔ توریت اور زبور۔ عہد نامہ جدید ان کتابوں کا مجموعہ ہے جن کو کلیسا نے چوتھی صدی عیسوی میں تسلیم کیا۔ عہد نامہ جدید تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی انجیلیں ہیں۔ دوسرے حصہ میں حواریوں کے خطوط ہیں اور تیسرے حصہ میں یوحنا عارف کا مکاشفہ ہے۔ (مترجم)

۲۔ قدیم مخطوطوں اور طوماروں کا وہ مجموعہ جو ۱۹۴۷ء میں دریائے اردن کے مغربی جانب یریکو (یریحو) سے بارہ کلومیٹر کے فاصلہ پر بحیرہ میت کے شمالی

سرے سے دو کلومیٹر دور ایک غار سے دستیاب ہوا۔ جن مرتبانوں میں یہ مخطوطے اور طومار ملے، ان کا زمانہ ۲۲ ق۔م سے ۱۰۰ عیسوی تک کا سمجھا جاتا ہے۔ ان تحریروں کو بڑی محنت سے جوڑ کر پڑھا گیا۔ ان میں سے پانچ اس وقت عبرانی یونیورسٹی یروشلم میں محفوظ ہیں اور پانچ شام میں ہیں۔(مترجم)

۳۔ قمران بحیرہ میت بحیرہ لوط کے شمالی مغربی کنارے پر دامن کوہ میں ایک قدیم شہر کے کھنڈرات کی شکل میں ۱۹۵۱ء میں برآمد کیا گیا۔ اس میں چھٹی صدی قبل مسیح تک کے آثار ملتے ہیں۔ دوسری صدی قبل مسیح میں یہاں خانقاہ نشین راہبوں کا قیام تھا۔ لیکن ۶۸ء میں یہ خانقاہیں جلا دی گئیں۔ اسی زمانے میں مخطوطے مرتبانوں میں بند کر کے حفاظت کے لیے یہاں رکھ دیئے گئے۔ وہ رواں صدی کے وسط میں غار قمران سے دستیاب ہوئے ہیں اور بعض ان میں پوری طرح محفوظ ہیں۔(مترجم)

۴۔ یہ ترجمہ یونانی زبان میں حضرت عیسیٰؑ کے وقت سے ۲۷۰ سال پہلے کیا گیا تھا اور اس کے لیے ۷۰ علماء منتخب کیے گئے تھے۔

۵۔ سینٹ جیروم (۳۴۰ء یا ۴۲۰ء) اسٹرائیڈو کے مقام پر پیدا ہوئے۔ پوپ ولیمس کے مشیر رہے۔ ان کے انتقال کے بعد بیت اللحم میں مقیم ہو کر پرانے عہدنامہ کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔(مترجم)

۶۔ تب اسرائیل نے یہ گیت گایا:

"اے کنویں! تو ابل، تو اس کنویں کی تعریف گاؤ۔"

یہ وہی کنواں ہے جسے رئیسوں نے بنایا۔

اور قوم کے امیروں نے

اپنے عصا اور لاٹھیوں سے کھودا۔

۷۔ بائیبل کی ایک مختصر کتاب جو تمام تر نغمات کا مجموعہ ہے اور حضرت سلیمانؑ سے منسوب ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے سلیمان کے غزل الغزلات ''وہ اپنے منہ کے چوموں سے مجھے چومے کیونکہ تیرا عشق مے سے بہتر ہے......'' (مترجم)

۸۔ اسی دن دبورہ اور ابی نوعم کے بیٹے برق نے یہ گیت گایا کہ ''پیشواؤں نے جو اسرائیل کی پیشوائی کی اور لوگ خوشی بھرتی ہوئے...'' (مترجم)

۹۔ یوتام یربعل کا چھوٹا بیٹا تھا وہ اپنے بھائی ابی ملک کے ہاتھ سے قتل ہونے سے بچ گیا تھا۔ اس نے سکم کے لوگوں سے مدد چاہی تو درختوں کا یہ عمل شروع ہوا۔ (مترجم)

۱۰۔ بنی اسرائیل مصر سے نکل کر میدان تیہہ میں جا پڑے تھے۔ وہیں ان پر من وسلویٰ اترتا تھا۔ ایک مدت تک صحرا نوردی کرنے کے بعد ان کا قیام فلسطین میں ہوا جس کا عبرانی نام کنعان ہے۔ مصر سے چودھویں صدی ق۔م کے آخر میں نکلے اور کنعان میں تیرھویں صدی ق۔م کے شروع میں بس گئے۔ (مترجم)

۱۱۔ شارلیمان یا چارلس اعظم فرانس کا مشہور فرماں روا اور ہولی رومن ایمپائر کا شہنشاہ تھا۔ اس نے یورپ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ جب وہ محض بارہ سال کا تھا اس وقت اندلس میں امارت قرطبہ کا قیام عمل میں آیا تھا اور اندلس

میں امیر عبدالرحمٰن الداخل سریر آرائے سلطنت تھے۔ اشتوراس کے عیسائی سردار انفانسو نے اپنی مسلمان دشمنی کی بنا پر شارلیمان کو اندلس پر فوج کشی کرنے کی دعوت دی۔ وہ حملہ آور ہوا لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا بلکہ واپسی کے وقت اس کی فوج کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ جب وہ رانسی وال کے درہ سے گذر رہا تھا تو اس کی فوج کے عقبی حصہ پر جس کی کمان رولینڈ کے ہاتھ میں تھی، باسک قوم نے حملہ کر دیا اور اس قدر کشت و خون کیا کہ شاید ایک آدھ فرانسیسی بچا ہو۔ چونکہ شارلیمان جائے حادثہ سے آٹھ میل آگے نکل چکا تھا۔ اس لیے اس کو اس واقعہ کی اطلاع نہ ہوئی۔ البتہ جب نرسنگھا بجانے سے رولینڈ کے گلے کی رگیں پھٹ گئیں تھیں اور وہ مردہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ شارلمان کو بے حد افسوس ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ شعراء نے اس واقعہ کی یاد میں نظمیں اور گیت لکھے اور ان میں بڑے مبالغہ سے کام لیا۔ (مترجم)

باب۲

عہد نامہ قدیم کی کتابیں

عہد نامہ قدیم ایسی کتابوں کا مجموعہ ہے جن کی ضخامت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے اور جن کا انداز بیان بھی بڑی حد تک مختلف۔ وہ نو سو سال سے زیادہ کی مدت میں کئی زبانوں میں لکھی گئیں۔ مگران کی بنیاد زبانی روایتوں پر رہی۔ ان میں سے کئی کتابوں کی، واقعات اور مخصوص ضروریات کے تحت اصلاح کی گئی اور اس طرح ان کو مکمل کیا گیا۔ اکثر یہ کام ایسے ادوار میں ہوا جن کے درمیان کافی فصل ہے۔

یہ وسیع ادب، غالباً اسرائیلیوں کے دور شہنشاہی کے شروع میں بارآور ہوا، جو گیارہویں صدی قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے کہ فن تحریر کے ماہرین کی ایک جماعت شاہی گھرانے افراد میں سے پیدا ہوئی۔ یہ پڑھے لکھے لوگ تھے جن کا کام تحریر ہی تک محدود نہ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ پہلی نامکمل تحریریں جن کا ذکر سابقہ ابواب میں کیا گیا ہے، اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ان کتابوں کو لکھنے کی ایک خاص وجہ تھی۔ اس وقت گیتوں اور نغموں کی خاصی تعداد جمع ہوگئی تھی (جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰ کے پیغمبرانہ مکاشفات والہامات تھے۔ احکام عشرہ تھے اور ایک عمومی سطح پر قانونی دستاویزات

تھیں جنہوں نے قوانین شرعیہ بننے سے پہلے مذہبی روایات کو جنم دیا۔ یہ تمام دستاویزات ایسے اجزاء تھے جو منتشر حالت میں عہد نامہ قدیم کے مختصر نسخوں میں بکھرے ہوئے تھے۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد غالباً دسویں صدی قبل مسیح کے دوران نام نہاد اسفار خمسہ کا یہودی متن تحریر کیا گیا۔ یہ متن ان پہلی پانچ کتابوں کا مجموعہ بنا جن کو حضرت موسیٰ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بعدہ نام نہاد الٰہی متن (۱) (الوہیمی یا الوہسٹ ٹیکسٹ) کا اضافہ ہوا۔ نیز نام نہاد مرشدانہ ایڈیشن (۲) (سیسرڈوٹل ورژن) وجود میں آیا۔ ابتدائی یہودی متن میں دنیا کی پیدائش سے حضرت یعقوبؑ کی وفات تک کے واقعات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ متن جنوبی حکومت یہوداہ (۳) میں مرتب ہوا تھا۔ نویں صدی قبل مسیح کے اختتام اور آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط میں ایلیاہ (۴) اور الیشع (۵) کے پیغمبرانہ اثر رونما ہوئے اور پھیلنے لگے۔ آج ہمارے پاس ان کے صحیفے موجود ہیں۔ یہی اسفار خمسہ کے الوہیمی متن کا زمانہ بھی ہے لیکن یہ مدت یہودی متن کے مقابلے میں کافی مختصر ہے اور اس کا دائرہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے واقعات تک محدود ہے۔ یوشع (۶) اور قضاۃ کے صحیفے اس زمانہ سے شروع ہوتے ہیں۔

آٹھویں صدی قبل مسیح میں ان انبیاء کا ظہور رہا جنہوں نے تصنیفی کام انجام دیا۔ ان میں سے عاموس اور ہوسیع کا تعلق اسرائیل سے اور میکاہ کا یہوداہ سے تھا۔

۷۲۱ ق م میں سامریہ (۷) کے سقوط سے حکومت اسرائیل کا خاتمہ ہوگیا۔

یہوداہ کی حکومت نے اپنا مذہبی ترکہ سنبھالا۔ مجموعۂ امثال اسی زمانہ سے شروع ہوتا ہے جو خاص طور پر اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس میں اسفار خمسہ کے یہودی اور الوہیمی متون کو ملا کر ایک کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس طریقے سے توریت کی تشکیل عمل میں آئی۔ کتاب استثناء بھی اسی زمانے میں لکھی گئی۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے دوسرے نصف میں یسعیا (۸) کی حکومت، یرمیاہ (۹) نبی کے ظہور کے ساتھ منطبق ہو گئی لیکن ان کے کام نے ایک صدی بعد تک کوئی متعین شکل اختیار نہیں کی۔

۵۹۸ ق م میں ہونے والی بابل کی جانب پہلی جلاوطنی سے قبل صفنیاہ، ناحوم اور حبقوق کے صحیفے منصۂ شہود پر آئے۔ حزقی ایل اس پہلی جلاوطنی سے قبل ہی سے پیشینگوئی کر رہے تھے۔ ۵۸۷ ق م میں یروشلم کے سقوط سے دوسری جلاوطنی کا آغاز ہوا جو ۵۳۸ ق م تک ممتد ہے۔ (۱۰)

حزقی ایل جو آخری بڑے اور جلاوطنی کے دور کے نبی تھے ان سے منسوب کتاب موجودہ شکل میں ان کی وفات کے وقت تک ان کاتبوں نے مرتب نہیں کی تھی جن کو ان کا روحانی ورثہ ملا۔ ان ہی کاتبوں نے کتاب پیدائش کا تیسرا متن لکھا جو نام نہاد مرشدانہ متن (سسرڈوٹل ورژن) ہے اور جس کا مقصد تخلیق سے لے کر حضرت یعقوبؑ کی وفات تک کے حصہ کو پورا کرنا تھا۔ اس طرح گویا توریت کے یہودی اور الوہیمی متنوں کے مرکزی ڈھانچے میں ایک تیسرا متن داخل کرنا تھا۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ جو کتابیں تقریباً دو اور چار صدیاں پہلے لکھی گئیں ان میں اس تیسرے متن کی پیچیدگیوں کی ایک جھلک موجود ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب

کہ کتاب ''نوحہ'' ظہور میں آئی۔

خورس (سائرس۔م ۵۲۹ ق م) کے حکم سے ۵۳۸ ق م میں بابل کی جانب (یہودیوں کی) جلاوطنی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ یہودی فلسطین واپس چلے گئے اور یروشلم میں ہیکل کی تعمیر نو عمل میں آئی۔ نبیوں کی سرگرمیاں پھر روشن ہوئیں جن کے نتیجے میں حجی، زکریاہ، یسعیاہ کا تیسرا حصہ ملا کر دانیال (دانی ایل) اور ہروخ (موخر الذکر یونانی زبان میں ہے) وجود میں آئیں۔

جلاوطنی کے بعد کا زمانہ ہی حکیمانہ اقوال کی کتابوں کا عہد ہے ''امثال'' یقینی طور پر ۴۸۰ ق م کے لگ بھگ ضبط تحریر میں آئی۔ ''ایوب'' پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں لکھی گئی۔ واعظ کا زمانہ تیسری صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح غزل الغزلات اور تواریخ اول و دوم، عزرا، نحمیاہ کا زمانہ بھی وہی ہے۔ سراہ (۱۱) دوسری صدی قبل مسیح میں معرض وجود میں آئی۔ کتاب حکمت اور میکابیز اول و دوم حضرت مسیح سے ایک صدی پیشتر لکھی گئیں۔ کتاب روت، استر اور یاناہ کے زمانے کا تعین آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہی معاملہ تو بط (۱۱) اور جودت (۱۱) کا ہے۔ یہ تمام تاریخیں یہ سمجھتے ہوئے دی گئیں ہیں کہ ان کتابوں میں بعد میں تصرفات ہوتے رہے، اس لیے کہ عہد نامہ قدیم کو یہ شکل اولاً حضرت عیسیٰ سے تقریباً ایک صدی قبل دی گئی تھی۔ بہت سوں کے نزدیک تو حضرت عیسیٰ کے ایک صدی بعد تک قطعی طور پر وجود میں نہیں آئی۔

اس عہد نامہ قدیم قوم یہود کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آغاز سے لے کر عیسائیت کے شروع ہونے تک ایک ادبی دستاویز بنی رہی۔ اس میں جو کتابیں

شامل ہیں، وہ دسویں اور پہلی صدی قبل مسیح کے درمیان لکھی گئیں، ان کو مکمل کیا گیا اور ان پر نظر ثانی کی گئی۔ اس کے مرتب اور جمع کیے جانے کی تاریخ سے متعلق یہ کسی اعتبار سے بھی میرا کوئی ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ اس تاریخی جائزہ کے لیے ضروری مواد انسائیکلوپیڈیا یونیورسیلز۔ مرتبہ جے۔ پی سینڈوز پروفیسر ڈومنیکن فیکلٹیز سالکویر کے اندراجات سے لیا گیا ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ عہد نامہ قدیم کیا شے ہے، ان معلومات کو جو انتہائی لائق ماہرین نے صحت کے ساتھ مرتب کی ہیں، ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

ان تمام تحریروں میں الہامی عنصر شامل ہے لیکن ہمارے پاس اس وقت وہی سرمایہ ہے جو لوگوں نے ہمارے لیے چھوڑنا مناسب سمجھا تھا۔ ان لوگوں نے خود کو مطمئن کرنے کے لیے اس ماحول کے مطابق جس میں وہ رہ رہے تھے اور ان ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے ان متنوں کو مرتب کیا تھا۔

جب اس معروضی مواد کا اس مواد کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا ہے جو بائیبل کے ان نسخوں کے دیباچوں میں دیا ہوا ہوتا ہے، جو فی زمانہ عام اشاعت کے لیے ہوتی ہیں تو کوئی بھی شخص یہ بات محسوس کر لیتا ہے کہ ان میں جو حقائق بیان کیے گئے ان کو بالکل ہی مختلف طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ لوگ ابتدائی حقائق سے جو کتابوں کی تحریر و تدوین سے متعلق ہے، خاموشی سے گذر جاتے ہیں البتہ ابہامات جو قاری کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں، قائم رکھے جاتے ہیں۔ حقائق کو اس حد تک کم کر کے بیان کیا جاتا ہے کہ حقیقت و اصلیت کا ایک غلط تصور ان کو ملتا ہے۔ بائیبل کے دیباچوں اور ابتدائیوں کی ایک بڑی تعداد حقیقت کو اس طرح غلط انداز سے

پیش کرتی ہے۔ صحیفوں کے معاملہ میں جن میں بارہا تصرف کیا گیا ہے (مثلاً اسفار خمسہ) کہا جاتا ہے کہ بعض تفصیلات ممکن ہے بعد میں ایزاد کی گئی ہوں۔ چنانچہ ایک صحیفہ کی ایک غیر اہم عبارت کے متعلق تو بحث پیش کی جاتی ہے لیکن طویل بیانات سے متعلق اہم حقائق سے خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔ کتاب مقدس کے سلسلہ میں ایسی نادرست معلومات عام اشاعت کے لیے دیکھ کر طبیعت کو اذیت ہوتی ہے۔

توریت یا اسفارخمسہ

توریت سامی نام ہے۔

یونانی عبارت جو ہمیں انگریزی لفظ پینٹا ٹیوخ (اسفارخمسہ) فراہم کرتی ہے، ایک ایسی کتاب کا نام ہے جس کے پانچ حصے ہیں: پیدائش، خروج، احبار، گنتی اور استثناء۔ یہی وہ حصے ہیں جو ان انتالیس صحیفوں کے مجموعے کے ابتدائی پانچ رکن قرار پائے ہیں جن سے عہدنامِ قدیم کی تشکیل ہوئی ہے۔

متون کے اس مجموعے میں ابتدائے آفرینش سے یہود کے کنعان میں داخل ہونے تک کے جس کے دیئے جانے کا یہود سے ان کے مصر سے خروج کے بعد وعدہ کیا گیا تھا، واقعات ہیں بلکہ زیادہ متعین طریقہ پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی وفات تک کے واقعات ہیں۔ بہرحال ان حقائق کا تذکرہ قوم یہود کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کو بنانے والے عوامل کے ذکر کے لیے ایک عمومی نوعیت کے خاکہ کا کام انجام دیتا ہے۔ اس سے اس کا نام قانون شریعت یا توریت ہوا۔

دنیائے یہودیت و مسیحیت میں کئی صدیوں تک یہ خیال کیا جاتا رہا کہ اس کے مصنف خود حضرت موسیٰ ہیں۔ غالباً یہ ادعا اس حقیقت پر مبنی تھا کہ خداوند کریم نے حضرت موسیٰ سے فرمایا (خروج ۱۷:۱۴) اس بات کی (اعمالیق کی شکست کی) یاد قاری کے لیے کتاب میں لکھ دے۔" یا پھر مصر سے خروج کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے "موسیٰ نے ان کے سفر کا حال ان کی منزلوں کے مطابق خداوند کریم کے حکم سے قلمبند کیا۔" گنتی (۳۳:۲) اور آخر میں "اور موسیٰ نے اس

شریعت کولکھ کر کاہنوں کے جو بنی لاوی اور خداوند کے عہد کے صندوق کے اٹھانے والے تھے اور اسرائیل کے سب بزرگوں کے سپرد کیا۔ (استثنا ۳۱:۹)۔ پہلی صدی ق م سے آگے چل کر یہ نظریہ کہ حضرت موسیٰ نے اسفار خمسہ کی تصنیف کا کام کیا تھا قائم ہوا۔ فلاوی لیس جوزیفس (۱۲) اور فلو اسکندریوی (۱۳) نے اس مفروضہ کو قائم رکھا۔

آج کل یہ نظریہ قطعی طور پر ترک کیا جا چکا ہے اور ہر شخص کا اس نقطہ پر اتفاق ہے۔ اس کے باوجود نیا عہد نامہ اس کی تصنیف کے معاملہ کو حضرت موسیٰ سے منسوب کرتا ہے۔ پولس اپنے خط میں رومیوں کو لیویٹیکس کا حوالہ دیتے ہوئے (۱۰:۵) اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ ''موسیٰ نے یہ لکھا ہے کہ جو شخص اس راستبازی پر عمل کرتا ہے جو شریعت سے ہے وہ اسی کی وجہ سے زندہ رہے گا۔'' وغیرہ یوحنا اپنی انجیل میں (۵:۴۶۔۴۷) حضرت عیسیٰ سے مندرجہ ذیل باتیں کہلواتا ہے۔ ''اگر تم موسیٰ کا یقین کرتے تو میرا بھی یقین کرتے۔ اس لیے کہ اس نے میرے حق میں لکھا ہے۔ لیکن جب تم اس کے نوشتوں کا یقین نہیں کرتے تو میری باتوں کا کیونکر یقین کرو گے۔'' یہاں ہمارے پاس تصرف کرنے کی ایک مثال موجود ہے کیونکہ یونانی لفظ جو اصل سے مطابقت رکھتا ہے (EPISTEUETE) ہے، چنانچہ انجیل کے مبلغ حضرت عیسیٰ کی زبان سے جو بات کہلوا رہے ہیں وہ قطعاً غلط ہے۔ مندرجہ ذیل سے اس بات کی صراحت ہوتی ہے۔

میں اس مثال کے لیے مواد فادر دے وو (FATHER DE

(VAUS سے جو یروشلم کی بائبل سوسائٹی کے صدر ہیں مستعار لے رہا ہوں۔ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں کتاب پیدائش کے اپنے فرانسیسی ترجمہ کا دیباچہ لکھتے ہوئے اسفار خمسہ کے بارے میں ایک عمومی نوعیت کی تمہید دی جس میں نہایت قابل قدر دلائل شامل تھے۔ یہ دلیلیں مبلغین انجیل کے ان دعووں کے جو وہ کتاب زیر بحث کی تصنیف کے سلسلے میں کرتے ہیں، خلاف جاتی ہیں۔ ''فادر دے وو'' ہماری توجہ اس جانب مبذول کراتے ہیں کہ ''یہودی روایت جس کی حضرت مسیح اور آپ کے حوارین نے پیروی کی۔'' قرون وسطی کے اختتام تک تسلیم کی جاتی رہی۔ وہ اکیلا شخص جس نے اس نظریہ کی مخالفت کی بارہویں صدی میں ''اے نذرا ''تھا۔ کہیں سولہویں صدی میں جاکر کالسٹیڈ نے اس بات کی نشاندہی کی کہ حضرت موسیٰ کتاب استثناء میں اپنی ہی وفات کا حال نہیں لکھ سکتے تھے۔ (۵۔۱۲) پھر مصنف ان دوسرے ناقدین کے حوالے دیتا ہے جو اسفار خمسہ کے کم سے کم ایک حصے کو حضرت موسیٰ سے منسوب کرنے کے مخالف ہیں۔ ان میں سب سے مقدم رچرڈ سائمن (۱۴) ''فادر آف دی آریٹری'' کی کتاب ''عہدنامہ قدیم کی تنقیدی تاریخ'' ہے۔ ۱۶۷۸ء جس میں تاریخ وار ترتیب میں پیدا ہونے والی دقتوں، واقعات کی تکرار، قصوں کے الجھاؤ اور اسفار خمسہ میں طرز تحریر کے اختلافات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کتاب نے (اس زمانہ میں) ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ رچرڈ سائمن کے طرز استدلال کو اٹھارہویں صدی کے شروع میں کتب تاریخ میں کھلم کھلا اختیار کیا گیا۔ اس وقت قدامت کے حوالے اکثر اس بات سے دیئے جاتے تھے کہ ''حضرت موسیٰ نے کیا لکھا تھا۔''

یہ بات ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ کسی ایسی داستان کی مخالفت کرنا کس قدر مشکل ہے جس کو خود حضرت عیسیٰ کے (منسوب) اقوال سے تقویت پہنچی ہے۔ ہمیں سابق میں بتایا جا چکا ہے کہ عہد نامہ جدید میں اس (مفروضہ) کی حمایت کی تھی۔ یہ کام لوئی پانژدہم کے ڈاکٹر ژین آسترک کا تھا جنہوں نے اس موضوع سے متعلق ایک حتمی نوعیت کا استدلال پیش کیا۔

۱۷۵۳ء میں اپنی تصنیف ''ان ابتدائی تحریروں کے بارے میں خیالات، جن کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے کتاب پیدائش کے مرتب کرنے میں سامنے رکھا'' شائع کر کے انہوں نے مآخذ کی کثرت پر زور دیا۔ وہ غالباً اس امر کی جانب توجہ کرنے والے پہلے آدمی نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ان میں یہ جرأت تھی کہ انہوں نے ایک انتہائی اہمیت کے مسئلہ کو وقف عام کیا۔

کتاب پیدائش کے دو متن جن میں سے ہر ایک اس طریقہ کی وجہ سے جس سے خدا کو یا تو ''یہووے'' یا ''الوہیم'' کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، ایک ساتھ موجود تھے۔ بنا بریں موخر الذکر میں دونوں متن پہلو بہ پہلو شامل رہے۔ آئی کورن (۱۷۸۰ء تا ۱۷۸۸ء) نے یہی تحقیق باقی چار کتابوں کے بارے میں پیش کی ہے۔ پھر الجین نے (۱۷۹۸ء) متون میں سے اس ایک متن کے متعلق جس کو اسٹرک نے علیحدہ کر لیا تھا اور جس میں خدا کے لیے ''الوہیم'' نام استعمال کیا ہے، بتایا ہے کہ وہ بذات خود دو جگہ بٹا ہوا ہے۔ پینٹا ٹیوخ (اسفار خمسہ) لغوی اعتبار سے الگ جا پڑا تھا۔

انیسویں صدی میں ماخذ کے بارے میں اور بھی گہری تحقیق ہوئی۔ ۱۸۵۲ء

میں چار ماخذ تسلیم کے لیے گئے۔ ان کو یہودی، الوہیمی، استثنائی اور مرشدانہ متون کہا گیا ہے۔ ان کے زمانوں کا تعین کرنا بھی ممکن تھا۔

(۱) یہودی متن کو نویں صدی ق م کا مرتب شدہ قرار دیا گیا (یہوداہ میں ضبط تحریر میں لایا گیا)

(۲) الوہیمی متن غالباً تھوڑا سا جدید ہے (یہ اسرائیل میں لکھا گیا)

(۳) استثنائی متن بعض صاحبان کے نزدیک آٹھویں صدی قبل مسیح کا (ای جیکب) اور دوسرے حضرات (فادر دے وو) کے نزدیک یشوع کے زمانہ کا ہے

(۴) مرشدانہ متن (سسٹر ڈوٹل ورژن) جلاوطنی (اسیری) کے وقت یا اس کے بعد وجود میں آیا۔ چھٹی صدی قبل مسیح۔

اس بات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ اسفار خمسہ کے متن کی ترتیب و تہذیب کا کام کم از کم تین صدیوں پر محیط ہے، لیکن یہ مسئلہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ ۱۹۴۱ء میں اے لوڈس نے یہودی متن میں تین ماخذوں کو، الوہیمی متن میں چار کو، استثناء میں چھ کو اور مرشدانہ میں نو کو ممیز کیا۔ فادر دے وو رقمطراز ہیں کہ ''اس میں وہ اضافہ جات شامل نہیں ہیں جو آٹھ مختلف مصنفین کے یہاں بکھرے ہوئے ہیں۔'' اس سے بھی زیادہ قریب کے زمانے میں یہ خیال کیا گیا ہے کہ ''بہت سے شرعی دستور یا مسائل جو اسفار خمسہ میں شامل ہیں، بائبل سے باہر بھی ان جیسے نمونے موجود تھے جن کا سلسلہ ان تاریخوں سے بھی کہیں پیچھے کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے جو تاریخیں خود ان صحیفوں کے لیے متعین کی گئی ہیں۔'' اور یہ کہ ''اسفار خمسہ'' کے بہت سے قصوں میں ایسا پس منظر پیشگی متعین کیا گیا تھا جو اس سے

مختلف۔ اور زیادہ قدیم تھا۔ جس سے خیال ہے کہ یہ صحیفے اخذ کیے گئے تھے۔ یہ چیز ''روایات کی تشکیل میں دلچسپی'' کی جانب رہبری کرتی ہے۔ اس وقت مسئلہ ایسا پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ یہ سمجھنا ممکن نہیں رہتا کہ حقیقت کیا ہے؟

ماخذوں کی کثرت کی وجہ سے متعدد تضادات و مکررات ابھرتے ہیں۔ فادر دے وو طوفان عالمگیر، حضرت یوسف کے اغوا، مصر کے قیام کے دوران ان کے واقعات ایک ہی کردار سے متعلق ناموں کی عدم مطابقت اور اہم واقعات کے بارے میں مختلف بیانات کے سلسلہ میں روایات کے ایک دوسرے کے خلط ملط ہونے کی مثالیں پیش کرتے ہیں اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسفار خمسہ کی تشکیل ان روایات مختلفہ سے ہوئی ہے جن کو مرتبین نے کسی قدر سوچ سمجھ کر باہم مربوط کر دیا ہے۔ انہوں نے بعض اوقات اپنے جمع شدہ مواد کو آگے پیچھے رکھ دیا ہے، اور بعض اوقات ربط پیدا کرنے کے لیے کچھ قصے کہانیوں کو موزوں کر دیا ہے۔ تاہم انہوں نے غیر ممکن اور مطابقت نہ رکھنے والی باتوں کو متون میں ظاہر ہونے سے نہیں روکا جس کی وجہ سے موجودہ زمانہ کے لوگوں کو ماخذوں کو کھنگالنے کے لیے معروضی طریقہ اختیار کرنا پڑا۔

جہاں تک متن پر نقد و تبصرہ کا تعلق ہے، اسفار خمسہ کی ترتیب انسانی ہاتھوں سے انجام پائی ہوئی، واقعات کو جمانے اور موزوں کرنے کی غالباً ایک نہایت نمایاں اور اچھی مثال ہے۔ یہ کام قوم یہود کی تاریخ کے مختلف ادوار میں انجام پذیر ہوا اور اس کی زبانی روایتوں اور ان متنوں سے اخذ کیا گیا ہے جو سابقہ نسلوں سے دست بدست چلی آ رہی تھیں۔ اس کی ابتداء نویں یا دسویں صدی قبل مسیح میں

یہودی روایت سے ہوئی جس نے اس داستان کو اس کی بالکل ابتداء سے لیا۔ موخر الذکر اسرائیل کے اپنے مخصوص مقدر کا خاکہ اس طرح پیش کرتا ہے کہ ''وہ خدا کی اس عظیم مشیت کے ساتھ جس کا تعلق نسل انسانی سے تھا، پوری طرح مطابقت کرتے'' (فادر دے وو)۔ اس کا اختتام چھٹی صدی قبل مسیح میں مرشدانہ روایت (سسٹر ڈوٹل ٹریڈیشن) کے ساتھ ہوا۔ جس کا انداز اس اعتبار سے نہایت محتاط ہے کہ سنین اور نسب ناموں کو صحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ (۱۵)

فادر دے وو رقمطراز ہیں کہ ''وہ چند قصے جو اس کے اپنے ہیں اس امر پر شاہد ہیں کہ ان میں جائز عصبیت سے کام لیا گیا ہے۔ تخلیق کا کام مکمل ہونے پر سبت کی تعطیل، حضرت نوحؑ کے ساتھ معاہدہ، حضرت ابراہیمؑ اور بنی اسرائیل کے ساتھ عہد نامہ اور ملکفیلہ کے غار کی خریداری کا واقعہ جس کے مطابق نبیوں کو کنعات میں زمین حاصل ہوئی۔'' ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ مرشدانہ روایت کا زمانہ بابل کی اسیری کے وقت سے شروع ہوتا اور فلسطین کی جانب واپسی تک جس کا آغاز ۵۳۸ ق م میں ہوا، ختم ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ مذہبی اور خالص سیاسی مسائل کا ایک امتزاج ہے۔

تنہا کتاب پیدائش کو لے لیجئے، اس صحیفہ کی تقسیم تین ماخذوں میں پوری طرح متعین ہو چکی ہے۔ فادر دے وو اپنے ترجمہ کی تشریحات میں ہر ماخذ کے لیے کتاب پیدائش کے موجود متن کی ان عبارتوں کی فہرست دیتے ہیں جن پر اس متن کا دارومدار ہے۔ اس مواد کی شہادت میں ممکن ہے اس حصہ کی نشاندہی کر دی جائے جو کسی ایک باب میں مختلف ذرائع سے آیا ہے۔ مثلاً پیدائش کے معاملے

میں طوفان اور اس زمانہ کے معاملہ میں جو طوفان عالمگیر سے حضرت ابراہیمؑ کے زمانے تک ممتد ہے جب کہ یہ بحث کتاب پیدائش کے پہلے گیارہ ابواب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بائبل کے متن میں باری باری ایک جزو یہودی اور ایک جزو مرشدانہ (سسر ڈوٹل) متون کا ہے۔ الوہیمی متن پہلے گیارہ ابواب میں نہیں ہے۔ یہودی اور مرشدانہ حصوں کا باہم انطباق اس موقع پر بالکل واضح ہے۔ تخلیق کے متعلق اور حضرت نوحؑ تک (پہلے پانچ ابواب میں) ترتیب سادہ ہے۔ اس بیان کے آغاز سے لے کر انجام تک ایک یہودی اور ایک مرشدانہ عبارت یکے بعد دیگرے آ رہی ہے۔ طوفان عالمگیر کے سلسلہ میں اور بالخصوص ساتویں اور آٹھویں ابواب کے لیے متن میں اس طرح قطع و برید کی گئی ہے کہ اپنے ماخذ کے مطابق اس متن کو گھٹا کر نہایت مختصر عبارتوں یہاں تک کہ محض ایک جملہ میں کر دیا گیا ہے۔ انگریزی متن کو سو سطروں سے کسی قدر زیادہ جگہ میں متن میں سترہ مرتبہ تبدیلی ہوئی ہے۔ اسی سے وہ بعید از قیاس باتیں اور تضادات پیدا ہوتے ہیں جن سے ہمیں موجودہ متن کا مطالعہ کرتے وقت دو چار ہونا پڑتا ہے

(صفحہ ۸ اپر ماخذوں کی تخمینی تقسیم کی جدول ملاحظہ کیجئے)

تاریخی کتب

ان کتابوں میں ہم قوم یہود کی تاریخ کے دور میں پہنچ جاتے ہیں جو اس وقت سے ہے جب وہ ارض موعود میں وارد ہوئے (جو زیادہ امکان ہے کہ تیرہویں صدی قبل مسیح کے اختتام پر وقوع پذیر ہوا ہو) اور بابل کی اسیری تک ممتد ہے جس کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح کا ہے۔

یہاں زور اس واقعہ پر دیا جاتا ہے جس کو کوئی شخص ایک قومی نوعیت کے حادثہ سے تعبیر کرسکتا ہے اور جو وعدۂ خداوندی کے ایفا کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن اس بیان میں تاریخی صحت کا پوری طرح صفایا کردیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت یوشع بن نون کا صحیفہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں مذہبی مصالح کو سب سے مقدم رکھا گیا ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر ہی ای جیکب اس ظاہری تضاد کے نیچے خط کھینچ دیتا ہے۔ جو یریحو اور آئی کی قیاسی تباہی کے معاملے میں اثریات اور (عہدنامہ قدیم کے) متون کے مابین پیدا ہوتا ہے۔

کتاب قضاۃ خدا کی منتخب اور چیدہ قوم کے چاروں طرف پھیلے ہوئے دشمنوں کے خلاف مدافعت پر اور خدا کی نصرت پر جو اس کو حاصل ہوئی مرکوز ہے۔ اس کتاب میں کئی مرتبہ تبدیلی کی گئی جیسا کہ فادراے لیفور نہایت معروضی انداز میں کریکین بائبل کے ابتدائیہ میں بیان کرتے ہیں۔ متن میں شامل دیباچے اور ضمیمے اس بیان پر شاہد ہیں۔ ان بیانات پر جو قضاۃ میں شامل ہے روت کا قصہ جوڑا گیا ہے۔

کتاب پیدائش کے ایک سے لے کر گیارہویں باب تک یہودی اور مرشدانہ

(سسر ڈوٹل)

متون کی تقسیم کی جدول

پہلا عدد باب کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا عدد جو قوسین میں ہے فقروں کے نمبر کی نشان دہی کرتا ہے جو بعض مقامات پر دو حصوں میں منقسم ہے جو حروف الف، اور ب، سے ظاہر کیے گئے ہیں۔

حروف : ی۔ یہودی متن کو ظاہر کرتا ہے۔

م۔ مرشدانہ (سرڈوٹل) متن کو ظاہر کرتا ہے۔

مثال: ۔ جدول کی پہلی سطر ظاہر کرتی ہے کہ پہلے بات کے پہلے فقرے سے دوسرے باب کے ۴ الف فقرے تک موجودہ بائبل میں جو متن شائع کیا گیا ہے وہ مرشدانہ متن ہے۔

باب	فقرہ	تا	باب	فقرہ	متن
۱	(۱)		۲	(۴الف)	م
۲	(۴ب)		۴	(۲۶)	ی
۵	(۱)		۵	(۳۲)	م
۶	(۱)		۶	(۸)	ی
۶	(۹)		۶	(۲۲)	م
۷	(۱)		۷	(۵)	ی
۷	(۶)				م
۷	(۷)		۷	(۱۰)	ی تحریف کی گئی

۷	(۱۱)				م
۷	(۱۷)				ی
۷	(۱۳)		۷	(۱۶الف)	م
۷	(۱۶ب)		۷	(۱۷)	ی
۷	(۱۸)		۷	(۲۱)	م
۷				(۲۳)	ی
۷				(۲الف)	م

باب	فقرہ	تا	باب	فقرہ	متن
۸					ی
۸	(۳)		۸	(۵)	م
۸	(۶)		۸	(۱۲)	م
۸	(۱۳الف)				م
۸	(۱۳ب)				ی
۸	(۱۴)		۸	(۱۹)	م
۸	(۲۰)		۸	(۲۲)	ی
۹	(۱)		۹	(۱۷)	م
۹	(۱۸)		(۹)	(۲۷)	ی
۹	(۲۸)		(۱۰)	(۷)	م
۱۰	(۸)		(۱۰)	(۱۹)	ی

۱۰	(۲۰)	(۱۰)	(۲۳)	م
۱۰	(۲۴)	(۱۰)	(۳۰)	ی
۱۰	(۳۱)	(۱۰)	(۳۲)	م
۱۱	(۱)	(۱۱)	(۹)	ی
۱۱	(۱۰)	(۱۱)	(۳۲)	م

اس سے زیادہ آسان مثال اس طریقہ کے سلسلہ میں کیا ہو سکتی ہے جس طریقہ سے کہ لوگوں نے بائبل کے مقدس صحیفوں میں تحریف کی ہے۔

کتاب سموئیل اور سلاطین کی دو کتابیں سب سے بڑھ کر سوانحی مجموعے ہیں جن کا تعلق سموئیل، ساؤل، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ سے ہے۔ ان کی تاریخی قدر و قیمت بحث کا ایک موضوع ہے۔ اس نقطہ نظر سے ای جیکب اس میں بہت سی غلطیاں نکالتے ہیں۔ کیونکہ ایک ہی واقعہ سے متعلق کبھی دو اور کبھی تین تک روائتیں ملتی ہیں۔ ایلیجاہ، الیشع، یسعیاہ نبی تک بھی اس شکل میں دکھائی دیتے ہیں کہ ان میں تاریخ اور قصہ کہانی کے عناصر باہم مخلوط ہو سکتے ہیں۔ دوسرے شارحین جیسے فادر اے لیفور کا خیال یہ ہے کہ ''ان کتابوں کی تاریخی قدر و قیمت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔''

تواریخ اول و دوم، کتاب عزرا اور کتاب نحمیاہ کا مصنف ایک ہے، جس کو ''واقعہ نگار'' کہا گیا ہے اور جس نے چوتھی صدی قبل مسیح میں تصنیف کا کام کیا۔ وہ تخلیق کی تمام تاریخ کو اس دور تک دہراتا ہے۔ حالانکہ اس کے نسب ناموں کا

سلسلہ صرف حضرت داؤدؑ تک جاتا ہے۔امر واقعہ یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ کتاب سموئیل اور کتاب سلاطین کو کام میں لایا ہے۔ تناقضات اور تضادات کا خیال کیے بغیر وہ میکانکی طریقے سے ان کو نقل کر دیتا ہے۔''(ای جیکب) لیکن اس کے باوجود وہ ان صحیح حقائق کا اضافہ کر دیتا ہے، جن کی توثیق وتصدیق اثریات نے کر دی ہے۔ان کتابوں میں تاریخ کو دینی ضرورتوں کے مطابق بنانے میں احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ای جیکب کا کہنا ہے کہ ''مصنف بعض اوقات تاریخ کو دینیات کے مطابق لکھتا ہے''اس واقعہ کی تشریح کرنے کے لیے کہ منشی (۱۶) نام کے بادشاہ کا جو ایک بد مذہب جابر شخص تھا، طویل اور خوشحالی کا دور تھا، وہ اس بادشاہ کے اشوریہ کے قیام کے دوران اس کے عقائد کی تبدیلی کا مفروضہ قائم کرتا ہے۔ (۱۷) (تواریخ ۲۔۳۳۔۱۱) حالانکہ کسی بائبل یا غیر بائبل ماخذ میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔کتاب عزرا اور کتاب نیمیاہ پر نہایت سخت تنقید کی گئی ہے، اس لیے کہ ان میں مبہم نکات بھرے پڑے ہیں اور اس لیے کہ جس دور سے ان کتابوں میں بحث کی گئی ہے (چوتھی صدی قبل مسیح) خود اس کے بارے میں زیادہ اچھی معلومات نہیں ہیں کیونکہ اس دور سے متعلق غیر بائبلی دستاویزات موجود نہیں ہیں۔

توبت، جودت اور آستر کو تاریخی کتابوں میں شمار کیا گیا ہے۔ان میں تاریخ سے متعلق بڑی رعائتیں برتی گئی ہیں۔اعلام کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔کردار اور واقعات اختراع کر لیے گئے ہیں اور یہ سب مذہبی دلائل کو قوی بنانے کے لیے کیا گیا ہے۔وہ درحقیقت قصے ہیں جو اس غرض سے وضع کیے گئے ہیں کہ ان کا اختتام

ایک اخلاقی سبق پر ہو اور جن کو تاریخی ناممکن اور غیر صحیح باتوں کی مدد سے چٹ پٹا بنا لیا گیا ہے۔

میکابیز کی کتابیں بالکل ہی مختلف انداز کی ہیں۔ ان میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہے جو دوسری صدی قبل مسیح میں رونما ہوئے۔ جو اس دور کی تاریخ کا ایسا من وعن حال ہے جیسا ماننا ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں نہایت بیش قیمت بیانات شامل ہیں۔

لہٰذا ''تاریخی'' کے زیرعنوان کتابوں کا مجموعہ بے حد مختلف النوع ہے۔ تاریخ کو سائنسی اور من موجی دونوں انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

الہامی کتب

اس عنوان کے تحت ان مختلف نبیوں کی تعلیمات ملتی ہیں جن کو عہد نامہ قدیم میں شامل پہلے جلیل القدر انبیاء مثل حضرت موسیٰ، شموئیل، عالیجاہ اور الیسع سے علیحدہ شمار کیا گیا ہے۔ان پہلے انبیاء کی تعلیمات دوسری کتابوں میں دی گئی ہیں۔

الہامی کتابوں کا دور آٹھویں سے دوسری صدی قبل مسیح تک ممتد ہے۔

آٹھویں صدی قبل مسیح میں عاموس، ہوسیع، یسعیاہ اور میکاہ نام کے صحیفے موجود تھے۔ان میں سے پہلے نبی اس لیے مشہور ہیں کہ انھوں نے معاشرتی ناانصافی کو برا بھلا کہا ہے۔دوسرے کی شہرت اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے مذہبی بدعنوانیوں کے خلاف آواز اٹھائی، جس کے نتیجہ میں انہیں جسمانی اذیتوں سے گزرنا پڑا۔(جو ایک لادین فرقہ کی ایک پاک دامن طوائف سے شادی کرادینے کی شکل میں رونما ہوا) جس طرح کہ خدا کو اپنی مخلوق کو خوار کرنے کے سبب اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔لیکن پھر بھی اس نے اپنی محبت و کریمی کا سایہ ان پر رکھا۔ یسعیاہ کی حیثیت سیاسی تاریخ کے ایک کردار کی سی ہے۔ان سے بادشاہ اور حکمران مشورے کرتے ہیں، اور وہ حالات وواقعات پر چھائے رہتے ہیں۔وہ ایک عظیم الشان نبی ہیں۔ان کی اپنی ذاتی کتابوں کے علاوہ ان کے الہامات کو عین تیسری صدی قبل مسیح تک ان کے حوارین و معتقدین شائع کرتے ہیں، جن میں بداعمالیوں کے خلاف احتجاجات، قہر الٰہی کا خوف، جلاوطنی اور اسیری کے وقت مخلصی اور بعد میں فلسطین کی جانب یہودیوں کی مراجعت کے بارے

میں اعلانات ہیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ دوسرے اور تیسرے یسعیاہ میں ملمانہ غرض و غایت، سیاسی مقاصد سے ہم عناں ہو جاتی ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ یسعیاہ کے ہم عصر میکاہ کی تبلیغ بھی اسی طرح کے عام خیالات و نظریات کی اشاعت سے متعلق ہے۔

ساتویں صدی قبل مسیح میں صفیاہ، یرمیاہ، نحوم اور حبقوق نے اپنی تعلیمات سے خود کو نمایاں کیا۔ یرمیاہ شہید ہوئے، ان کے الہامات کو بروخ نے جو غالباً کتاب نوحہ کے مصنف بھی ہیں یکجا کیا۔

چھٹی صدی کی ابتداء میں بابل کی اسیری کا دور ایسا ہے جب پیغمبرانہ سرگرمیاں شدت اختیار کر گئیں۔ حزقی ایل خاص طور پر اپنے بھائی بندوں کو صبر و ضبط کی تعلیم دیتے ہیں اور ان میں یقین و امید کا جذبہ بیدار کرتے ہیں۔ ان کے مکاشفات مشہور ہیں کتاب عبدیاہ میں مفتوح یروشلم کی مصیبت و بدحالی کا تذکرہ ہے۔

جلاوطنی کے بعد جس کا اختتام ۵۳۸ ق م کے اختتام پر ہوا، نبوت کے کام حجی اور زکریاہ نے دوبارہ شروع کیے۔ انہوں نے لوگوں کو ہیکل کی تعمیر نو کے لیے آمادہ کیا۔ جب اس کی تکمیل ہوگئی تو صحیفے جو ملاکی کے نام سے مشہور ہوئے منصۂ شہود پر آئے۔ ان میں روحانیت لیے ہوئے بہت سے الہامات ہیں۔

ایک شخص کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ کتاب یوناہ، الہامی کتابوں میں کیسے شامل کر لی گئی جب کہ عہد نامہ قدیم اس کا تذکرہ کرنے کے لیے اس کے لیے کوئی حقیقی متن متعین نہیں کرتا۔ یوناہ وہ قصہ ہے جس سے ایک اہم اصول ابھر

کر سامنے آتا ہے، وہ ہے مشیت ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا۔

دانی ایل تین زبانوں میں لکھی گئی تھی (عبرانی، آرامی اور یونانی) عیسائی شارحین کے بموجب، یہ تاریخی نقطۂ نظر سے ایک بدحواس کر دینے والا اور باطل قسم کا صحیفہ ہے۔ یہ غالباً میکابی دور، یعنی دوسری صدی قبل مسیح کی تحریر ہے۔ اس کا مصنف ''غارت گری کی شناعت'' کے زمانے میں اپنے ہم وطنوں کے عقیدہ و ایمان کو یہ تسلی دے کر برقرار رکھنا چاہتا تھا کہ ''نجات کا لمحہ قریب ہے۔''

شاعری اور حکمت کی کتابیں

یہ کتابیں بے شبہ ادبی وحدت کے مجموعے ہیں۔

ان میں سب سے مقدم مناجاتیں ہیں جو عبرانی شاعری کے عظیم ترین نمونے ہیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد حضرت داؤدؑ کی تصنیف کردہ اور باقی پادریوں اور کاہنوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان کے موضوع حمد، الحاح وزاریاں اور مراقبے ہیں، اور ان سے کلیسا سے متعلق امور کی انجام دہی کا کام لیا جاتا تھا۔

سفر ایوب بالخصوص کتاب حکمت وتقویٰ کی تاریخیں غالباً ۴۰۰۔۵۰۰ ق م سے بعد کی ہیں۔

سقوط یروشلم پر "کتاب نوحہ" کے مصنف چھٹی صدی قبل مسیح کے آغاز میں بجا طور پر یرمیاہ تھے۔ ہمیں ایک مرتبہ پھر غزل الغزلات کا، جو محبت حقیقی سے متعلق تمثیلی نغمے ہیں، کتاب ضرب الامثال کا، جو حضرت سلیمانؑ اور دربار کے دیگر عقلاء کے اقوال کا مجموعہ ہے اور واعظ کا جہاں دنیاوی لذت اور حکمت کے مابین مناظرہ ہے، ذکر کرنا پڑے گا۔

چنانچہ ہمارے پاس ایسی کتابوں کا ایک مجموعہ ہے جو ان مختلف النوع عنوانات پر مشتمل ہے جو کم ازکم سات صدیوں کی مدت میں لکھی گئیں۔ جن کو ایک کتاب میں مجتمع کرنے سے پہلے انتہائی متنوع ماخذوں کو کام میں لایا گیا ہے یہ مجموعہ جو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے کس طرح اس قابل ہوا کہ اس کو ایک ناقابل تقسیم کل بنا دیا گیا اور قوم کے خیال کے مطابق چند اختلافات کے ساتھ کیونکر یہ ایک

ایسی کتاب بن گئی جن میں یہودیت ونصرانیت کا الہامی مواد شامل ہے؟ یونانی زبان میں یہ کتاب کینن (مذہبی فتویٰ) کے نام سے اپنے اس ناقابل فہم خیال کے سبب مشہور ہے جو اس میں پیش کیا گیا ہے۔

اس ممزوج کا زمانہ مسیحی دور سے شروع نہیں ہوتا بلکہ خود یہودیت تک اس کی تاریخ پہنچتی ہے جس کا ابتدائی مرحلہ ساتویں صدی قبل مسیح میں طے ہوا۔ بعد کی کتابیں پہلے سے تسلیم شدہ کتب کے ساتھ شامل کر دی گئیں۔ تاہم یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ پہلی پانچ کتابیں جن کا مجموعہ توریت یا اسفار خمسہ ہے ہمیشہ مقام اولیت کی حامل رہیں۔ جب ایک مرتبہ نبیوں کے اعلانات کا عملی اظہار ہو گیا تو ان کے متن کو ان کتابوں کے ساتھ شامل کرنے میں پھر کوئی دقت نہیں رہی جو پہلے ہی تسلیم کی جا چکی تھی۔ یہی صداقت ان بشارتوں کے سلسلے میں ہے جو انبیاء علیہم السلام نے دیں۔ دوسری صدی قبل مسیح تک نبیوں کے مذہبی فتاویٰ کی تشکیل عمل میں آ گئی۔

دیگر کتابیں مثلاً مناجاتیں، اپنی کلیسائی عبارتوں کے سبب، بعد کی تحریروں کے ساتھ ملا کر مکمل کر دی گئیں، مثلاً نوحہ، کتاب حکمت اور سفر ایوب کا صحیفہ۔

ہم دیکھیں گے کہ عیسائیت کی جو ابتدا میں یہودی عیسائیت تھی موجودہ دور کے مصنفین نے نہایت غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے جن میں ایک مثال کاردینال دانئے لوکی ہے جب تک یہ پولس کے اثر سے منقلب ماہیت نہیں ہوئی تھی۔ عیسائیت نے عہد نامہ قدیم کے ورثہ کو بغیر کسی دقت و دشواری کے تسلیم کر لیا تھا۔ اناجیل کے مصنفین موخر الذکر پر نہایت سختی سے کاربند رہے لیکن جیسے ہی اسفار محرفہ کے خارج کیے جانے سے اناجیل کا اخراج عمل میں آیا ویسے ہی عہد نامہ قدیم کے لیے اسی

انتخاب کو ضروری قرار دے دیا گیا۔ ہر چیز یا تقریباً ہر چیز تسلیم کر لی گئی ہے۔

اس مختلف النوع ممزوج کے کسی پہلو کو قرون وسطیٰ کے اختتام سے پہلے ما بہ النزاع بنانے کی کس میں جرأت تھی۔ کم از کم مغرب میں؟ جواب ہے کہ کسی شخص میں نہیں یا تقریباً کسی میں نہیں۔ قرون وسطیٰ کے اختتام سے دور جدید کے آغاز تک، دو ایک ناقد ابھرنے شروع ہوئے، لیکن جیسا کہ ہم پیشتر دیکھ چکے ہیں، ارباب کلیسا اپنا راستہ بنانے میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ آج کل بلاشبہ متن سے متعلق نقد کی ایک خاصی مقدار موجود ہے۔ لیکن اگر کلیسائی اختصاصیین بھی بہت سے تفصیلی نکات کا جائزہ لینے کی سعی میں استغراق سے کام لیتے تو وہ اس چیز میں نہایت گہرائی تک اترنے کو ترجیح نہ دیتے جس کو لطف گویائی سے وہ ''مشکلات'' کا نام دیتے ہیں۔ وہ جدید معلومات کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرنے کی جانب مشکل سے مائل ہوتے ہیں۔ وہ تاریخ کے ساتھ تو نظائر قائم کر سکتے ہیں، خاص طور سے اس وقت جب تاریخ اور بائبل کے بیانات باہم مطابقت رکھتے ہوئے محسوس ہوتے ہوں لیکن ابھی تک انہوں نے خود کو اس بات کے لیے آمادہ نہیں کیا کہ وہ سائنسی تصورات کے ساتھ کھلے دل سے اور مکمل طور پر موازنہ کر سکیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے لوگوں میں یہودی عیسائی صحف کے بارے میں احتجاج کرنے کا رجحان پیدا ہو جائے گا جو ابھی غیر متنازع رہے ہیں۔

حواشی

۱۔ یہود کے ان کتب مذہبی کے مصنفین جن میں خدا کے لیے بجائے ''یہوواہ'' کے ''الوہیم'' کالفظ استعمال ہوا ہے۔

۲۔ مرشدانہ یا پروہتی۔اس کو یروشلم میں ہیکل کے مبلغین نے مرتب کیا تھا۔

۳۔ جنوبی فلسطین کا وہ علاقہ جو حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے رحبعام اور حضرت داؤدؑ کے خانوادے سے وابستہ رہا۔ باقی اسرائیلیوں نے یربعام کو جس نے حضرت سلیمانؑ کے خلاف بغاوت کی تھی فلسطین کے بڑے حصہ کا حکمران منتخب کرلیا۔

۴۔ بنی اسرائیل کے ایک نبی جن کو ایلیجاہ یا عالیجاہ بھی کہا جاتا ہے ان کا زمانہ نویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ان کے زمانے میں زبردست معاشرتی اور مذہبی تبدیلی رونما ہوئی اور بعل دیوتا (سورج) کی پوجا نے زور پکڑنا شروع کیا۔ایلیاہ نے اس تحریک کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔(مترجم)

۵۔ بنی اسرائیل کے ایک اور نبی جو ایلیاہ کے جانشین ہوئے۔(مترجم)

۶۔ حضرت یوشع بن نون جو حضرت موسیٰ کے بعد نبی ہوئے اور جنھوں نے بنی اسرائیل کو کنعان کا مالک بنایا۔(مترجم)

۷۔ دسویں سے آٹھویں صدی تک اسرائیل کا دارالحکومت رہا۔رواں صدی کے پہلے اور دوسرے ربع میں کھدائیاں کرا کر آثار برآمد کیے گئے ہیں۔

۸۔ یسیعا (م ۶۰۸ ق م) یہوداہ کا بادشاہ تھا وہ اپنے باپ اموص

کا جانشین ہوا، اس کے زمانے میں قانون شریعت ایک معبد سے دستیاب ہوا اس نے ایک اصلاحی تحریک شروع کی۔ یرمیاہ نبی نے اس زمانے میں پیشین گوئیاں کیں۔ مصر کے فرعون نیخو نے اس عہد میں فلسطین پر حملہ کیا۔ یسیعاہ نے اس کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور لڑائی میں مارا گیا۔ (۶۰۸ ق م)

۹۔ بنی اسرائیل کے ایک جلیل القدر نبی جن کا زمانہ ۶۵۰ ق م سے ۵۸۵ تک قرار دیا گیا ہے انہوں نے پیشین گوئیاں کیں جو عہد نامہ قدیم میں شامل صحیفوں یرمیاہ اور نوحہ میں مذکور تھیں۔

۱۰۔ ساتویں صدی قبل مسیح سے بنی اسرائیل کی بدکاریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ اس وقت کئی نبی مبعوث ہوئے، انہوں نے بہت کچھ عذاب خداوندی سے ڈرایا لیکن بنی اسرائیل باز نہ آئے۔ آخر کار بابل کے دوسرے دور عروج کا مشہور فرماں روا بخت نصر دوم (۶۰۵ ق م تا ۵۶۲ ق م) مصر کے یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ یہ اس قوم کی پہلی جلاوطنی یا اسیری تھی جس شخص کو بخت نصر نے یروشلم کی حکومت سپرد کی تھی اس نے ۵۸۷ ق م میں بغاوت کر دی جس کی وجہ سے اس نے دوبارہ حملہ کیا۔ بیت المقدس کو تباہ کر دیا اور بہت سے یہودیوں کو گرفتار کر کے لے گیا۔ آخر کار خورس کے زمانہ میں رہائی ملی۔ (مترجم)

۱۱۔ تینوں کتابیں اسفار محرفہ میں شامل ہیں۔

۱۲۔ اس کا اصل نام جوزف بن میتھیاس ہے وہ یہودی مورخ اور شاہی خاندان کا ایک جنرل تھا۔ یروشلم میں پیدا ہوا (۳۷) اس نے یونانی اور عبرانی ادب کا مطالعہ کیا۔ تین سال ایک درویش کے ساتھ ریگستانی علاقے میں گزارے پھر وہ یروشلم لوٹ آیا۔ گیلیگی کا گورنر بنا، اس بغاوت میں شریک رہا جو رومیوں کے خلاف برپا ہوئی۔ آخر عمر میں یہوداہ میں کچھ قطعات زمین اور وظیفہ لے کر گوشہ نشین ہو گیا۔ اس نے کئی کتابیں جن میں قوم یہود کی تاریخ ہے لکھیں تقریباً ۱۰۰ء میں فوت ہوا۔ (مترجم)

۱۳۔ اس کا زمانہ پہلی صدی ق م کا آخر اور پہلی صدی عیسوی کا شروع زمانہ ہے۔ وہ اسکندریہ کا یونانی الاصل یہودی تھا۔ اسی لیے ''یہودی افلاطون'' بھی کہلاتا ہے۔ سنہ ۴۰ء میں یہودیوں کے ایک وفد کی جو روم گیا تھا قیادت کی۔ اس نے افلاطون، ارسطو اور دیگر یونانی افکار کے فلسفہ کی اسفار خمسہ کے اصولوں سے مطابقت کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ (مترجم)

۱۴۔ رچرڈ سائمن کا زمانہ ۱۶۳۸ء سے ۱۷۱۲ء تک ہے اس کا تعلق فرانسیسی رومن کیتھولک سے تھا۔ اس کی کتابوں میں دو کافی مشہور ہیں ایک استوار کریتک دوو ڈنیتا ماں (عہد نامہ قدیم کی تنقیدی تاریخ) اور دوسری استوار کریتک ڈوٹیکست دونوروتیستا ماں ہے۔ پہلی کا سنہ تصنیف ۱۶۷۸ء ہے اور دوسری کا ۱۶۸۳ء پہلی کتاب پر رومن

کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں جماعتوں کی طرف سے ہنگامہ ہوا۔
(مترجم)

۱۵۔ آئندہ ابواب میں جب ہم جدید سائنسی معلومات سے دو چار ہوں گے اس وقت ہم دیکھیں گے کہ سرڈوٹل ورژن کے مصنفین نے سطح زمین پر انسان کی قدامت، زبان میں اس کے مقام اور تخلیق کے عمل کے موضوع پر واقعاتی غلطیاں کتنی تعداد میں کی ہیں۔ یہ غلطیاں نمایاں طور پر متون میں تحریف اور ردوبدل کی وجہ سے ہوئی ہیں۔

۱۶۔ منشی (سنہ ۶۹۲ ق م تا ۶۳۹ ق م) یہوداہ کا بادشاہ تھا۔ اس کا دورِ حکمرانی طویل ترین تھا۔ اشوریہ کا باجگوار رہا۔ کچھ عرصے بابل میں قید کاٹی۔ منیسے کی دعا جو اسفار محرفہ میں دی گئی ہے اس سے منسوب کی جاتی ہے۔

۱۷۔ عہدنامہ قدیم میں یہ واقعہ اس طرح درج ہے:۔
"اور خداوند نے منشی اور اس کے لوگوں سے باتیں کیں پر انہوں نے کچھ دھیان نہ دیا۔ اس لیے خداوند ان پر بادشاہ اشور کے سپہ سالار کو چڑھا لایا جو منشی کو زنجیروں سے جکڑ کر اور بیڑیاں ڈال کر بابل کر لے گئے۔ جب وہ مصیبت میں پڑا تو اس نے خداوند اپنے خدا سے منت کی اور اپنے باپ دادا کے خدا کے حضور نہایت خاکسار بنا اور اس نے اس سے دعا کی۔ تب اس نے اس کی دعا قبول کر کے اس کی فریاد سنی

اور اسے اس کی مملکت میں یروشلم کو واپس لایا۔تب منسی نے جان لیا کہ
خداوند ہی خدا ہے۔(۲تواریخ ۳۳: ۱۱۔۱۳)

باب ۳

عہد نامہ قدیم اور سائنس

نتائج تحقیقات

ان مضامین میں سے جو عہد نامہ قدیم اور اسی طرح اناجیل میں بیان ہوئے ہیں، کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو جدید معلومات کی روشنی میں فراہم کردہ واقعات سے مطابقت رکھتا ہو۔ جب بائبل کے متن اور سائنس کے مابین کوئی بے آہنگی واقع ہوتی ہے تو یہ نہایت اہم نکات پر ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم سابقہ باب میں پہلے ہی دیکھ چکے ہیں، بائبل میں تاریخی تسامحات پائے جاتے ہیں اور صراحت کے طور پر ہم یہودی اور عیسائی ماہرین کی نشاندہی پر ان میں سے متعدد کا حوالہ بھی دے چکے ہیں۔ مؤخر الذکر قدرتی طور پر اس جانب مائل ہیں کہ اس قسم کے تسامحات کی اہمیت کو گھٹا کر دکھائیں۔ وہ کسی دیندار مصنف کے لیے اس بات کو ایک قدرتی سی چیز قرار دیتے ہیں کہ وہ تاریخی واقعات کو دینیات کے مطابق بنا کر پیش کر دے، اور تاریخ کو اس طرح لکھے کہ وہ بعض ضرورتوں سے ہم آہنگ ہو جائے۔ متی کے مطابق انجیل کے معاملہ میں ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ حقائق کو بیان کرنے میں یہ آزادی برتی گئی اور جو کچھ اس

کے خلاف ہوا، اس پر تنقید کرنے کی اجازت بھی اسی طرح دی گئی گویا وہ حق ہے۔ کوئی منطقی مزاج اور معروضی طریقہ اختیار کرنے والا شخص اس طرز عمل سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔

منطقی واویہ نظر سے یہ ممکن ہے کہ تضادات اور ناممکنات کی ایک کثیر تعداد کو نکال باہر کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ دو مختلف ماخذوں کی موجودگی کی، جو کسی ایک واقعہ کو تحریر کرنے میں اختیار کیے گئے ہیں، ابتداءً ایک حقیقت کو دو مختلف طریقوں سے پیش کرنے کی وجہ سے ہو۔ پھر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ مختلف تصرفات خود متن میں بعد کے اضافہ جات، ان تفسیروں کی طرح جو بعد میں شامل کی جاتی ہیں، پھر جب دوبارہ نقل ہونے لگے تو ان ہی کو بعد کے متن میں شامل کر لیا گیا ہو۔ ان باتوں کا ماہرین نے اصل عبارت پر تنقید کے سلسلہ میں پوری طرح اعتراف کیا ہے اور بعض نے تو بڑی صاف گوئی سے کام لے کر ان کے نیچے خط کھینچ دیا ہے۔ مثلاً اسفار خمسہ کے معاملہ میں فادر دے وو نے عام تمہید میں جو انہوں نے کتاب پیدائش کے ترجمہ کے شروع میں دی ہے (صفحات ۱۳ اور ۱۴)، متعدد اختلافات کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ ہم ان کو یہاں نقل نہیں کریں گے اس لیے کہ اس جائزے کے دوران ہم ان میں سے متعدد کا بعد میں حوالہ دیں گے۔ عام تاثر جو کسی شخص کو ملتا ہے وہ یہ ہے کہ متن کو حرف بہ حرف قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اس موقع پر ایک بڑی نمایاں مثال پیش کی جاتی ہے۔

کتاب پیدائش میں (۶، ۳) طوفان عالمگیر سے متصل خدا فیصلہ کرتا ہے کہ آئندہ سے آدمی کی عمر کی حد ایک سو بیس سال ہوا کرے گی۔ ''اس کی عمر ایک سو

بیس برس کی ہوگی۔'' لیکن بعد میں چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ اسی کتاب پیدائش میں درج ہے (۱۱: ۱۰۔۳۲) کہ حضرت نوحؑ کے اخلاف میں سے دس کی عمریں ۱۴۸ سے لے کر ۶۰۰ تک سال ہوئیں (اسی باب میں وہ جدول ملاحظہ کیجئے جس میں حضرت نوحؑ کے اخلاف کو حضرت ابراہیمؑ تک پیش کیا گیا ہے) ان عبارتوں کے مابین تضاد و تناقص بالکل واضح ہے۔ اس کی تشریح و توضیح معمولی نوعیت کی ہے پہلی عبارت (پیدائش ۶، ۳) ایک یہودی متن ہے جس کا زمانہ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چلے ہیں، دسویں صدی قبل مسیح سے بعد کا ہے۔ کتاب پیدائش میں دوسری عبارت (۱۹: ۱۰، ۳۲) نہایت جدید دور کا ایک متن ہے۔ (چھٹی صدی قبل مسیح) جس کا ماخذ مرشدانہ نسخہ ہے۔ یہ نسخہ ان نسب ناموں کی ابتداء پر ہے جو عمروں کی لمبائی کے متعلق معلومات کے سلسلے میں ایسے قرین صحت ہیں جیسے وہ بحیثیت مجموعی ناممکن ہیں۔

یہ بات کتاب پیدائش میں ہے کہ ہم جدید سائنس کے ساتھ نہایت نمایاں غیر ہم آہنگیاں پاتے ہیں۔ ان کا تعلق تین لازمی نکات سے ہے۔

(۱) دنیا کی تخلیق اور اس کے مدارج

(۲) دنیا کی تخلیق کی تاریخ اور سطح ارض پر ظہور آدم کی تاریخ

(۳) طوفان عالمگیر کا بیان۔

دنیا کی تخلیق

جیسا کہ فادر دے وو بتاتے ہیں کتاب پیدائش "تخلیق کے دو پہلو بہ پہلو ملا کر رکھے گئے بیانات سے شروع ہوتی ہے۔" جب جدید سائنسی مواد کے ساتھ ان کی ہم آہنگی کے نقطہ نظر سے ان کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ دیکھنا پڑے گا۔

تخلیق کا پہلا بیان

پہلا بیان۔ باب اول اور باب دوم کی اولین آیات پر محیط ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے عدم صحت کا یہ ایک شاہکار ہے اس کے لیے ایک پارے کا ایک وقت میں جائزہ لینا پڑے گا، جو عبارت یہاں پیش کی جا رہی ہے وہ بائبل کے نظر ثانی شدہ معیاری نسخہ سے ماخوذ ہے۔ (روائزڈ اسٹینڈرڈ ورژن آف دی بائبل)

باب اول آیات ۱ اور ۲۔

> "خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کے اوپر جنبش کرتی تھی۔"

یہ مان لینا قطعاً ممکن ہے کہ زمین کی تخلیق سے پہلے جو شے کائنات کی شکل میں رونما ہونے والی تھی جو ہمارے علم میں ہے کہ یہ تاریکی سے ڈھکی ہوئی ہو لیکن اس

زمانے میں پانی کی موجودگی کا تذکرہ کلیتہً ایک خاص تصور ہے۔ ہم اس کتاب کے تیسرے حصہ میں دیکھیں گے کہ اس امر کی ہر علامت موجود ہے کہ کائنات کی تشکیل کے ابتدائی درجہ میں گیس کا ایک تودہ موجود تھا۔ اس کی جگہ پانی کو قائم کر دینا غلطی ہے۔

آیات ۳ تا ۵۔

"اور خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی سو پہلا دن ہوا۔"

کائنات میں جو روشنی چکر لگا رہی ہے وہ ستاروں میں پیچیدہ قسم کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ اس ردعمل کی جانب ہم اس کتاب کے تیسرے حصہ میں مراجعت کریں گے۔ تاہم بائبل کے بموجب تخلیق کے اس مرحلے میں ستاروں کی تشکیل ہنوز نہیں ہوئی تھی۔ کتاب پیدائش میں فلک کی روشنیوں کا ذکر چودھویں آیت تک نہیں آیا۔ جب کہ چوتھے دن نیروں کی تخلیق عمل میں آئی تا کہ "وہ دن کو رات سے الگ کریں" "اور زمین پر روشنی ڈالیں۔" اور یہ تمام تر صحیح ہے لیکن یہ بات غیر منطقی ہے کہ نتیجہ (روشنی) کا ذکر پہلے دن میں ہی کر دیا گیا جب کہ اس روشنی کا منبع (سبب) تین دن بعد تخلیق ہوا۔ علاوہ ازیں شام اور صبح کے وجود کی حقیقت کو پہلے ہی دن بیان کر دینا قطعاً ایک قیاسی بات ہے۔ شام اور صبح کا وجود ایک دن کے حصوں کے طور پر صرف زمین کی تخلیق اور اس کے اپنے نیر یعنی سورج کی روشنی کے تحت گردش شروع کرنے کے بعد سمجھ میں آ سکتا ہے۔

آیات ۶ تا ۸

''اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے درمیان فضا ہو، تاکہ پانی، پانی سے جدا ہو جائے اور خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانی کو فضا کے اوپر کے پانی سے جدا کیا۔ اور ایسا ہی ہوا، اور خدا نے فضا کو آسمان کہا اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو دوسرا دن ہوا۔''

پانیوں کے خیالی افسانہ کا سلسلہ یہاں بھی جاری ہے۔ اس طرح کہ فضا نے ان کو دو طبقوں بانٹ دیا وہ اس لیے کہ طوفان عالمگیر کا بیان اوپر کے پانی کو گزرنے اور زمین کے اوپر بہنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پانیوں کی دو انباروں کی شکل میں جدائی کا یہ تصور سائنسی نقطہ نظر سے نا قابل قبول ہے۔

آیات ۹ تا ۱۳

''اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کو سمندر اور خدا نے دیکھا کہ یہ اچھا ہے۔ اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں کو اور پھلدار درختوں کی جو اپنی اپنی جنس کے موافق پھلیں اور جو زمین پر اپنے آپ ہی میں بیج رکھیں اگائے اور ایسا ہی ہوا۔ تب زمین نے گھاس اور بوٹیوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق بیج رکھیں، اور پھلدار درختوں کو جن کے بیج ان کی جنس کے موافق ان میں ہیں اگایا اور خدا نے دیکھا کہ یہ اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو تیسرا دن ہوا۔''

یہ حقیقت کہ براعظم زمین کی تاریخ میں اس وقت ابھرے جب وہ ہنوز پانی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سائنسی اعتبار سے کلیتہً قابل قبول ہے۔ البتہ جو بات قطعاً کمزور ہے، وہ یہ تصور ہے کہ سورج کے وجود میں آنے سے قبل ایک انتہائی منظم عالم نباتات جو بیج سے اگے منصۂ شہود پر آ جاتا ہے۔ (کتاب پیدائش میں ہے کہ سورج چوتھے دن سے پہلے نمودار نہیں ہوتا) اور اسی طرح راتوں اور دنوں کے تواتر سے ظاہر ہونے کا معاملہ بھی قابل فہم نہیں ہے۔

آیات ۱۴تا۱۹

"اور خدا نے کہا کہ فلک پر نیر ہوں کہ دن کو رات سے الگ کریں اور وہ نشانوں اور زمانوں اور دنوں اور برسوں کے امتیاز کے لیے ہوں۔ اور وہ ملک پر انوار کے لیے ہوں کہ زمین پر روشنی ڈالیں اور ایسا ہی ہوا۔ سو خدا نے دو بڑے نیر بنائے۔ ایک نیر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیر اصغر جو کہ رات پر حکم کرے، اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا اور خدا نے ان کو فلک پر رکھا کہ زمین پر روشنی ڈالیں اور دن پر اور رات پر حکم کریں اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کریں اور خدا نے دیکھا کہ یہ اچھا ہے۔ اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو چوتھا دن ہوا۔"

یہاں بائبل کے مصنف کا بیان قابل قبول ہے۔ اس عبارت پر صرف یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ بحیثیت مجموعی اس ذکر کو مناسب مقام نہیں دیا گیا، زمین اور چاند جیسا کہ ہمارے علم میں ہے اپنے ابتدائی نیر یعنی سورج سے خارج ہوئے ہیں۔ سورج اور چاند کی تخلیق کو زمین کی تخلیق کے بعد قرار دینا نظام شمسی کے

ارکان کی تشکیل کے پوری طرح تسلیم شدہ تصورات کے خلاف ہے۔

آیات ۲۰ تا ۲۲

”اور خدا نے کہا کہ پانی جانداروں کو کثرت سے پیدا کرے اور پرندے زمین کے اوپر فضا میں اڑیں اور خدا نے بڑے بڑے دریائی جانوروں کو اور ہر قسم کے جاندار کو جو پانی سے بکثرت پیدا ہوئے تھے اس کی جنس کے موافق اور ہر قسم کے پرندوں کو ان کی جنس کے موافق پیدا کیا اور خدا نے دیکھا کہ یہ اچھا ہے اور خدا نے ان کو یہ کہہ کر برکت دی کہ پھلو اور بڑھو اور ان سمندروں کے پانی کو بھر دو اور پرندے زمین پر بہت بڑھ جائیں اور شام ہوئی اور صبح ہوئی سو پانچواں دن ہوا۔“

اس عبارت میں ایسے دعوے ہیں جو نا قابل قبول ہیں۔

کتاب پیدائش کے مطابق عالم حیوانی کی ابتداء سمندری جانوروں اور پرندوں کے ظہور سے ہوئی۔ بائبل کے بیان سے یہ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ہم آئندہ آیات میں دیکھیں گے۔ کہ بعد میں آنے والے دن تک۔ زمین جانوروں سے آباد نہیں ہوئی۔

یہ بات تو یقینی ہے کہ حیات کی ابتداء سمندر سے ہوئی لیکن اس سوال پر بحث اس کتاب کے تیسرے حصہ سے پہلے نہیں کی جائے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ زمین پر جانوروں کی آبادی سمندر سے ہوئی لیکن جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے کہ پرندوں کی ابتداء ان جانوروں سے ہوئی جو سطح ارض پر مسکن گزین تھے۔ خاص طور پر رینگنے والے جانوروں کی ایک ایسی قسم سے جو دور ثانی میں اس پر رہ رہے تھے۔

بہت سی حیاتیاتی خصوصیات جو دونوں اقسام میں مشترک ہیں، نتیجہ کے اس استخراج کے امکان کو ظاہر کرتے ہیں تاہم زمین پر بسنے والے چوپاؤں کا تذکرہ کتاب پیدائش کے چھٹے دن تک نہیں کیا گیا جو پرندوں کے ظہور کا دن ہے لہذا پیدائش کی یہ ترتیب کہ زمین کے چوپائے، پرندوں کے بعد وجود میں آئے قابل قبول نہیں ہے۔

آیات ۲۴ تا ۳۱

''اور خدا نے کہا کہ زمین جانداروں کو ان کی جنس کے موافق چوپائے اور رینگنے والے جاندار اور جنگلی جانور کی جنس کے موافق پیدا کرے اور ایسا ہی ہوا اور خدا نے جنگلی جانوروں اور چوپایوں کو ان کی جنس کے موافق اور زمین کے رینگنے والے جانداروں کو ان کی جنس کے موافق بنایا اور خدا نے دیکھا کہ یہ اچھا ہے۔ پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کے مانند بنائیں اور وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپایوں اور تمام زمین اور سب جانداروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں اختیار رکھیں۔''

''چنانچہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔ نر اور ناری ان کو پیدا کیا۔''

''اور خدا نے ان کو برکت دی اور کہا کہ پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور و محکوم کرو اور سمندر کی مچھلیوں اور ہوا کے پرندوں اور ان جانوروں پر جو زمین پر چلتے ہیں اختیار رکھو۔ اور خدا نے کہا کہ دیکھو میں تمام روئے

زمین کی کل بیج دار سبزی اور ہر درخت جس میں اس کا بیج دار پھل ہو تم کو دیتا ہوں۔ یہ تمہارے کھانے کو ہیں۔ اور زمین کے کل جانوروں کے لیے اور ہوا کے کل پرندوں کے لیے اور ان سب کے لیے جو زمین پر رینگنے والے ہیں جن میں زندگی کا دم ہے کل ہری بوٹیاں کھانے کو دیتا ہوں اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے سب پر جو اس نے بنایا تھا نظر کی اور دیکھا کہ وہ سب بہت اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو چھٹا دن ہوا۔''

یہ تخلیق کے عروج کا تذکرہ ہے۔ مصنف اس سب جاندار مخلوق کی فہرستیں پیش کر دیتا ہے جس کا پہلے ذکر نہیں ہوا تھا اور انسان اور چوپائے کی خوراک کی مختلف اقسام بھی بیان کر دیتا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سہو اس بات میں ہوا کہ چوپایوں کے ظہور کو پرندوں کے بعد دکھایا گیا۔ تاہم انسان کے ظہور کو صحیح طور پر جملہ جاندار اشیاء کی اصناف کے بعد رکھا گیا ہے۔

تخلیق کا ذکر باب دو کی پہلی تین آیات میں اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

''سو آسمان اور زمین اور ان کے کل لشکر کا بنانا ختم ہوا اور خدا نے اپنے کام کو جسے وہ کرتا تھا ساتویں دن ختم کیا اور اپنے سارے کام سے جسے وہ کر رہا تھا ساتویں دن فارغ ہوا اور خدا نے ساتویں دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا کیونکہ اس میں خدا ساری کائنات سے، جسے اس نے پیدا کیا اور بنایا فارغ ہوا۔''

''یہ ہے آسمان اور زمین کی پیدائش جب وہ خلق ہوئے ۔جس دن خداوند خدا نے زمین اور آسمان کو بنایا۔''

ساتویں دن کا یہ تذکرہ کسی قدر اظہار خیال چاہتا ہے۔

پہلی چیز بعض الفاظ کا مفہوم ہے۔متن، بائبل کے روائز ڈ اسٹنڈ رڈ ورژن سے لیا گیا ہے جس کا صدر میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں لفظ لشکر اغلباً مخلوق اشیاء کی کثرت کو ظاہر کرتا ہے۔ جہاں تک اس عبارت کا تعلق ہے۔''وہ فارغ ہوا'' یہ عبرانی لفظ ''شباط'' کے ترجمہ کرنے کا ایک ڈھنگ ہے۔لفظ ''شباط'' سے یہودیوں کے آرام (چھٹی) کا دن ماخوذ ہے۔لہذا انگریزی کی عبارت سبتھ، اردو سبت ہو گئی۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ خدا کے متعلق جو چھ دن کے کام کے بعد آرام کرنے کو کہا گیا ہے یہ محض خرافات ہے۔پھر بھی اس کی ایک توضیح وتاویل ہوسکتی ہے۔ہمیں یہ امر ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تخلیق کا جو بیان اس جگہ پیش کیا گیا ہے نام نہاد مرشدانہ متن سے لیا گیا ہے جن کو ان پادریوں اور منشیوں نے تحریر کیا تھا جو بابل کی اسیری کے زمانہ کے نبی حزقی ایل کے روحانی جانشین تھے اور جنہوں نے چھٹی صدی قبل مسیح میں لکھا تھا۔ہم یہ بات پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح پادریوں نے کتاب پیدائش کے یہودی اور ایلوہی متون کو لیا اور اسی موقف کے مطابق اپنے انداز میں تشکیل نو کر لی۔ فادر دے وو نے لکھا ہے کہ ان تحریروں کا شرعی نقطہ نظر بے حد لازمی ہے۔اس کا ایک خاکہ صدر میں پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔

جب کہ تخلیق کے یہودی متن میں جو مرشدانہ متن سے کئی صدی پہلے لکھا گیا

تھا خدا کے آرام کا جو ہفتہ بھر کی مشقت کے سبب تھکن ہو جانے کے بعد اس نے کیا تھا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مرشدانہ متن کے مصنفین نے اس کو اپنی تحریر میں شامل کرلیا۔ وہ موخر الذکر کو الگ الگ دنوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ہفتہ کے دنوں کا نہایت باضابطہ اظہار کرتے ہیں وہ یوم سبت کے گرد جو آرام کے لیے ہے اس ہفتہ کی تعمیر کھڑی کرتے ہیں اور معتقدین کے لیے اس بات کی نشاندہی کر کے کہ خداوند کریم نے سب سے پہلے اس کی تقدیس کی تھی ان کو حق بجانب بنانا چاہتے ہیں۔ اس عملی ضرورت کے نتیجہ میں جو بیان پیش کیا گیا ہے وہ بظاہر منطقی حیثیت سے مذہبی ترتیب کا حامل ہے لیکن فی الحقیقت سائنسی معلومات ہمیں اس امر پر مجبور کرتے ہیں کہ موخر الذکر کو ہم ایک من گھڑت قسم کی چیز سمجھیں۔

یہ تصور کہ تخلیق کے سلسلہ وار مدارج، جس طرح کہ مرشدانہ مصنفین نے لوگوں کے مذہبی معتقدات کو ابھارنے کی خواہش کے طور پر بیان کیے تھے سکڑ کر ایک ہفتہ کی مدت میں سما گئے۔ ایک ایسا مفروضہ ہے جس کی سائنسی نقطہ نظر سے مدافعت ممکن نہیں ہے۔ آج ہمیں مکمل طور پر اس بات کا شعور ہے کہ کائنات اور زمین کی تخلیق مختلف مدارج سے ہو کر گذری اور اس میں کافی عرصہ لگا۔ (کتاب ہذا کے تیسرے حصے میں جب ہم تخلیق کیبارے میں قرآن کی دی ہوئی معلومات پر غور کریں گے تو اس سوال کو اس وقت زیر بحث لائیں گے) اگر چھٹے دن کی شام کو ہی یہ تذکرہ اس ساتویں دن کا جب بقول کے خداوند کریم نے آرام کیا تھا ذکر کیے بغیر اختتام کو پہنچ جاتا یا جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے جس سے یہ خیال کرنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے کہ واقعی دنوں کے بجائے وہ غیر معینہ طول کے ادوار ہیں

تب بھی مرشدانہ متن کا بیان کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ان واقعات کا جو اس میں مذکور ہیں تو اتر ہی سائنس کی ابتدائی معلومات کے کلیتہً مخالف ہے۔

لہذا یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ تخلیق کا مرشدانہ بیان ایک تصوری اور اختراعی داستان ہے۔اس کا مقصد حقیقت کا علم دینے کے بجائے کلیتہً مختلف تھا۔

دوسرا بیان:۔

کتاب پیدائش میں تخلیق کا دوسرا بیان کسی تبصرہ یا عبارت کی تبدیلی کے بغیر پہلے بیان کے فوراً بعد ہے۔اس پر اس قسم کے اعتراضات وارد نہیں ہوتے۔

ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ بیان تقریباً تین صدی پرانا اور نہایت مختصر ہے۔اس میں انسان اور جنت ارضی کی تخلیق کے لیے ارض وسماوات کی تخلیق سے زیادہ جگہ دی گئی ہے۔اس کو بھی انتہائی اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ (باب ۲۔آیات ۴ تا ۷) ''یہ ہے آسمان اور زمین کی پیدائش جب وہ خلق ہوئے جس دن خداوند خدا نے زمین اور آسمان کو بنایا اور زمین پر اب تک کھیت کا کوئی پودا نہ تھا اور نہ میدان کی کوئی سبزی اب تک اگی تھی۔کیونکہ خداوند خدا نے زمین پر پانی نہیں برسایا تھا۔اور نہ زمین جوتنے کو کوئی انسان تھا بلکہ زمین سے کہر اٹھتی تھی۔ اور تمام روئے زمین کو سیراب کرتی تھی اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا۔''

یہ یہودی متن ہے جو موجودہ دور کی بائبلوں کے متن میں دکھائی دیتا ہے مرشدانہ متن اس میں بعد کو جوڑا گیا ہے لیکن یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا یہ ابتدا میں اتنا ہی مختصر تھا۔کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہودی متن اس تمام اثناء

میں قطع و برید کی زد میں نہیں آیا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ چند سطریں جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں اس تمام چیز کی ترجمانی کرتی ہیں جو تخلیق کے بارے میں بائبل کے قدیم ترین متن میں بتائی گئی تھی۔

یہودی بیان میں زمین یا آسمانوں کی واقعی تشکیل کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جب خداوند قدوس نے انسان کو تخلیق کیا اس وقت زمین پر نباتات کا وجود نہیں تھا (اس وقت تک بارش نہیں ہوئی تھی) حالانکہ زمین کے پانی نے اس کی سطح کو ڈھک رکھا تھا۔ متن کے آخری بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے جس وقت آدمی کی تخلیق ہوئی تو خداوند کریم نے اسی وقت ایک باغ لگا دیا۔ چنانچہ زمین پر عالم نباتات کا اسی وقت ظہور رہا جس وقت انسان کا۔ یہ چیز سائنسی طور پر صحیح نہیں ہے۔ انسان کا زمین پر اس وقت تک ظہور نہیں ہوا جب تک کہ اس پر نباتات کو اگے کافی زمانہ نہیں گزر گیا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان دونوں واقعات کے درمیان کتنے کروڑ سال کی مدت حائل ہے۔

یہودی متن پر صرف یہی ایک تنقید ہے جو کی جا سکتی ہے۔ یہ حقیقت کہ وہ انسان کی تخلیق کو دنیا اور انسان کی تشکیل کے اعتبار سے زمان میں اس طرح محدود نہیں کرتا جس طرح مرشدانہ متن کرتا ہے کہ وہ ان کو اسی ایک ہفتہ سے متعلق کر دیتا ہے اس کی وجہ سے موخر الذکر کے خلاف جو شدید اعتراضات وارد ہوتے ہیں اس سے یہ بچ جاتا ہے۔

دنیا کی تخلیق کی تاریخ اور انسان کے زمین پر ظہور کی تاریخ

یہودی تقویم جس میں ان اعداد و شمار کی پیروی کی گئی ہے جو عہد نامہ قدیم میں دیئے گئے ہیں۔ مذکورہ بالا واقعات کی تاریخوں کا نہایت قطعیت کے ساتھ تعین کرتی ہے۔ ۱۹۷۵ء کا دوسرا نصف تخلیق عالم کے ۵۷۳۶ ویں سال کے آغاز سے مطابق ہوتا ہے۔ انسان کی تخلیق کئی دن بعد عمل میں آئی۔ چنانچہ سالوں کا حساب لگایا جائے تو اس کی عمر اعداد کے لحاظ سے اتنی ہی بیٹھتی ہے جتنی یہودی تقویم میں دی گئی ہے۔

غالباً اس حقیقت کے سبب کسی قدر تصحیح کرنا پڑے گی کہ ابتدائے وقت کا حساب قمری سالوں میں لگایا جاتا تھا۔ جب کہ مغرب میں استعمال ہونے والے کیلنڈر کی بنیاد شمسی سالوں پر ہے۔ یہ تصحیح اس وقت کرنا ہوگی جب کوئی شخص مکمل صحت کا خواہشمند ہو لیکن اس کی تعداد میں محض ۳ فیصد کا فرق ہے اس لیے یہ نہایت غیر وقیع ہے۔ اپنے حسابات کو آسان بنانے کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ جو چیز یہاں اہمیت رکھتی ہے وہ ہے مقدار کا درجہ لہٰذا یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے کہ ایک ہزار سال پر ہمارے حسابات سے تیس سال زیادہ ہو جاتے ہیں تخلیق عالم کے سلسلے میں اس عبرانی طریقۂ کار کی پیروی کرتے ہوئے اگر ہم یہ بھی کہہ دیں کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ سے تقریباً سینتیس صدی پیشتر ہوا تھا۔ تب بھی ہم صحت کے قریب تر ہوں گے۔

جدید سائنس ہمیں کیا بتاتی ہے؟ کائنات کی تشکیل کے بارے میں اس سوال

کا جواب دینا مشکل ہوگا۔ جس چیز کے سلسلے میں ہم اعداد و شمار فراہم کر سکتے ہیں وہ زمان کے لحاظ سے سنین کی وہ تعداد ہے جب نظام شمسی بنا۔ ممکن ہے کسی معقول حد تک ہم اس تعداد کے قریب پہنچ جائیں۔ اس وقت اور موجودہ زمانہ کے مابین ساڑھے چار ارب سال کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ لہٰذا ہم اس بُعد کو سمجھ سکتے ہیں جو اس وثوق سے قائم کردہ حقیقت کے، جو آج ہمارے علم میں ہے اور ان اعداد و شمار کے جو قدیم عہدنامہ سے حاصل کیے گئے ہیں، مابین پڑتا ہے اس مضمون پر ہم اسی کتاب کے تیسرے حصہ میں وضاحت سے گفتگو کریں گے۔ یہ حقائق بائبل کا گہری نظر سے جائزہ لینے پر ابھرتے ہیں۔ کتاب پیدائش نہایت قطعیت کے ساتھ اس زمانہ کے متعلق معلومات بہم پہنچاتی ہے جو حضرت آدمؑ سے حضرت ابراہیمؑ تک ممتد ہے جو زمانہ حضرت ابراہیمؑ سے لے کر عیسائیت کے آغاز تک گزرا، اس کے بارے میں معلومات ناکافی ہیں۔ اس کی تائید دیگر ذرائع سے ہونی چاہیے۔

حضرت آدمؑ سے حضرت ابراہیمؑ تک

کتاب پیدائش میں ابواب ۴، ۵، ۱۱، ۲۱، اور ۲۵ میں انساب سے متعلق نہایت قطعی اعداد و شمار فراہم کیے گئے ہیں۔ ان سب کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے اجداد سے ہے جو براہ راست اوپر کی طرف بڑھتے ہوئے حضرت آدمؑ تک چلے گئے ہیں۔ ان سے وقت کی وہ مدت معلوم ہوتی ہے جتنی مدت تک ہر شخص زندہ رہا۔ بیٹے کی پیدائش کے وقت باپ کی عمر کا پتہ چل جاتا ہے اور اس طرح حضرت آدمؑ کی تخلیق کے حوالے سے ہر مورث کی پیدائش اور وفات کی تاریخوں کو آسانی سے جاننا ممکن ہو جاتا ہے۔ نیچے کی جدول سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔

اس جدول میں جو اعداد استعمال کیے گئے ہیں وہ کتاب پیدائش کے مرشدانہ متن سے حاصل شدہ ہیں۔ بائبل کا یہی متن ایسا ہے جو اس نوع کی معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ بائبل کے مطابق یہ استخراج و استنباط کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت آدمؑ کے ۱۹۴۸ سال بعد پیدا ہوئے۔

حضرت ابراہیمؑ کا نسب نامہ

	تخلیق آدمؑ کے بعد تاریخ پیدائش:	عمر:	تخلیق آدمؑ کے بعد تاریخ وفات
۱۔ آدمؑ		۹۳۰	۹۳۰
۲۔ شیثؑ	۱۳۰	۹۱۲	۱۰۴۲
۳۔ انوس	۲۳۵	۹۰۵	۱۱۴۰
۴۔ قینان	۳۲۵	۹۱۰	۱۲۳۵
۵۔ محلل ایل	۳۹۵	۸۹۵	۱۲۹۰
۶۔ یارو	۴۶۰	۹۶۲	۱۴۲۲
۷۔ یونس (حنوک)	۶۲۲	۳۶۵	۹۸۷
۸۔ متوسلح	۶۸۷	۹۶۹	۱۶۵۶
۹۔ لمک	۸۷۴	۷۷۷	۱۶۵۱
۱۰۔ نوحؑ	۱۰۵۶	۹۵۰	۲۰۰۶
۱۱۔ سام	۱۵۵۶	۶۰۰	۲۱۵۶
۱۲۔ ارفکسد	۱۶۵۸	۴۳۸	۲۰۹۶
۱۳۔ سلح	۱۶۹۳	۴۳۳	۲۱۲۲
۱۴۔ عبر	۱۷۲۳	۴۶۴	۲۱۸۷

تخلیق آدمؑ کے بعد تاریخ پیدائش: عمر: تخلیق آدمؑ کے بعد

تاریخ وفات

۱۵۔ فلج	۱۷۵۷	۲۳۹	۱۹۹۶
۱۶۔ رعو	۱۷۸۷	۲۳۹	۲۰۲۶
۱۷۔ سروج	۱۸۱۹	۲۳۰	۲۰۴۹
۱۸۔ نخور	۱۸۴۹	۱۴۸	۱۹۹۷
۱۹۔ تارح	۱۸۷۸	۲۰۵	۲۰۸۳
۲۰۔ ابراہیم	۱۹۴۸	۱۷۵	۲۱۲۳

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عیسائیت کے آغاز تک

بائبل میں اس دور سے متعلق ایسے اعداد و شمار فراہم نہیں کیے گئے جیسے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اجداد سے متعلق کتاب پیدائش میں ملتے ہیں جن سے کوئی واضح تخمینہ قائم کیا جا سکتا۔ لہٰذا ہمیں ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ کے زمانے کے اندازہ لگانے کے لیے بعض دوسرے مآخذ کو کام میں لانا پڑے گا۔ تھوڑی سی غلطی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس وقت حضرت ابراہیمؑ کے دور کا تعین حضرت عیسیٰ سے اٹھارہ صدی قبل کیا جاتا ہے۔ کتاب پیدائش میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت آدم علیہ السلام کے درمیانی وقفہ سے متعلق جو معلومات ملتی ہے اس کو ملا لیا جائے تو حضرت آدمؑ کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے تقریباً اڑتیس صدی پہلے بیٹھتا ہے۔ یہ اندازہ مسلمہ طور پر غلط ہے۔ اس غلطی کا مبداء اصل میں وہ غلطیاں ہیں جو بائبل میں آدمؑ اور ابراہیمؑ کی درمیانی مدت کے سلسلے میں رونما ہوئی ہیں۔ یہودیوں کی تقویم کی بنیاد اب بھی اسی روایت پر قائم ہے آج کل ہم بائبل کی صداقت کی روایتی انداز سے حمایت کرنے والے حضرات کو اس نامطابقت کی وجہ سے چیلنج کر سکتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح کے یہودی مذہبی پیشواؤں کے قیاسات اور جدید شماریات کے درمیان رونما ہو رہی ہے۔ صدیوں تک حضرت عیسیٰ سے متعلق پرانے واقعات کے زمانے کا تعین اس معلومات کے مطابق ہوتا رہا۔ جس کی بنیاد ان تخمینوں اور اندازوں پر تھی۔

جدید دور سے پہلے بائبل کے ایڈیشن قاری کے لیے ایسے تمہیدی بیان سے

مزین کیے جاتے تھے جن میں ان واقعات کی تاریخی ترتیب کی وضاحت ہوتی تھی جو دنیا کی تخلیق اور ان کتابوں کی ترتیب کے زمانے کے درمیان رونما ہو چکے تھے۔ ان اعداد میں زمانہ کے لحاظ سے تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے مثلاً پوپ کلیمنٹ کے تیار کرائے ہوئے بائبل کے لاطینی ترجمہ (۱) (۱۶۲۱ء) سے یہ معلومات بہم پہنچی کہ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ کسی قدر پہلے کا تھا اور تخلیق آدم تقریباً ۴۰ صدی ق م میں ہوئی تھی۔ والٹن کی ہفت لسانی بائبل (۲) جو ۱۷ویں صدی میں منصۂ شہود پر آئی۔ اس میں اور کلیمنٹ ولگیٹ (پوپ کلیمنٹ کا مرتب کیا ہوا بائبل کا لاطینی نسخہ) میں قاری کے لیے اس نوع کی جدولیں مہیا کی گئی ہیں جیسی کہ حضرت آدمؑ کے اجداد کے سلسلہ میں اوپر دی گئی ہے۔ تمام تخمینے تقریباً ان ہی اعداد سے مطابقت رکھتے ہیں جو یہاں دیئے گئے ہیں۔ دور جدید کی آمد پر بائبل کے مرتبین اس قسم کی انوکھی تاریخی جدولیں ان سائنسی انکشافات کے خلاف جائے بغیر قائم نہ رکھ سکے جن کے مطابق تخلیق کا واقعہ کہیں پہلے رونما ہوا تھا۔ انہوں نے ان جدولوں اور تمہیدی بیانوں کو حذف کر دینے پر ہی اکتفاء کی۔ تاہم انہوں نے قاری کو یہ بتانے سے اجتناب برتا کہ بائبل کے وہ متن جن پر ان تاریخی جدولوں کا انحصار ہے، کلیتہً مسترد کی جا چکی ہیں، اور وہ حقیقت کو ظاہر نہیں کرتیں۔ انہوں نے ان پر ایک ہلکا سا پردہ ڈال دیا اور نہایت شاطرانہ قسم کی منطق کے ایسے مقررہ فقرے ایجاد کیے جن سے وہ متن اسی طرح قابل قبول بن جاتا تھا، جس طرح پہلے سمجھا جاتا تھا، اور یہ عمل بغیر کسی قطع و برید کے مکمل ہو جاتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ بائبل کے مرشدانہ متن میں جو نسب نامے شامل ہیں وہ اب بھی

اسی طرح قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں باوجودیکہ بیسویں صدی میں کوئی شخص بھی ایسی من گھڑت باتوں کی بنیاد پر معقولیت کی حدود میں رہتے ہوئے وقت کا شمار نہیں کر سکتا۔

موجودہ سائنسی اعداد سطح ارض پر ظہور آدم کی تاریخ کو متعین کرنے میں ایک خاص حد سے آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ انسان جس میں کام کرنے کی صلاحیت اور فہم و شعور اس کو ان مخلوقات سے ممتاز کرتے ہیں جو اس جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ زمین پر ایک خاص قابل لحاظ تاریخ کے بعد وجود میں آیا۔ تاہم کوئی شخص بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ صحیح تاریخ کون سی تھی، جس کو اس کا ظہور ہوا۔ اس وقت ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی مخلوق کے جو انسانی خیالات اور عمل کی حامل تھی ایسے باقیات دستیاب ہوئے ہیں جن کے زمانہ کا حساب لاکھوں سال میں لگایا جا سکتا ہے۔

قریبی تاریخ کا یہ تصور ماقبل تاریخی انسان کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس میں سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے جس کی دریافت ہوئی ہے وہ کرومیگنن (۳) نسل کا انسان ہے۔ فی الحقیقت دنیا بھر مین اور بھی کئی ایسی باقیات دستیاب ہوئی ہیں جن کا تعلق نوع انسانی سے ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کم ترقی یافتہ انواع تھیں اور ان کا زمانہ کہیں لاکھوں سال پر محیط ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ واقعی نوع بشر کہلائے جا سکتے ہیں؟

جواب کچھ بھی ہو سائنسی اعداد کرومیگنن نسل کے انسان کی طرح کی ماقبل تاریخی انواع کے سلسلہ میں بڑی حد تک صحیح ہیں اور اس دور سے جو کتاب پیدائش

میں پہلے انسان کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ یہ اعداد زمانے کو وسعت دے کر اس کا تعین بہت پہلے کا کرتے ہیں۔ لہذا کرۂ ارض پر ظہور آدم کے سلسلہ میں ہمیں کتاب پیدائش سے جو اعداد و شمار دستیاب ہوتے ہیں اور جدید سائنسی معلومات کے مسلمہ حقائق میں واضح اور بہت نمایاں نا مطابقت ہے۔

طوفان عالمگیر

چھٹے، ساتویں اور آٹھویں ابواب کو طوفان عالمگیر کے تذکرے کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ دو بیانات ہیں لیکن ان کو برابر برابر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ وہ پوری تحریر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ عبارتوں کو آپس میں اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ وہ مختلف حادثات کا ایک مربوط سلسلہ معلوم ہونے لگے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تین ابواب میں نہایت بھونڈے قسم کے تضادات ہیں۔ پھر اس کی وضاحت بھی دو قطعاً مختلف ماخذوں کو سامنے رکھ کر کرنی پڑتی ہے۔ وہ ماخذ ہیں یہودی اور مرشدانہ متن۔

یہ بات پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ وہ (ماخذ) مختلف النوع مواد سے متشکل ہوئے تھے۔ ہر ابتدائی متن پیروں یا فقروں میں بانٹ دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے ایک ماخذ کے اجزا یکے بعد دیگرے دوسرے اجزا کے ساتھ مل گئے ہیں۔ یہاں تک کہ مکمل بیان کے دوران ہمیں انگریزی متن کی مشکل سے سو سطروں میں ایک ماخذ سے دوسرے ماخذ کی جانب سترہ مرتبہ لوٹنا پڑتا ہے۔

مجموعی طور پر کہانی اس طرح چلتی ہے۔

''انسان کی بداعمالی عالمگیر شکل اختیار کر گئی تھی۔ لہٰذا خداوند قدوس نے اس کو مع دیگر ذی روح مخلوقات کے فنا کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے حضرت نوحؑ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع کر دیا اور ان کو ایک ایسی کشتی بنانے کا حکم دیا جس میں وہ اپنی زوجہ، اپنے تین بیٹوں اور ان کی بیویوں مع دیگر ذی روح مخلوقات کے لے جا

سکیں۔موٴخرالذکر کے بارے میں دونوں ماخذوں میں اختلاف ہے۔ایک تحریر (مرشدانہ) کا بیان ہے کہ حضرت نوحؑ کو ہرنوع کا ایک ایک جوڑ الینا تھا۔پھراس عبارت میں جو اس کے بعد آئی ہے (یہودی) یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خداوند کریم نے ان کو حکم دیا تھا کہ نام نہاد خالص جانوروں کے انواع میں سے ہرایک کے سات نر اور سات مادائیں اور غیر خالص اقسام میں سے صرف ایک جوڑا لیا جائے۔لیکن آگے چل کر بیان کیا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے حقیقتاً ہرجانور کا ایک ایک جوڑا لے لیا۔ماہرین خصوصی مثلاً فادر دےووکا بیان ہے کہ عبارت زیربحث یہودی بیان میں ایک نوع کا تصرف ہے۔

ایک عبارت (یہودی) میں طوفان کا سبب بارش کے پانی کو قرار دیا گیا ہے لیکن دوسری عبارت (مرشدانہ) میں طوفان کے دو اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ بارش کا پانی اور پانی جو زمین سے ابلا۔

زمین پر اس قدر پانی ہوگیا کہ نہ صرف پہاڑوں کی چوٹیاں ڈوب گئیں بلکہ ان سے اوپر تک پانی چلا گیا۔حیات کلیتہً فنا ہوگئی۔ایک سال بعد جب پانی اتر گیا حضرت نوحؑ کشتی سے جو کوہ ارارط سے جا لگی تھی باہر آئے۔

کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ جو ماخذ کام میں لایا گیا ہے اس کے مطابق طوفان کے جاری رہنے کی مدت مختلف ہے۔یہودی متن کے مطابق یہ مدت چالیس دن ہے۔اورمرشدانہ متن کے اعتبار سے ڈیڑھ سو دن قرار پائی ہے۔

یہودی متن سے ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ واقعہ حضرت نوحؑ کی زندگی میں کب رونما ہوا۔لیکن مرشدانہ متن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر چھ سو

سال تھی۔ موخر الذکر سے ہی یہ معلومات بھی مہیا ہوتی ہیں جو ان نسب ناموں کے ذیل میں درج ہیں جہاں حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ سے ان کا رشتہ جوڑا گیا ہے۔ اگر ہم ان معلومات سے جو کتاب پیدائش میں درج ہیں حساب لگائیں تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت نوحؑ، حضرت آدمؑ کے ۱۰۵۶ سال بعد پیدا ہوئے (حضرت ابراہیمؑ کا شجرہ نسب ملاحظہ ہو) لہٰذا طوفان تخلیق آدمؑ کے ۱۶۵۶ سال بعد آیا۔ حضرت ابراہیمؑ کے حوالہ سے کتاب پیدائش طوفان کا زمانہ ان نبی کی ولادت سے ۲۹۲ سال پہلے بتاتی ہے۔

کتاب پیدائش کے بموجب طوفان کی زد میں جملہ بنی نوع انسان آئی اور سطح ارض پر خدا کی پیدا کی ہوئی تمام ذی روح مخلوق فنا ہو گئی۔ نسل انسانی کا آغاز پھر حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں اور ان کی بیویوں سے ہوا۔ چنانچہ تقریباً تین صدیوں کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ہوئی تو انہیں ایک ایسی نسل دکھائی دی جو پہلے ہی سے مختلف قوموں میں بٹ ہوئی تھی۔ اس قدر قلیل مدت میں یہ تنظیم کیسے وجود میں آ گئی؟ یہ سادہ سا جائزہ اس واقعہ کو صحت سے کلیتہً معرا ثابت کر دیتا ہے۔

مزید براں تاریخی مواد جدید معلومات سے اس کی نا مطابقت کو ظاہر کر دیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۱۸۰۰ اور ۱۸۵۰ ق م کے درمیان قرار دیا جاتا ہے۔ اب اگر جیسا کہ کتاب پیدائش میں مندرج نسب ناموں کے ذیل میں دیا گیا ہے طوفان حضرت ابراہیمؑ سے تقریباً تین صدی پیشتر ظہور پذیر ہوا تو ہمیں اس کے زمانہ کا تعین ۲۱ سو سے ۲۲ سو ق۔م کے لگ بھگ کہیں کرنا ہو گا۔ جدید تاریخی معلومات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ اس وقت تمدن دنیا کے کئی حصوں

میں پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کی باقیات آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ رہ گئی ہیں۔

مثال کے طور پر مصر کو لے لیجئے جو باقیات سلطنت وسطیٰ (۲۱۰۰ ق م) سے پہلے کے دور سے مطابقت رکھتی ہیں۔ وہ تقریباً گیارہویں خاندان سے قبل کے عہد متوسط کے زمانہ کو ظاہر کرتی ہیں۔ سرزمین بابل (۴) میں یہ زمانہ ار کے تیسرے خاندان کی حکومت کا تھا۔ یہ بات ہم یقین سے جانتے ہیں کہ ان تہذیبوں میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوا۔ لہٰذا ایسی کوئی تباہی رونما نہیں ہو سکتی تھی جو جملہ بنی نوع انسان کو متاثر کرتی جیسا کہ بائبل سے ظاہر ہوتا ہے۔

بنا بریں ہم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ بائبل کے تینوں بیانات انسان کو واقعات کا ایک ایسا خاکہ فراہم کرتے ہیں جو صداقت سے مطابقت رکھتا ہو۔ ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اگر معروضی طریقے پر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جو متون ہم تک پہنچے ہیں وہ حقیقت حال کو ظاہر نہیں کرتے۔ ہم خود سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا ممکنات میں سے ہے کہ خدا صداقت کے علاوہ کوئی اور بات بھی ظاہر کرے؟ اس تصور کو ذہن میں جگہ دینا از بس مشکل ہے کہ خدا نے انسان کو ایسی باتیں سکھائیں جو من گھڑت ہونے کے ساتھ ساتھ متضاد بھی ہوں۔ لہٰذا ہم قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ واقعات میں غلط بیانی کو کام میں لایا گیا ہے۔ جس کی ذمہ داری خود انسان پر ہے۔ یا پھر یہ بات ان روایات سے پیدا ہوئی ہے، جو ایک نسل سے دوسری نسل کو زبانی منتقل ہوتی چلی آئیں۔ یا پھر ان روایات کے ایسے متون سے نقل ہوتی رہیں جو کبھی تحریر کا جامہ پہن چکے تھے۔ جب کسی شخص کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ کتاب پیدائش جیسے صحیفہ میں تین صدیوں سے بھی کم مدت میں کم از کم دو

مرتبہ تبدیلی کی گئی ہے تو ناممکن باتوں کو دیکھ کر یا ایسے بیانات کو پڑھ کر جو حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتے، اسے ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے علم میں جو ترقی ہوئی ہے اس نے ہمیں اس قابل کر دیا ہے کہ اگر ہر بات کو نہیں تو کم از کم بعض واقعات کو ہم کافی حد تک جان گئے ہیں جس سے اپنی معلومات اور ان کے بارے میں قدیم بیانات کے مابین مطابقت کے درجہ کا تعین کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ منطقی بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ بائبل کے تسامحات کی اس تعبیر کو صحیح سمجھیں کیونکہ اس میں صرف انسان خود مہتم گردانا جاتا ہے لیکن یہ انتہائی قابل افسوس بات ہے کہ شارحین ومفسرین کی اکثریت جن میں یہودی اور عیسائی دونوں شامل ہیں اس نقطہ نظر کو اختیار نہیں کرتے۔ اس کے باوجود جو دلائل وہ کام میں لاتے ہیں ان پر پوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

حواشی

۱۔ کلیمنٹ کے لقب سے چودہ پوپ ہوئے ہیں۔ کلیمنٹ ہشتم جن کا اصل نام آلدوبرادینی تھا ۱۵۳۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۰۵ء میں انہوں نے وفات پائی۔ ان کا دور پاپائیت ۱۵۹۲ء تا ۱۶۰۵ء ہے۔ وہ نہایت مقدس اور عالم وفاضل انسان تھے۔ ان کے حکم سے ۱۵۹۲ء میں بائبل کے لاطینی ترجمہ پر نظر ثانی کی گئی اور اسی سال یہ نظر ثانی شدہ نسخہ شائع ہوا۔ رومن کیتھولک چرچ کے لیے یہ نسخہ تقریباً ۳۰۰ سال تک مستند سمجھا جاتا رہا۔ مصنف کتاب ہذا کے پیش نظر اسی ترجمہ کا وہ ایڈیشن تھا جو ۱۶۲۱ء میں شائع ہوا تھا یہاں اسی کی جانب اشارہ ہے۔ (مترجم)

۲۔ بریان والٹن (۱۶۶۱ء) انگلستان کے بائبل کے ایک بڑے عالم تھے۔ انہوں نے دوسرے فضلاء کی مدد سے (۱۶۵۴ء تا ۱۶۵۷ء) سات مشرقی زبانوں میں بائبل کا ایک نسخہ مرتب کرا کر شائع کیا جو ۶ مجلدات پر مشتمل تھا۔ والٹن صاحب ۱۶۶۰ء میں چسٹر کے بشپ رہے۔ (مترجم)

۳۔ کرومیگنن، فرانس میں ایک گپھا (کھوہ) ہے۔ وہاں ۱۸۶۸ء میں ماقبل تاریخی انسان کی نسل کا ایک ڈھانچہ ملا تھا اسی کی نسبت سے اس دور کے انسان کو کرومیگنن نسل کا انسان کہا جانے لگا۔

ان انسانوں کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ آج کل کے انسان کے مقابلہ میں قد آور تھے۔ نیز ان میں کافی فنی مہارت تھی۔ (مترجم)

۴۔ اس علاقہ کے لیے زیادہ موزوں نام سمیریہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس وقت تک بابل کی حیثیت بھی ایک شہری حکومت کی سی تھی اور اس نے ایسی وسعت حاصل نہیں کی تھی کہ یہ سارا علاقہ سرزمین بابل کہلایا جائے۔ (مترجم)

باب ۴

بائبل کے متون میں سائنسی اغلاط کے سلسلہ میں

عیسائی مصنفین کا نظریہ

ایک تنقیدی جائزہ

ان جمع شدہ تسامحات، ناممکنات اور تجاوادت کے وجود کے سلسلہ میں عیسائی مفسرین کا ردعمل جس رنگا رنگی اور بوقلمونی کا مظہر ہے وہ خود نہایت حیران کن ہے۔ بعض مفسرین تو ان میں سے کچھ کو تسلیم کرتے ہیں اور ان پیچیدہ مسائل کو اپنی تحریروں میں سلجھانے کے لیے ہچکچاتے نہیں لیکن بعض وہ حضرات ہیں جو غیر تسلیم شدہ بیانات سے تو سرسری طور پر گزر جاتے ہیں اور متن کے لفظ لفظ کا دفاع کرنے میں کافی شدت برتتے ہیں۔ موخر الذکر جماعت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ معذرتی انداز اختیار کر کے لوگوں کو مطمئن کر دے۔ ان کے بیانات میں ایسے دلائل کی بھر مار ہوتی ہے جو اکثر غیر متوقع ہوتے ہیں۔ یہ اس امید میں پیش کیے جاتے ہیں کہ جو بات منطقی اعتبار سے ناقبل قبول ہوگی وہ جلدی ہی ذہن سے فراموش ہو جائے گی۔

فادر دے وو کتاب پیدائش کے ابتدائیہ میں تنقیدی دلائل کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کی معقولیت کی صراحت بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے نزدیک ماضی کے واقعات کی معروضی طریقہ پر ترتیب تو ضروری نہیں ہے جیسا کہ وہ حواشی میں تحریر کرتے ہیں۔ یہ واقعہ کہ بائبل ''دجلہ اور فرات کی ایک دو تباہ کن سیلابوں کے تذکرہ کو دہراتی ہے اور روایت اس کو ترقی دے کر ایک عالمگیر تباہی کی شکل دے دیتی ہے۔'' غیر اہم ہے۔ البتہ ضروری بات جو دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ لائق احترام مصنف نے اس یادگار میں انسان کے گناہ کے لیے خداوند قدوس کے عدل اور رحم اور دین داروں کے لیے نجات کی ابدی تعلیم کو سمو دیا ہے۔

اس طریقہ سے ایک عوامی کہانی کو ایک دینی اور ربانی واقعہ کی شکل اختیار کرنے کے لیے جواز پیدا ہو جاتا ہے اور اس حیثیت سے روایت کو انسان کا عقیدہ بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ جس کے لیے اس اصول کو کام میں لایا جاتا ہے کہ فلاں مصنف نے اس واقعہ کو مذہبی تعلیمات کے لیے بیان کیا ہے۔ اس نوع کا معذرتی نقطۂ نظر اس آزادی کے لیے جواز پیدا کر دیتا ہے جو ان تحریروں میں اختیار کی گئی ہے جن کو مقدس اور خدا کا کلام سمجھا جاتا ہے۔ اگر الہامی اور ربانی باتوں میں انسان کی اس طرح کی مداخلت کو جائز سمجھ لیا جائے تو بائبل کے متون میں انسانی تحریفات و تصرفات کے لیے توجیہات کر لی جائیں گی۔ اگر اس سے کچھ دینی مقاصد حاصل کرنا ہیں تب تو تمام تحریفات جائز ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ''مرشدانہ'' متن کے چھٹی صدی کے مصنفین کے تمام تصرفات کے لیے جواز نکل آتا ہے جن میں وہ ضابطہ پرست حسن ظن بھی شامل ہو جاتے ہیں جو ان فرضی بیانات کی شکل

اختیار کر لیتے ہیں جو ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔

عیسائی شارحین و مفسرین کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جس نے بائبل کے بیانات میں رونما ہونے والی غلطیوں، ناممکن باتوں اور تضادات کی صراحت کرنے کے لیے یہ عذر پیش کرنا بہتر سمجھا کہ بائبل کے مصنفین نے ایک مختلف تہذیب یا ذہنیت کے معاشرتی عوامل کے مطابق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسی سے انفرادی ''ادبی انداز'' کی تعریف وجود میں آئی جو شارحین و مفسرین کے دقیق مابعد الطبیعیاتی مسائل میں اختیار کیا گیا، جس کی وجہ سے تمام مشکلات پیدا ہوئیں۔ جہاں دونوں متنوں میں کچھ تضادات دکھائی دیتے ہیں، یہ صراحت کر دی گئی کہ ہر مصنف نے اپنے مخصوص ادبی انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس لیے یہ فرق رونما ہو گیا۔ حقیقت میں یہ دلیل ایسی ہے جس کو ہر کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں کوئی وزن نہیں ہے۔ لیکن یہ طریقہ آج بھی کلیتہً متروک نہیں ہوا۔ چنانچہ ہم دیکھیں گے کہ عہد نامہ جدید میں اناجیل کے شدید اختلافات کی توضیح و تشریح میں اس کو نہایت فراخدلی سے برتا گیا ہے۔

جب کسی متنازع فیہ عبارت کے متعلق کوئی ایسی بات کہی ہو جو منطقی اعتبار سے مسترد ہو جائے تو اس کو قابل قبول بنانے کے لیے دوسرا طریقہ یہ کام میں لایا جاتا ہے کہ زیر غور عبارت کو معذرتی غور و خوض میں الجھا دیا جاتا ہے۔ قاری کی توجہ کو عبارت کی صداقت کے فیصلہ کن مسئلہ سے ہٹا کر دوسرے مسائل کی جانب موڑ دیا جاتا ہے۔

کاردینال وینیلو کے طوفان عالمگیر پر تاثرات میں یہی طرز اظہار اختیار کیا گیا

ہے۔ یہ تاثرات ''زندہ خدا'' (خدائے حی و قیوم) کے ریویو میں ''طوفان، عالمگیر، بپتسما، حشر'' کے عنوان کے تحت ظاہر ہوئے ہیں وہاں وہ رقمطراز ہیں۔ ''کلیسا کی قدیم ترین روایت سے طوفان کے دینی تصور میں حضرت عیسیٰ اور کلیسا کی شبیہ دکھائی دیتی ہے۔'' ''یہ ایک بڑی اہمیت کا واقعہ ہے'' ...... ''ایک ایسا فیصلہ جس سے تمام نسل انسانی متاثر ہوئی۔'' اپنے ''حزقیل کے خطبات'' میں نقل کر کے وہ بیان کرتے ہیں۔ ''پوری دنیا کے تباہ شدہ جہاز نے کشتی نوح میں امان پائی کاردینال وینیلو آٹھ کے عدد کی اہمیت پر زور دیتے ہیں ''جس سے ان افراد کی تعداد بتاتے ہیں جو کشتی نوحؑ میں محفوظ رہے یعنی حضرت نوحؑ، آپ کی اہلیہ، تین فرزند اور ان کی بیویاں) وہ اپنے مکالمہ میں جسٹن کی تحریروں کو کام میں لاتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ ''وہ اس آٹھویں دن کی علامت کو ظاہر کرتے ہیں جب حضرت عیسیٰ مردوں کے درمیان سے اٹھائے گئے۔'' اور ''حضرت نوحؑ ایک نئی مخلوق کے اولین مولد، حضرت عیسیٰ کا ایک عکس ہیں۔ چنانچہ جس کام کو حضرت نوحؑ نے بطور تمثیل پیش کیا تھا وہ حضرت عیسیٰ کو بعد میں انجام دینا پڑا۔'' وہ ایک طرف حضرت نوحؑ کے جو لکڑی کی بنی ہوئی کشتی اور اس پانی سے جو اس کے تیرنے کا موجب بنا محفوظ رہے۔ (''طوفان کا پانی جس سے ایک نئی نسل انسانی وجود میں آئی) اور دوسری طرف لکڑی کی بنی ہوئی صلیب کے درمیان موازنہ کو جاری رکھتے ہیں۔ وہ اس علامتی انداز کی قدر و قیمت پر زور دیتے ہیں اور طوفان کے باطنی پہلو کی روحانی اور اعتقادی اہمیت کو بنیاد قرار دے کر بحث کو ختم کر دیتے ہیں۔''

اس قسم کے معذرتی تقابل کے بارے میں کہنے کے لیے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمیں ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ایک ایسے واقعے سے متعلق توضیح وتشریح ہے جس کی حقیقت و اصلیت کا دفاع ممکن نہیں، نہ تو عالمگیر پیانے پر اور نہ اس زمانے کے اعتبار سے جب بائبل کے بیان کے مطابق وہ رونما ہوا۔ اگر ہم کاردنیال ویخیلو کی اس تشریح کو سامنے رکھیں تو ہم قرون وسطیٰ میں جا پڑتے ہیں جہاں متن کو اسی طرح تسلیم کر لیا جاتا تھا اور کلیسا سے باہر کسی بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس کے باوجود یہ بات اطمینان بخش ہے کہ کلیسا کے اس غلبہ اور تسلط کے دور سے قبل نہایت شدید منطقی طرز فکر عمل اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں سینٹ آگسٹائین کے طرز عمل کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو نتیجہ تھا ان کے اس طرز فکر کا جو اس دور سے کہیں آگے تھا جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے۔

ابتدائی پانچ صدیوں کے عیسائی مصنفین کے زمانے میں متن پر تنقید کے مسائل کھڑے ہوئے۔ کیونکہ سینٹ آگسٹائین نے ان کو اپنے خط نمبر ۸۲ میں اٹھایا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل عبارت سب سے زیادہ مثالی ہے:

''صرف ان صحیفوں کے بارے میں جن کو مستند کہا گیا ہے، مجھے یہ عقیدہ رکھنے کی تعلیم دی گئی کہ ان کے مصنفین نے ان کو لکھتے وقت کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا۔ جب میں ان کتابوں میں بھی ایک ایسے بیان سے دو چار ہوتا ہوں جو حقیقت کی تردید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا کہ یا تو میری کتاب کے نسخہ یا متن ناقص ہے یا مترجم نے اصل کی پوری پیروی

نہیں کی ہے اوریا میری فہم کا قصور ہے۔''

سینٹ آگسٹائین کے لیے یہ بات ناقابل تصور بھی ہے کہ کسی مقدس تحریر میں کوئی غلطی ہو۔ سینٹ آگسٹائین نے نہایت صفائی سے خطا سے مبرا ہونے کا یہ عقیدہ اس وقت پیش کیا۔ جب ان کے سامنے ایک ایسی عبارت آئی جو صداقت کی تردید کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ انہوں نے اس کا سبب معلوم کرنے کی طرف توجہ کی لیکن اس میں سے خطائے بشری کے نظریہ کو خارج کر دیا۔ تنقیدی نظر رکھتے ہوئے بھی ایک عقیدت مند کا یہ طرز عمل ہوتا ہے۔ سینٹ آگسٹائین کے زمانہ میں بائبل کے متن اور سائنس کے درمیان مقابلہ کا کوئی امکان نہیں تھا۔ آج کل کا ان جیسا کشادہ دل انسان بائبل کے بعض متون کی سائنسی معلومات کے مقابلہ میں پیدا ہونے والی بہت سی مشکلات کو حذف کر دیتا ہے۔

اس کے برعکس آج کل کے ماہرین خصوصی، بائبل کے متن کو کسی غلطی کے الزام سے بچانے کے لیے بڑی مشقت برداشت کرتے ہیں۔ چنانچہ فادر دے وو اپنے مقالہ ''کتاب پیدائش کے افتتاحیہ'' میں ان اسباب کی صراحت کرتے ہیں جو انہیں متن کے دفاع پر مجبور کرتے ہیں خواہ وہ تاریخی یا سائنسی اعتبار سے قطعی طور پر ناقابل قبول ہو۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ بائبل کی تاریخ کو یوں نہ دیکھئے۔ ''جس طرح کہ مطالعہ تاریخ کے اصولوں کو آج کل کے لوگ برتتے ہیں۔'' گویا تاریخ نویسی کے بہت سے مختلف طریقوں کا امکان بھی ہوسکتا ہے۔ تاریخ (جیسا کہ ہر شخص تسلیم کرے گا) جب غلط طریقہ پر بیان کی جاتی ہے تو وہ ایک تاریخی ناول کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن یہاں ان معیاروں کو کام میں نہیں لایا جاتا

جو ہمارے تصورات کے مطابق قائم کیے گئے ہیں۔ بائبل کے شارحین بائبل کے بیانات کی کسی تصدیق کو مسترد کر دیتے ہیں جو علم الارض، علم رکازیا ماقبل تاریخ کے فراہم کردہ مواد کی بنیاد پر پیش کی جاتی ہے۔ ''بائبل ان بیانات میں سے کسی کے لیے جواب دہ نہیں ہے اور اگر کوئی شخص اس کو اس مواد کے مقابلہ میں لائے یا ایک مصنوعی قسم کی مناسبت کی طرف راہنمائی کرے گا۔ (۱) یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاثرات کتاب پیدائش میں ایسی بنیاد پر قائم کیے جاتے ہیں جو جدید سائنسی مواد کے ساتھ کسی طرح بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس معاملہ میں پہلے گیارہ ابواب ہیں لیکن جب دور جدید میں چند بیانات کی مکمل طور پر تصدیق کی جائے، مثال کے طور پر نبیوں کے دور کے بعض واقعات تو مصنف موجودہ معلومات کے معاملہ میں بائبل کی صداقت کی حمایت کرنے سے نہیں چوکے گا۔'' ان بیانات پر جو شبہ وارد ہو اس کو اس موافق شہادت سے دور کر دینا چاہیے۔ جو تاریخ اور مشرقی اثریات فراہم کرتی ہیں۔'' (۲) بالفاظ دیگر اگر سائنس، بائبل کے بیان کی توثیق کرنے میں مفید ثابت ہوتی ہے تو اس کی شہادت کو مان لیا جائے لیکن اگر یہ مؤخر الذکر کو باطل قرار دیتی ہے تو پھر اس حوالے کی ضرورت اور اجازت نہیں ہے۔

متبائن امور کے درمیان توافق پیدا کرنا، یعنی بعض غلط قسم کے واقعات جو عہد نامہ قدیم کے بیانات میں پیش کیے گئے ہیں ان کے ساتھ بائبل کی صداقت کے نظریہ کو ہم آہنگ کرنے کے لیے دور جدید کے ماہرین دینیات نے صداقت کے کلاسیکی تصورات کو بدلنے پر اپنی کوششوں کو لگا دیا ہے۔ یہ بات اس کتاب کی حدود سے باہر ہے کہ ان ۔۔۔۔ خیالات کی حقیقت کو تفصیل سے بیان کیا جائے جو ایسی کتابوں

میں پوری تفصیل اور وضاحت سے بیان کردی گئی ہے جن میں بائبل کی صداقت ہی سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً اولوریز کی کتاب (۱۹۷۲ء) بائبل کی صداقت کیا ہے؟ (کیل اے لاویر یتے دلا بائبل) (۳) سائنس سے متعلق یہ فیصلہ کافی وشافی ہوگا۔

مصنف کا کہنا ہے کہ دوسری ویٹی کن کونسل نے ''بائبل کے تسامح اور صداقت کے درمیان امتیاز کرنے کے لیے اصول وقواعد وضع کرنے سے احتراز کیا ہے۔ بنیادی غور وتامل سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ امر ناممکن ہے کیونکہ کلیسا صداقت یا سائنسی طریقوں کا اس طور پر تعین نہیں کرسکتا کہ وہ اصولی طور پر یا ایک عمومی سطح پر صحیفوں کی صداقت کے سوال کو طے کردے۔''

یہ بات واضح ہے کہ کلیسا اس حالت میں نہیں ہے کہ وہ سائنسی طریقہ کی قدرو قیمت کا اعلان حصول علم کے ذریعہ کی حیثیت سے کرے۔ یہاں مسئلہ قطعاً مختلف ہے۔ یہ نظریات کا سوال نہیں ہے بلکہ مسلمہ طور پر ثابت شدہ حقائق کا ہے۔ ہمارے زمانہ اور عہد میں یہ جاننے کے لیے متبحر عالم ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ دنیا کی تخلیق ۳۷ یا ۳۸ صدی قبل ہوئی تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسان کا ظہور اس وقت نہیں ہوا تھا اور بائبل کے نسب نامے جن پر اس اندازے اور تخمینہ کا انحصار ہے بغیر کسی شک وشبہ کے غلط ثابت ہوگئے ہیں۔ جس مصنف کا یہاں حوالہ کیا گیا ہے وہ اس سے باخبر ہے۔ سائنس پر اس کے بیانات صرف مسئلہ کو بتاتے وقت ضمناً آگئے ہیں۔ اس لیے وہ اس سے اس طور پر بحث نہیں کرتا جس طرح کہ اس کو کرنا چاہیے۔

ان مختلف قسم کے طرز عمل کی طرف توجہ مبذول کرانے کا کام جو عیسائی

مصنفین اس وقت کرتے رہے جب انہیں بائبل کے متون میں تمام سائنسی اغلاط سے سابقہ پڑا، اس بے چینی و بے اطمینانی کی ایک اچھی مثال ہے جو ان میں پیدا ہوئی ہے ان کو انسانی اختراع سمجھنے کے سوا کوئی منطقی استدلال قائم کرنا ناممکن ہے اور یہ بات بھی محال ہے کہ ان کو الہام کا کوئی جز مانا جائے۔

وہ بے اطمینانی جو عیسائی حلقوں میں وحی کے بارے میں پائی جاتی ہے دوسری ویٹی کن کونسل کے موقع پر (۱۹۶۲ء۔۱۹۶۵ء) واضح ہوگئی تھی جہاں اس کے کم از کم پانچ مسودے پیش ہوئے، پیشتر اس کے کہ تین سال کی بحث و تمحیص کے بعد آخری متن پر اتفاق ہوا۔ یہ بھی اس وقت ہوا کہ ''یہ تکلیف دہ کیفیت جو کونسل میں ایک رخنہ پیدا کرنے کا خطرہ بن رہی تھی۔'' اختتام کو پہنچی۔ یہ وہ عبارت ہے جو ڈیوک دیبر نے الہام کے موضوع پر کلیسائی دستاویز نمبر ۴ کے ابتدائیہ میں استعمال کی تھی۔ (۴)

عہد نامہ قدیم سے متعلق اس دستاویز کے دو جملے (باب چہارم، صفحہ ۵۳) بعض متون کے ادھورے پن اور ان کے متروک ہونے کو اس طریقے سے بیان کرتے ہیں کہ ان پر ردوقدح نہیں کی جاسکتی۔

''حضرت عیسیٰ کے نجات پانے سے قبل نوع انسان کی جو کیفیت تھی اس کے پیش نظر عہد نامہ قدیم کے صحیفوں سے ہر شخص کو یہ جاننے میں مدد ملتی ہے کہ خدا کون ہے اور انسان کون ہے اور ان سے وہ طریقہ بھی معلوم ہو جاتا ہے جس طریقہ سے خداوند کریم اپنے عدل اور رحمت سے انسانوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ یہ صحیفے باوجودیکہ ان میں ناقص اور متروک مواد شامل ہے، پھر بھی وہ حقیقی طور پر ربانی

تعلیمات کی شہادت پیش کرتے ہیں۔''

جس بیان میں متون کے بعض حصوں کے لیے ناقص اور متروک کی صفتیں استعمال کی گئی ہیں اس سے بہتر بیان اس بات کے بتانے کے لیے کوئی نہیں ہوسکتا کہ موخرالذکر پر تنقید کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور یہ کہ ان حصوں کو ترک بھی کیا جاسکتا ہے۔ گویا اس اصول کو صاف طور پر مان لیا گیا ہے۔

یہ عبارت ایک عام اعلان کا جز ہے جو چھ کے مقابلہ میں ۲۳۴۴ ووٹوں سے فیصلہ کن طور پر نافذ کر دیا گیا تھا۔ پھر بھی اس کے تقریباً مکمل طور پر اتفاق رائے ہونے پر سوال کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سرکاری دستاویز کی جس پر ڈیوک ویبر نے دستخط کیے تھے تشریحات میں خصوصیت سے ایک فقرہ ایسا ہے جو بعض متون کے متروک ہونے سے متعلق کونسل کے باضابطہ تصدیق نامہ کی صاف صاف لفظوں میں تصحیح کرتا ہے: ''یہودی بائبل کے بعض صحیفے ایسے ہیں جو عارضی نوعیت کے ہیں اور ان میں کچھ ناقص حصہ ہے۔''

''متروک'' کا لفظ جو سرکاری اعلان میں استعمال ہوا ہے مشکل سے شارح کے استعمال کیے ہوئے فقرے ''عارضی نوعیت'' کی مترادف ہوسکتا ہے جہاں تک یہودی کی صفت کا تعلق ہے جو موخرالذکر نے حیرت خیز طریقے سے ایزاد کی ہے، اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ''کلیسائی دستاویز'' نے صرف عبرانی متن پر تنقید کی ہے۔ معاملہ صرف اس حد تک نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کونسل میں تنہا عیسائی عہد نامہ قدیم تھا، جس پر فیصلہ ہوا اور جس کے بعض حصوں کو ناقص اور متروک قرار دیا گیا۔

حواشی

۱۔ کتاب پیدائش کا ابتدائیہ صفحہ ۳۵

۲۔ ایضاً صفحہ ۳۴

۳۔ مطبوعہ سینتو ریوں۔(پیرس)

۴۔ مطبوعہ سینتو ریوں۔(پیرس)

باب ۵

اختتامیہ

بائبل کے صحیفوں کا جائزہ اس طرح لینا چاہیے کہ مصنوعی طور پر ان کو ایسی خوبیوں سے جو کسی کے خیال وگمان کے مطابق ان میں ہونی چاہیے تھیں ،متصف نہ کیا جائے ۔ان کو معروضی طور پر اسی رنگ میں دیکھنا چاہیے جیسے وہ ہیں ۔اس بات کا اطلاق محض ان کے متون کی واقفیت پر ہی نہیں ہوتا ۔موخر الذکر سے ان حالات کے بارے میں بھی رائے قائم کرنا ممکن ہوگا جن کی بدولت کئی صدیوں تک متن میں ردوبدل ہوتی رہی اور بے شمار حک واضافہ جات کے ساتھ اس وقت جو مجموعہ ہمارے پاس موجود ہے ،بتدریج اس کی تشکیل ہوئی ۔

متذکرہ بالا بیان سے یہ یقین کرنا عین ممکن ہے کہ عہدنامہ قدیم میں ایک ہی بیان کے مختلف طریق ہیں ۔نیز ان میں تضادات ،تاریخی تسامحات ،ناممکن باتیں اور مسلمہ سائنسی معلومات کے خلاف بیانات شامل ہوسکتے ہیں ۔جن کاموں کو اس قدر طویل مدت تک انسانوں نے انجام دیا ہو ان میں اس قسم کی باتوں کا صدور بالکل قدرتی امر ہے ۔جن حالات میں بائبل کا متن ترتیب دیا گیا ہے ان حالات میں جو کتابیں بھی لکھی جائیں ان میں لازماً یہی باتیں ہوں گی ۔

کسی ایسے زمانہ میں کہ ہنوز سائنسی نوعیت کے سوالات کرنا ممکن نہ تھا اور

ناممکن باتوں یا تضادات کو دیکھ کر ہی کوئی فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ ایک صحیح الحس انسان جیسے سینٹ آگسٹائین نے اس بات پر غور کیا کہ خداوند کریم انسان کو ایسی باتیں کیسے سکھا سکتا ہے جو حقیقت و اصلیت سے مطابقت نہ رکھتی ہوں۔ اسی بناء پر انہوں نے یہ اصول پیش کیا کہ جو بیان صداقت کے خلاف ہو اس کا ربانی اور الہامی ہونا ممکن نہیں اور اسی وجہ سے جو چیز بھی خارج کر دیئے جانے کے قابل محسوس ہوئی اس کو وہ تمام مقدس صحیفوں سے نکال دینے پر آمادہ تھے۔

بعد میں ایک زمانہ ایسا آیا کہ بائبل کے بعض بیانات کی جدید معلومات سے غیر ہم آہنگی کو لوگوں نے محسوس تو کر لیا لیکن انہوں نے اس طرز عمل کو اختیار نہیں کیا۔ پھر اس اصول کو نہ ماننے پر اس درجہ اصرار ہے کہ صرف اس غرض سے نہایت وسیع لٹریچر تخلیق کیا جا رہا ہے کہ تمام مخالفت کے علی الرغم اس بات کو حق بجانب ثابت کیا جائے کہ جن عبارتوں کے بائبل میں قائم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے وہ صحیح بتا کر قائم رکھی گئی ہیں۔

دوسری ویٹی کن کونسل (۱۹۶۲ء۔۱۹۶۵ء) نے ''عہد نامہ قدیم کی ان کتابوں'' کے متعلق جن میں ناقص اور متروک قسم کا مواد شامل ہے ''حق مخصوص'' کا اصول وضع کر کے عدم مفاہمت کو بہت کم کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ محض ایک نیک تمنا ہو کر رہ جائے گی یا اس پر بائبل کی کتابوں میں شامل اس مواد میں تبدیلی کی طرف قدم بڑھایا جائے گا جو اس بیسویں صدی میں قابل قبول نہیں ہے۔ حقیقی طور پر سوائے ان تحریفات کے جو انسانوں نے کی ہیں موخر الذکر (بائبل کے صحیفوں) کا مقصد اس تعلیم و ہدایت کو پیش کرنا جو منزل من اللہ ہے۔

باب اول

اناجیل (اول)

ابتدائیہ

اناجیل کے بہت سے قاری جب بعض بیانات کے معنی و مفہوم پر غور و تامل سے کام لیتے ہیں تو وہ نہ صرف پریشان و ششدر رہ جاتے ہیں بلکہ منفعل و خجل بھی ہوتے ہیں۔ یہی بات اس وقت بھی صادق آتی ہے۔ جب وہ مختلف اناجیل میں ایک ہی واقعہ کا مختلف روایتوں کے درمیان مقابلہ کرتے ہیں۔ فادر روگے نے بھی اپنی کتاب ''اناجیل کا تعارف'' (انی سیاسیوں الیوانژیل) میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ (۱) جب انہیں ''کیتھولک مذہب کے ایک ہفت روزہ'' پرچہ میں کئی سال تک پریشان خیال قارئین کے سوالوں کے جوابات دینے پڑے تو انہیں اس بات کا وسیع تجربہ اور صحیح اندازہ کرنے کا موقع ملا کہ جو کچھ ان قارئین نے پڑھا ہے اس سے وہ کس درجہ پریشان ہیں۔ ان سے سوالات کرنے والوں کا تعلق نہایت وسیع معاشرتی اور تہذیبی حلقوں سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ توضیح و تشریح کے لیے ان کی درخواستوں کا تعلق ایسی عبارتوں سے ہے جو دقیق اور ناقابل فہم خیال کی جاتی ہیں ان سے نہیں جو متضاد، نامعقول یا اہانت آمیز ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر

اناجیل کا مکمل طور پر مطالعہ کیا جائے تو وہ عیسائیوں کو بدرجۂ غایت انتشار میں مبتلا کر دے۔

یہ رائے حال ہی کی ہے۔ فادر روگے کی کتاب ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ کچھ بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب عیسائیوں کی بڑی تعداد ایسی تھی جو کو اناجیل کے محض منتخب حصوں سے واقفیت تھی اور یہ حصے بھی وہ ہوتے تھے جو مواعظ کے دوران پڑھے جاتے تھے یا ان پر تنقید کی جاتی تھی۔ پروٹسٹینٹوں کے ماسوا، اناجیل کا پورے طور پر مطالعہ کرنے کا رواج عیسائیوں میں نہیں تھا۔ دینی تعلیمات سے متعلق کتابوں میں صرف اقتباسات ہوتے تھے۔ مفصل طور پر متن بمشکل ہی عوام تک پہنچتا تھا۔ ایک رومن کیتھولک اسکول میں میں نے ورجل اور افلاطون کی تصانیف کے نسخے تو دیکھے تھے لیکن عہد نامہ جدید مجھے وہاں نہیں ملا۔ اس کے باوجود یونانی متن بے حد مفید ہوتا ہے۔ یہ بات مجھے بہت بعد محسوس ہوئی کہ ہمارے لیے عیسائیت کی مقدس تحریروں کے تراجم کیوں نہیں کیے گئے۔ اس سے یہ ہوتا کہ ان ترجموں کو پڑھ کر ہم اپنے معلموں سے ایسے سوالات کر بیٹھتے جن کے جواب دینے سے وہ قاصر رہتے۔

اگر کسی نے اناجیل کے مطالعہ کے دوران اس پر تنقیدی نظر ڈالی ہے تو اس کے نتیجہ میں جو تحقیقات کی جائیں ان کے لیے کلیسا قارئین کی اس طرح مدد کرتا ہے کہ وہ ان کی حیرت پر غلبہ پا جائے۔ فادر روگے کا بیان ہے کہ ''بہت سے عیسائی ایسے ہیں جو کو اناجیل کے مطالعہ کا طریقہ سیکھنے کی ضرورت ہے۔'' وہ جو تشریحات کرتے ہیں ان سے خواہ کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو تاہم اس سے مصنف کو یہ فائدہ

ضرور مل جاتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر ان نازک مسائل کو حل کر لیتا ہے۔ عیسائی مذہب سے متعلق وحی پر جو تحریریں ہیں، ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کے ساتھ ہمیشہ معاملہ نہیں ہوتا۔

بائبل کے جو ایڈیشن کثیر اشاعت کے لیے نکالے جاتے ہیں ان میں تمہیدی نوٹ اکثر ایسے خیالات کا مجموعہ ہوتے ہیں جن سے قاری کو یہ تاثر ملتا ہے کہ اناجیل مختلف کتابوں کے مصنفین کی شخصیتوں کے بارے میں متون کے مصدقہ ہونے کے سلسلہ میں یا بیان کی صحت وصداقت کے متعلق مشکل ہی سے کوئی مسئلہ اٹھاتی ہیں۔ اس حقیقت کے باوصف کہ مصنفین کے بارے میں جن کی شخصیت کا ہمیں قطعاً کوئی یقینی علم نہیں ہے اور جن میں بہت سے نامعلوم ہیں پھر بھی اس قسم کے تمہیدی نوٹوں میں بہت سی صحیح معلومات مل جاتی ہیں۔ اکثر وہ ایسی بات کو جو خالص مفروضہ ہوتی ہے یقین کا درجہ دے کر پیش کرتے ہیں۔ یا ان کا بیان ہوتا ہے کہ فلانے مبلغ انجیل ان واقعات کے چشم دید گواہ ہیں جب کہ خصوصی تحریریں اس کا الٹ پیش کرتی ہیں جو مدت حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے اختتام اور متن کے منصۂ شہود پر آنے کے مابین پڑتی ہے، اس کو نہایت مبالغہ خیز طریقہ پر مختصر کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ یقین دلاتے ہیں کہ ان کو ایک ایسے شخص نے تحریر کیا تھا جس کو وہ روایت زبانی ملی تھی، جب کہ حقیقت میں ماہرین خصوصی نے متون میں تحریفات و تصرفات کی نشاندہی کی ہے، بیشک کہیں کہیں توضیح وتشریح کی بعض مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں ایسے واضح تضادات ہوتے ہیں جن کو کوئی بھی ایسا شخص محسوس کر لیتا ہے، جو ذرا غور وفکر سے کام لیتا ہے، وہاں بھی وہ نہایت قطعیت سے

گفتگو کرتے ہیں۔ان مختصر فرہنگوں میں جو ایک اطمینان بخش دیباچہ کے تکمیلی ضمیمہ جات میں ملتی ہیں یہ بات دکھائی دے جاتی ہے کہ ناممکنات، تضادات یا نہایت واضح اغلاط کو کس خوبصورتی سے چھپایا گیا ہے یا ایک معذرت خواہانہ قسم کے دلائل میں ہوشیاری سے چھپا دیا گیا ہے۔ان الجھن میں ڈالنے والے امور سے ایسی تفاسیر کی گمراہ کن نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

آئندہ صفحات میں جو خیالات پیش کیے جا رہے ہیں وہ بے شبہ ان قارئین کو جو ہنوز ان مسائل سے ناواقف ہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیں گے۔لیکن تفصیل میں جانے سے پیشتر میں اپنے خیالات کی قریب الفہم تشریح ایک ایسی مثال سے پیش کرتا ہوں جو مجھے قطعاً تصفیہ کن معلوم ہوتی ہے۔

نہ متی نے اور نہ یوحنا نے حضرت عیسیٰ کے اٹھائے جانے کا ذکر کیا ہے۔لوقا نے اپنی انجیل میں اس کا تعین روز محشر کے لیے کیا ہے اور ''رسولوں کے اعمال'' میں جس کا انہیں مصنف کہا جاتا ہے اس کو چالیس دن بعد کا وقوعہ قرار دیا ہے۔ مرقس (تاریخ کا تعین کیے بغیر) ایک ایسے اختتامیہ میں اس کا تذکرہ کرتا ہے جو آج غیر مستند سمجھا جاتا ہے۔لہذا رفع مسیح کی الہامی اعتبار سے کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہے۔شارحین اس کے باوجود اس اہم مسئلہ سے حیرت انگیز طور پر نہایت سرسری طریقہ سے گذر جاتے ہیں۔

اے ٹری کوٹ اپنی تصنیف ''عہد نامہ جدید کی مختصر لغت'' میں (تیچنی ڈکسیونیئر دونواوے تیستاماں) جو کریمین بائبل (۱۹۶۰ء کے ایڈیشن) میں شامل ہے اور جو عام اشاعت کے لیے نکالی گئی ہے ''رفع مسیح'' کے لیے کوئی اندراج نہیں کرتے۔

اناجیل اربعہ کا خلاصہ (سنوپس وے کیتر اوانژیل) مصنفہ فادرس بنولے اور بوامار جو یروشلم کے بائبلیکل سکول میں مدرس ہیں (۱۹۷۲ء کے ایڈیشن) جلد دوم صفحات ۴۵۱ اور ۴۵۲ پر اس امر سے آگاہ کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل اور رسولوں کے اعمال میں جو تضاد ہے اس کی تشریح ایک ادبی ترکیب کو کام میں لا کر کی جاسکتی ہے: کم سے کم جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ ''اس کو سمجھنا مشکل ہے۔''

نتیجۃً فادر روگے اپنی تصنیف ''انجیل کا ابتدائیہ'' ۱۹۷۳ء میں (صفحہ ۱۸۷) مذکورہ بالا دلیل سے مطمئن نہیں ہوسکتے۔ وہ جو توضیح وتشریح پیش کرتے ہیں وہ عجیب وغریب ہے۔

''یہاں جیسا کہ اسی طرح کے دیگر معاملات میں ہوتا ہے، مسئلہ ناقابل فہم ہو جاتا ہے کہ بائبل کے بیانات کو حقیقی معنوں میں لیا جائے اور ان کی دینی اہمیت کو فراموش کر دیا جائے۔ یہ ایک واقعاتی صداقت کو ایسی علامت کی شکل میں تحلیل کرنے کا معاملہ نہیں ہے جو بے میل ہے بلکہ ان دینی مقاصد کو تلاش کرنا ہے جو ان رازہائے سربستہ کو ایسے حقائق فراہم کر کے ہم پر منکشف کرتے ہیں جن کو ہم اپنے احساسات اور ایسی علامات سے سمجھ لیتے ہیں جو ہماری روح مجسم کے لیے موزوں وضاحت ہیں۔

اس قسم کی تاویلات سے مطمئن ہونا کیسے ممکن ہے۔ صرف وہی شخص جس نے ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا ہے اس طرح کے معذرت آمیز گھڑے گھڑائے فقروں کو قبول کر سکتا ہے۔

فادر روگے کی تفسیر کا ایک اور دلچسپ پہلو ان کا یہ اقرار ہے کہ ''اسی طرح کے

اور بہت سے معاملات ہیں'' یعنی جیسا کہ اناجیل میں رفع مسیح کا معاملہ۔ لہٰذا اس مسئلہ کو معروضی طریقے سے اور گہرائی میں اتر کر بحیثیت مجموعی لینا ہے۔ یہ بات معمولی معلوم ہوتی ہے کہ اناجیل کی تحریر کے موقع پر جو حالات تھے یا اس زمانہ میں جو مذہبی فضا چھائی ہوئی تھی، اس کا مطالعہ کرکے اس کی تشریح و توضیح کی جائے۔ جب زبانی روایات سے اخذ شدہ ابتدائی تحریرات میں تحریف کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے اور ہمیں اس طریقہ کا پتہ چلتا ہے جس طریقہ سے وہ متون جو ہم تک پہنچے ہیں، ان میں تصرف کیا گیا ہے، تو مبہم، نا قابل فہم، متضاد، ناممکن اور یہاں تک کہ نامعقول عبارتوں پر ہمیں زیادہ حیرت نہیں ہوتی۔ یہی بات ان متون کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو آج کل کی ثابت شدہ حقیقتوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ان حقائق کے لیے ہم سائنسی ترقی کے مرہون منت ہیں۔ اس نوع کے مشاہدات اس عنصر کی نشاندہی کرتے ہیں جو متون کی تحریر اور ترمیم میں انسان کی شرکت سے شامل ہو گیا ہے۔

گذشتہ چند دہ سالوں میں صحیفوں میں معروضی نوعیت کی تحقیق مسلمہ طور پر خصوصی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ حال ہی کی ایک کتاب ''قیامت پر عقیدہ، عقیدہ کا یوم نشور۔'' (فوآ این لا ریسر کسیوں ریسر کسیوں دلا فوآ) میں فادر کینن ژی ایسے جو پیرس کے ایک کیتھولک ادارے کے پروفیسر ہیں، اس زبردست تبدیلی کو حسب ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ ''دیندار لوگ مشکل سے اس امر سے واقف ہیں جو پائس دوازدہم (۲) کے زمانہ سے بائبل کی تاویلات کے طریقوں میں ایک انقلاب رونما ہو چکا ہے۔'' لہٰذا جس انقلاب کا تذکرہ مصنف موصوف کرتے ہیں

وہ حال ہی کا ہے۔ دیندار لوگوں میں اس کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ کم از کم وہ چند ماہرین خصوصی اس پر عملدرآمد کر رہے ہیں، جو انقلاب کی روح سرشار ہیں۔ مصنف موصوف رقمطراز ہیں۔ ''استقفی روایت کے انتہائی یقینی پہلوؤں کی تنسیخ اس انقلاب سے تاویل کے ان طریقوں میں کم وبیش شروع ہوگئی ہے۔''

فادر کینن ژی ایسے اس بات پر متنبہ کرتے ہیں کہ ''اناجیل میں حضرت یسوع مسیح کے متعلق جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں ان کو لفظی طور پر نہیں لینا چاہیے۔ کیونکہ وہ کسی خاص موقع یا مناظرے سے مناسبت رکھنے والی تحریریں ہیں۔ جن کے مصنفین حضرت عیسیٰ کے بارے میں اپنی قومی روایات کو ضبط تحریر میں لا رہے ہیں۔'' جہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کے قبر سے اٹھائے جانے کا تعلق ہے جو اس کتاب کا موضوع ہے۔ اس کے سلسلہ میں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اناجیل کے مصنفین میں سے کوئی بھی اس واقعہ کا عینی شاہد نہیں ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جہاں تک حضرت عیسیٰ کی قومی زندگی کا تعلق ہے یہی بات صحیح ہونی چاہیے۔ کیونکہ اناجیل کے مطابق یہودہ اسکریوتی کے سوا کوئی بھی حواری ایسا نہیں تھا جس نے حضرت عیسیٰ کو اس وقت سے جب وہ پہلے پہل آپ کی صحبت میں داخل ہوا آپ کے عالم آب وگل میں آخری ظہور کے وقت تک چھوڑا ہو۔

ہم اس روایتی حالت سے بہت دور ہٹ گئے ہیں جس کو دس سال کی ہی تو بات ہے جب دوسری ویٹی کن کونسل نے ایک بار پھر باضابطہ طور پر تسلیم کیا تھا۔ یہ بات عام ترویج کی ان جدید کتابوں کے ذریعہ سے پھر شروع کی جارہی ہے۔ جو مذہب کے ماننے والوں کے مطالعہ کے لیے لکھی گئی ہیں۔ بہر حال رفتہ رفتہ

حقیقت سامنے آ رہی ہے۔اس معاملہ کو سمجھ لینا آسان نہیں ہے کیونکہ فی الحقیقت اس قدر سختی سے محفوظ کی ہوئی روایت کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے۔خود کو اس سے آزاد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسئلہ کی جڑ بنیاد کو کھودا جائے یعنی پہلے ان حالات کا جائزہ لیا جائے جو عیسائیت کی تخلیق کا موجب ہوئے۔

حواشی

۱۔ مطبوعہ سیول کے ایڈیشن ۔پیرس ۱۹۷۳ء

۲۔ اصل نام ''یوگینو پچی لے'' ہے۔ان کی ولادت ۱۸۷۶ء میں روم میں ہوئی۔۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک بیویریا اور جرمنی میں پوپ کے مفسر رہے۔۱۹۱۷ء میں سارڈی کے آرچ بشپ بنائے گئے۔۱۹۲۹ء میں کارڈینل ہوئے۔۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۸ء تک پاپائیت کے مختلف مشنوں پر بھیجے گئے۔ ۳۹۔۱۹۳۰ء اسقف اعظم کے سیکریٹری اور ۱۹۳۹ء تا ۱۹۵۸ء پاپائے اعظم رہے۔ ۱۹۵۸ء میں فوت ہوئے۔

(مترجم)

باب دوم

تاریخی یاددہانی

یہودوی عیسائیت

اور سینٹ پال

عیسائیوں کی اکثریت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ اناجیل براہ راست ان لوگوں نے لکھی تھیں جو حضرت عیسیٰ کی حیات کے عینی شاہد تھے اور اس لیے وہ ان کی زندگی اور تعلیمات کے اہم واقعات سے متعلق ناقابل تردید شہادت پر مشتمل ہیں۔ اس قدر استناد کی یقین دہانیوں کی موجودگی میں اس امکان پر اتنی حیرت ہوتی ہے۔ جب ان پر اخذ شدہ تعلیمامت پر بحث کرنے یا کلیسا کی معقولیت پر اس لحاظ سے شبہ کا اظہار کرنے میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ وہی تعلیم دینے والا ادارہ ہے جو یسوع مسیح نے خود دی تھی۔ آج کل کے اناجیل کے عام ایڈیشنوں میں وہ تشریحات شامل ہوتی ہیں جن کا مقصد عوام الناس میں ان خیالات کی اشاعت ہوتا ہے۔

اناجیل کے مصنفین کی حیثیت بلحاظ عینی شاہدوں کے مذہب کے ماننے

والے لوگوں کے سامنے ہمیشہ اصول موضوعہ کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ بایں ہمہ دوسری صدی کے وسط میں سینٹ جسٹن نے اناجیل کو حواریوں کے تذکرے کہا تھا۔علاوہ ازیں مصنفین کے بارے میں اتنی بہت سی تفصیلات ہیں کہ ان کی صحت پر کبھی شبہ کرنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ متی ایک مشہور و معروف کردار تھے جو چنگی کے ناکے پر یا کاپورناؤم کے محصول خانہ میں افسر کی حیثیت سے ملازم تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ آرامی اور یونانی زبانیں بولتے تھے۔مرقس کو بھی پطرس کے رفیق کار کی حیثیت سے بآسانی پہچانا جاسکتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی ایک عینی شاہد تھے۔لوقا جن کے بارے میں پال کا کہنا ہے کہ ایک ہر دلعزیز طبیعت رکھتے تھے۔ان کے متعلق معلومات نہایت صحیح ملتی ہیں۔ یوحنا وہ حواری ہیں جو ہمیشہ یسوع مسیح کے قریب رہے وہ بحیرہ گیلیلی کے ماہی گیر زبیدی کے صاحبزادے تھے۔

عیسائیت کے آغاز پر اس وقت جو تحقیقات ہو رہی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعات کو پیش کرنے کا یہ طریقہ حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ہم دیکھیں گے کہ اناجیل کے مصنفین اصل میں کون تھے۔یسوع مسیح کے عہد رسالت سے متصل جو دہ سالے گذرے جہاں تک ان کا تعلق ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ واقعات قطعاً اس نہج پر رونما نہیں ہوئے جس نہج پر بتایا جاتا ہے اور یہ کہ پطرس کی روم میں آمد سے کلیسا کی بنیاد نہیں رکھی گئی۔اس کے برخلاف اس وقت سے جو یسوع مسیح نے خاکدان عالم کو خیر باد کہا، دوسری صدی کے دوسرے نصف میں دو فرقوں کے مابین آویزش ہوئی۔ایک فرقہ وہ تھا جس کو پولوی عیسائیت کہہ سکتے

ہیں اور دوسرا فرقہ یہودوی عیسائیت کا تھا۔ یہ عمل نہایت سست رفتاری سے ہوا کہ اول الذکر نے موخر الذکر کو بے دخل کیا اور پولوی عیسائیت نے یہودوی عیسائیت پر غلبہ حاصل کیا۔

حال کی بہت سی کتابوں کی بنیاد عیسایت سے متعلق عصری تحقیقات پر ہے۔ ان میں ہمیں کاردینال ونیلو کا نام ملتا ہے۔ دسمبر ۱۹۶۷ء میں انہوں نے تبصرۂ مطالعات (ایتود) میں ایک مضمون شائع کرایا تھا۔ جس کا عنوان تھا ''عیسائیت کے آغاز کا ایک جدید نمائندہ۔ یہودوی عیسائیت۔'' (ایوان وژیوں نوویل دے اورمی ژاں کرتپنال لوژودیو کرستیانیام) اس میں وہ گذشتہ تصانیف پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اس کی تاریخ کو دہراتے ہیں اور ایک بالکل ہی مختلف سیاق وسباق میں ہمارے لیے یہ امکان پیدا کردیتے ہیں کہ ہم اناجیل کے ظہور میں آنے کا تعین کر سکیں۔ یہ سیاق وسباق اس سے قطعاً الگ ہے جو عام مطالعہ کے لیے شائع ہونے والی کتابوں کے مطالعہ سے ابھرتا ہے۔ ان کے مضمون میں جو ضروری نکات پیدا کیے گئے ہیں ان سے ان نکات کا ایک بھدا ساترجمہ سامنے آتا ہے جس میں اس کے بہت سے اقتباسات بھی شامل کردیئے گئے ہیں۔

یسوع مسیح کی رحلت کے بعد ''حواریوں کی مختصر جماعت نے یہودیوں کا ایک ایسا جتھا بنایا جو عبادت کے اس طریقہ پر قائم رہا جو معابد میں جاری تھا'' لیکن جب لادینوں کی جماعت سے تبدیل مذہب کرنے والوں کے رسوم ورواج ان میں شامل ہو گئے تو ایک مخصوص قسم کا نظام ان کے سامنے آیا۔ ۴۹ء میں منعقد ہونے والی یروشلم کی کونسل نے انہیں ختنہ اور یہودی رسوم ورواج سے مستثنیٰ قرار

دے دیا۔ ''بہت سے یہودیوں عیسائیوں نے اس رعایت کو مسترد کر دیا۔'' یہ گروہ پال کی جماعت سے بالکل الگ تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ پال اور یہودی عیسائیوں کے مابین ان لادینوں کے سوال پر تنازعہ تھا جو مذہب تبدیل کر کے عیسائیت میں آ گئے تھے (انطاکیہ کا واقعہ ۴۹ء) پال کے لیے ختنہ کی رسم، سبت کا حکم اور عبادت گاہ میں رائج عبادت کا طریقہ اس وقت سے خود یہودیوں کے لیے بھی پرانے ہو گئے تھے۔ عیسائیت کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود کو یہودیت سے سیاسی و مذہبی طور پیچیدگی سے آزاد کرے اور اپنے دروازے غیر یہود کے لیے کھول دے۔

ان ''یہودی عیسائیوں'' کے لیے جو ''وفادار یہودی'' رہے پولس کی حیثیت ایک غداری کی سی تھی۔ یہودوی عیسائیت کی تحریروں میں ان کو دشمن کہا جاتا ہے اور ان کو ''عیارانہ دوعملی'' کا الزام دیا جاتا ہے۔ لغایتہ ۷۰ء کلیسا میں یہودوی عیسائیت کی ہی اکثریت رہی۔ اور پولس کی حیثیت اکل کھرے کی سی ہے۔ اس زمانے میں عیسائی فرقے کے سربراہ جیمس تھے جن کی یسوع مسیح سے قرابت داری تھی۔ (شروع میں) پطرس اور یوحنا بھی ان کے ساتھ رہے۔ ''جیمس کو یہودوی عیسائیت کے جتھے کا نمائندہ سمجھا جا سکتا ہے، جو پالوی عیسائیت کے مقابلہ میں دانستہ طور پر یہودیت سے چپکا رہا۔'' یسوع مسیح کے خانوادے کو یروشلم کے یہودوی عیسائیت کلیسا میں نہایت ہی اہم مقام حاصل ہے۔ ''جیمس کے جانشین شمعون بن کلیوپس ہوئے جو یسوع مسیح کے ایک پچیرے بھائی تھے۔''

کارڈینل ڈینیلو اس جگہ یہودوی عیسائیت کی ان کتابوں سے حوالہ دیتے ہیں

جو اس فرقہ کے یسوع مسیح کے بارے میں نظریات کو پیش کرتی ہیں اور یہ فرقہ ابتدا میں حواریوں پر مشتمل تھا۔ یہ کتابیں تھیں عبرانی کی اناجیل (جو ایک یہودوی عیسائی فرقہ کے ذریعہ مصر میں آئیں) ان میں کلیمنٹ کی تحریریں، مواعظ اور مکاشفات جیمس کا دوسرا الہام اور طامس کی انجیل شامل ہیں۔(۱)

کارڈنیل ڈینیلو تفصیل سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں ''عیسائیت سے متعلق لٹریچر کی قدیم ترین تحریریں جن کا حوالہ دیا جاسکتا ہے وہ یہودوی عیسائی فرقہ کی ہیں۔''

''جو یہودوی عیسائیت پہلی صدی عیسوی میں غالب رہی وہ عین یروشلم اور فلسطین میں ہی نہیں تھی۔ یہودوی عیسائیت کی تبلیغ پالوی تبلیغ سے قبل ہر جگہ پروان چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہی بات اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ پولوس کے خطوط ایک آویزش کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔'' یہی وہ مخالفین تھے جن سے اس کو ہر جگہ نمٹنا پڑا۔ غلطیہ میں، کورنتھ میں، کولوسی میں، روم میں اورانطا کیہ میں۔

غزہ سے انطا کیہ تک شامی فلسطینی ساحل پر یہودوی عیسائیت کا غلبہ تھا۔ ''جیسا کہ رسولوں کے اعمال اور کلیمنتی تحریروں سے شہادت ملتی ہے۔'' ایشیائے کوچک میں یہودوی عیسائیت کو وجود تھا جیسا کہ سینٹ پال کے خطوط بنام گلیتوں اور کلیسوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ پاپائی تحریروں سے ہمیں فرجیہ میں یہودوی عیسائیت کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یونان میں پال کے کورنتھیوں کے نام پہلے خط میں یہودوی عیسائیت کا حوالہ ملتا ہے۔ خصوصاً اپالو کے مقام پر کلیمنٹ کے خط اور شیفرڈ ہرمسی کے بموجب روم ایک اہم مرکز تھا۔ سوتینیس اور ٹیسٹی کے

نزدیک عیسائی ایک یہودی فرقہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ کارڈینال ڈینیلو کا خیال ہے کہ افریقہ میں سب سے پہلے یہودوی عیسائیت ہی عیسائی مذہب کی شکل میں نمودار ہوئی۔ عبرانی کی انجیل اور کلیمنٹ اسکندری کی تحریروں کا اس سے رابطہ قائم ہوتا ہے۔

ان حقائق کا جاننا لازمی ہے تاکہ ان قوموں کے درمیان آویزش سمجھ میں آ سکے جس سے وہ پس منظر تیار ہوا، جس کی وجہ سے اناجیل لکھی گئیں۔ وہ متون جو اصل ماخذوں میں متعدد تصرفات کے بعد اس وقت موجود ہیں۔ ۷۰ء کے لگ بھگ وجود میں آنے شروع ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دونوں حریف قومیں ایک شدید قسم کی آویزش میں مشغول تھیں۔ جن میں یہودوی عیسائیت کو اس وقت بھی غلبہ حاصل تھا۔ جنگ یہود اور ۷۰ء میں سقوط یروشلم کے ساتھ ہی حالت الٹ گئی تھی۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کی روشنی میں کارڈینال ڈینیلو انحطاط کی تشریح کرتے ہیں۔

”یہودیوں کے حدود سلطنت میں غیر معتبر قرار دیئے جانے کے بعد عیسائی خود کو ان سے علیحدہ کرنے کی طرف مائل ہوئے۔ عیسائی فرقہ کے یونانی النسل افراد کو اس وقت غلبہ حاصل ہو گیا۔ پال کو مرنے کے بعد کامیابی نصیب ہوئی۔ عیسائیت نے خود کو سیاسی اور عمرانی اعتبار سے یہودیت سے الگ کر لیا۔ یہ ایک تیسری قوم بن گئی۔ پھر بھی ۱۴۰ء میں یہودی بغاوت تک یہودوی عیسائیت تہذیبی طور پر برتری حاصل کیے رہی۔“

۷۰ء سے لگا کر ۱۱۰ء سے کچھ پہلے تک کی مدت میں مرقس، متی، لوقا اور یوحنا

کی انجیلیں وجود میں آ گئیں۔ ان می ابتدائی دور کی عیسوی تحریری دستاویزات شامل نہیں ہیں۔ پال کے خطوط ان سے کافی پہلے زمانے کے ہیں۔ اوکلمان کے کہنے کے بموجب پال نے تھیسالویوں کو جو خط لکھا وہ غالباً ۵۰ ء کا ہے۔ غالب گمان ہے کہ وہ مرقس کی انجیل کی تکمیل سے بہت سال پہلے راہ عدم کو جا چکا تھا۔

عیسائیت میں پال کی شخصیت سب سے متنازعہ ہے۔ حضرت یسوع مسیح کے خانوادے کے لوگ اور وہ حواری جو جیمس کے حلقے میں رہتے ہوئے یروشلم میں مقیم رہے، اس کو یسوع مسیح کے خیالات سے غداری کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ پال نے ان لوگوں کی تذلیل کر کے جن کو حضرت یسوع مسیح نے اپنی تعلیمات کی اشاعت کے لیے اپنے گرد جمع کیا تھا، عیسائیت کو جنم دیا۔ وہ یسوع مسیح سے ان کی حیات میں واقف تک نہیں تھا۔ اس نے اپنے مشن کی حقانیت کو اس اعلان کے ساتھ ثابت کیا کہ جب وہ دمشق جا رہا تھا تو یسوع مسیح، متوفی لوگوں میں سے زندہ ہو کر اس پر ظاہر ہوئے تھے۔ یہ سوال کرنا نہایت معقول ہے کہ پال نہ ہوتا تو عیسائیت کی شکل کیا ہوتی؟ اس موضوع پر بلاشبہ ہر طرح کے نظریات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اناجیل کا تعلق ہے، یہ امر بالکل یقینی ہے کہ اگر فرقوں کے مابین آویزش کی یہ فضا نہ ہوتی تو وہ تحریریں بھی موجود نہ ہوتیں جو آج کل ہمارے پاس ہیں۔ یہ تحریریں دو فرقوں کے مابین سخت آویزش کے دوران ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ مناظرانہ تحریریں جیسا کہ فادر کینین ٹژی ایسے نے ان کے متعلق کہا ہے، یسوع مسیح پر لکھی جانے والی کتابوں کے ایک انبار میں سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ اس وقت ظہور پذیر ہوئیں جب پال کے طرز عیسائیت نے واضح کامیابی حاصل کر

لی اور اس نے اپنے سرکاری متون کے مجموعے مرتب کر لیے۔ یہی متون اناجیل کی اس مسلمہ شکل پر مشتمل ہیں جس نے کسی بھی ایسی تحریروں کو مستند عقیدے کے خلاف قرار دے کر رد اور خارج کر دیا ہے جو ان اصولوں کے مطابق نہیں ہیں جن کو کلیسا نے اختیار کیا ہے۔

یہودوی عیسائیت ایک با اثر فرقہ کی حیثیت سے اب معدوم ہو چکی ہے لیکن اب بھی لوگ اس فرقہ کے ماننے والوں کے بارے میں ایک عام اصطلاح ''یہودی صفت'' کے تحت گفتگو کرتے سنے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے غائب ہو جانے کے بارے میں کارڈینل ڈینیلو کا بیان یہ ہے۔ ''جب ان کا تعلق کلیسائے اعظم سے منقطع ہو گیا، جس نے خود کو رفتہ رفتہ یہودوی بندھنوں سے آزاد کر لیا تھا، تو وہ مغرب میں نہایت تیزی سے ختم ہو گئے۔ لیکن مشرق میں ممکن ہے تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں ان کے کچھ نشانات مل سکیں۔ خصوصیت سے فلسطین، عرب، ماورائے اردن، شام اور میسوپوٹامیہ میں۔ باقی حضرات نے کلیسائے اعظم میں شمولیت اختیار کر لی۔ ساتھ ہی سامی تمدن کے اثرات کو محفوظ رکھا۔ ان میں سے کچھ ہنوز حبشہ اور خالدیہ کے کلیساؤں میں باقی رہی۔''

حواشی

۱۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ تمام تحریریں بعد میں اسفار محرفہ کے درجہ میں شامل کردی گئیں۔یعنی ان کو فاتح کلیسا نے چھپادیا، جو پال کی کامیابی سمجھی گئی۔اس کلیسا نے انجیلی لٹریچر میں قطع و برید کا کام لیا اور صرف قانونی انجیلیں باقی رکھی گئیں۔

باب سوم

اناجیل اربع

ماخذ اور تاریخ

ان تحریروں میں جو عیسائیت کے ابتدائی ادوار سے ہم تک پہنچی ہیں اناجیل کا سینٹ پال کی کتابوں کے کافی عرصہ بعد تک کہیں ذکر نہیں ملتا۔ دوسری صدی عیسوی کے وسط تک اور زیادہ صحت کے ساتھ کہا جائے تو ۱۴۰ء کے بعد تک عیسائی تحریروں کے مجموعوں کے متعلق بیانات منظر عام پر آنے شروع نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود دوسری صدی عیسوی کے شروع میں بہت سے عیسائی مصنفین صاف طور پر اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ انہیں پال کے بہت سے خطوط کا علم تھا۔ یہ بیانات بائبل کے عالمی ترجمہ عہد نامہ جدید کے ابتدائیہ میں پیش کیے گئے ہیں۔ (۱۹۷۲ء)وہ بالکل ابتدا ہی میں ذکر کر دیئے جانے کے قابل ہیں۔ اوران کی یہاں نشاندہی کر دینا مفید ہو گا کہ جس تحریر کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہ ایک اجتماعی کوشش کا نتیجہ ہے جس میں سو سے زیادہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ماہرین خصوصی باہم مجتمع ہوئے تھے۔

اناجیل جو بعد میں چل کر سرکاری یعنی شرعی حیثیت اختیار کر گئیں، کافی عرصہ

بعد تک علم میں نہیں آئیں، حالانکہ وہ دوسری صدی عیسوی کے شروع میں مکمل کی جا چکی تھیں۔ عالمی ترجمہ کے مطابق ان سے متعلق کہانیاں دوسری صدی عیسوی کے وسط میں بیان کی جانے لگی تھیں۔ اس کے باوجود ''یہ بات طے کرنی تقریباً ہمیشہ مشکل رہی ہے کہ ان کے اقتباسات، تحریر متون سے حاصل کیے گئے جو مصنفین کے پاس ان کے علاوہ تھے یا موخر الذکر زبانی روایت کے ٹکڑوں اور فقروں کی یاد کو قائم رکھنے پر قانع رہے۔''

''۱۴۰ء سے قبل'' بائبل کے اس ترجمہ میں شامل تبصروں میں ہم پڑھتے ہیں کہ ''کسی حالت میں بھی کوئی ایسا بیان موجود نہیں تھا جس سے کوئی شخص انجیل سے متعلق تحریروں کے کسی مجموعے کے بارے میں تمیز کر سکتا۔'' یہ بیان اس تحریر کے خلاف ہے جو اے ٹری کوٹ نے عہد نامہ جدید کے اپنے ترجمہ میں تبصرہ کرتے ہوئے دی تھی۔ (۱۹۶۰ء) ''دوسری صدی عیسوی کے شروع ہونے سے بہت پہلے'' انجیل کا لفظ استعمال کرنا ایک عادت بن گیا تھا جس سے مراد وہ کتابیں تھیں جن کو سینٹ جسٹن نے ۱۵۰ء کے لگ بھگ حواریوں کی یادداشتیں قرار دیا تھا۔'' بدقسمتی سے اس قسم کے بیانات پبلک کے لیے اناجیل کی تاریخ کے بارے میں خیال قائم کرنے کے سلسلے میں کافی عام ہیں جو غلط ہیں۔

اناجیل ''بہت پہلے'' ایک مکمل مجموعہ کی شکل میں ظہور پذیر نہیں ہوئیں۔ یہ وقوعہ یسوع مسیح کے تبلیغی مشن کے اختتام کے ایک صدی سے بھی زیادہ بعد میں رونما ہوا۔ بائبل کا عالمی ترجمہ، اس تاریخ کا جس میں چاروں انجیلوں نے شرعی لٹریچر کا درجہ حاصل کیا، تعین ۱۷۰ء کے لگ بھگ کا کرتا ہے۔

جسٹن کا وہ بیان بھی جس میں مصنفین کو ''حواری'' کہا گیا ہے۔ آئندہ معلوم ہو جائے گا کہ قابل قبول نہیں ہے۔

جہاں تک کہ اس تاریخ کا تعلق ہے جس میں اناجیل لکھی گئیں، اے ٹری کوٹ کا کہنا ہے کہ متی کی، مرقس کی اور لوقا کی انجیلیں ۷۰ء سے پہلے لکھی گئیں۔ لیکن یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔ سوائے مرقس کی انجیل کے۔ بہت سے اور مصنفین کی پیروی کرتے ہوئے یہ شارح بھی اپنی راہ سے یہ بتانے میں دور ہٹ جاتا ہے کہ اناجیل کے مصنفین رسول یا حضرت عیسیٰ کے حواری تھے۔ اسی وجہ سے وہ ان کے تحریر کیے جانے کی ان تاریخوں کا تعین کرتا ہے جو حضرت عیسیٰ کی حیات کے قریبی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

جہاں تک یوحنا کا تعلق ہے ان کے بارے میں اے ٹری کوٹ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ وہ تقریباً ۱۰۰ء تک زندہ رہے۔ عیسائی اس بات کے عادی رہے ہیں کہ وہ ان کو حضرت عیسیٰ کے بہت قریب کے زمانہ میں بتائیں۔ لیکن یہ اعتراف کرنا نہایت دشوار ہے کہ وہ اس انجیل کے مصنف ہیں جو ان کے نام سے منسوب ہے۔ دوسرے شارحین کی طرح اے ٹری کوٹ کے نزدیک یوحنا حواری (متی کی طرح) ان حقائق کے جو وہ بیان کرتے ہیں، قانونی حیثیت سے شاہد تھے۔ اگرچہ ناقدین کی اکثریت اس نظریہ کی حمایت نہیں کرتی کہ انہوں نے ہی چوتھی انجیل کو تحریری شکل دی۔

لیکن اگر چاروں انجیلیں جو زیر بحث ہیں، دلائل سے رسولوں یا حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی یادداشتیں قرار نہیں پا سکتیں تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ آئیں

کہاں ہے؟

اوکلمان اپنی تصنیف ''عہد نامہ جدید'' میں اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ انجیلوں کے مرتبین محض ''ابتدائی دور کے اس عیسائی فرقہ کے ترجمان تھے جس نے زبانی روایتوں کو تحریر کیا۔'' تیس چالیس سال تک انجیل قریب قریب محض زبانی روایت کی شکل میں موجود رہی۔ اور زبانی روایت نے صرف اقوال کو آئندہ کے لیے منتقل کیا اور بیانات کو ان سے علیحدہ کر دیا۔ اناجیل اربع کے مصنفین نے ان کو باہم مربوط کیا۔ ہر ایک نے اپنے مزاج کی افتاد اور سابقہ دینی رجحان کے مطابق اپنا جداگانہ طریقہ اختیار کیا۔ مشہور روایتوں کی روشنی میں جو بیانات اور اقوال ان تک پہنچے تھے ان کو آپس میں ملا دیا۔ حضرت عیسیٰ کے ارشادات کو یکجا کرنے اور اسی طرح روایتوں کو ترتیب دینے کا کام مبہم فقروں مثلاً ''اس کے بعد جب ایسا ہوا'' وغیرہ کے ذریعہ ملا کر کیا گیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر کتب متفقہ (متی، مرقس اور یوحنا کی انجیلیں جن کی ترتیب یکساں ہے) کا ڈھانچہ خالص ادبی ترتیب پر ہے اور اس کی بنیاد تاریخ پر نہیں۔''

وہی مصنف بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے۔

''یہ بات قابل لحاظ ہے کہ تبلیغ، عبادت اور تعلیم کی اہمیت سوانحی بیانات سے زیادہ ہے اور یہی وہ ضرورتیں تھیں جنہوں نے ابتدائی اقوام کی اس وقت رہبری کی جب انہوں نے حضرت عیسیٰ کی حیات سے متعلق روایت کو قلم بند کیا۔ حوارین نے حضرت عیسیٰ کی زندگی کے واقعات بیان کرنے کے سلسلہ میں عقیدہ کی سچائی کو ظاہر کیا ہے۔ ان کے مواعظ وہ ہیں جو ان بیانات کو ضبط تحریر میں لانے کا

موجب ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کے ارشادات خصوصیت سے ابتدائی دور کے کلیسا کے سوال و جواب نامہ کی شکل میں منتقل کیے گئے۔''

ٹھیک یہی وہ طریقہ ہے جس سے بائبل کے عالمی ترجمہ کے شارحین، اناجیل کی تحریر کو بیان کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں اور دیگر مبلغین کی تبلیغ سے متاثر زبانی روایت کی تشکیل اس مواد کا تبلیغ کے ذریعہ محفوظ رکھنے کا عمل جو اناجیل میں فی الحقیقت پایا جاتا ہے اور دین عیسوی کے ماننے والوں کی تبلیغ، عبادت کے دوران دعائیں مانگنے کا طریقہ اور تعلیم کسی قدر ضعیف امکان کے ساتھ وہ مرئی شکل جو دین کے چند احکامات کے تحریر میں آ جانے سے بنی، حضرت عیسیٰ کے ارشادات مثلاً مصائب مسیح کے جو صلیب پر آپ نے برداشت کیے، بیانات، یہ حقیقت کہ انجیلوں کے مرتبین کا مدار مختلف تحریری شکلوں پر بھی رہا، وہ مواد ہے جو زبانی روایت میں شامل ہے۔ وہ لوگ ان متون کی تخلیق میں ان چیزوں پر انحصار کرتے ہیں جو ''مختلف حلقوں کے لیے موزوں ہیں جو کلیسا کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ صحیفوں کے فقروں کی توضیح و تشریح کرتے ہیں، غلطیوں کی تصحیح کرتے ہیں اور موقع بہ موقع مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی پیش کر دیتے ہیں۔ اس طرح انجیلوں کے مرتبین میں سے ہر ایک نے اپنے نقطۂ نظر سے اس مواد کو جو انہیں زبانی روایت سے ملا جمع کیا اور ترتیب دیا ہے۔

یہ صورت ایک سو سے زیادہ ماہرین نے مجموعی طور پر عہد نامہ جدید کی تفسیر کے سلسلہ میں اختیار کی ہے اور اس میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں ہی شامل ہیں۔ اس میں اس روش سے زبردست اختلاف کیا گیا ہے جو دوسری ویٹی کن کونسل نے

وحی و الہام پر ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۶ء کے مابین اپنے اصولی آئین میں قائم کی ہے۔

اس مشاورتی دستاویز کا حوالہ ایک مرتبہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ جب عہد نامۂ قدیم پر گفتگو کی جا رہی تھی۔ موخر الذکر کے بارے میں کونسل یہ اعلان کر سکی کہ ''جن کتابوں میں اس ترتیب دیا گیا ہے ان میں وہ مواد شامل ہے جو نامکمل اور متروک ہے۔'' لیکن اس نے یہی پابندیاں اناجیل کے بارے میں ظاہر نہیں کی ہیں۔ اس کے برخلاف جیسا کہ ہم ذیل میں پڑھتے ہیں۔

''کوئی شخص بھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ تمام صحیفوں میں یہاں تک کہ عہد نامہ جدید میں بھی اناجیل کو ایک اعلیٰ و برتر مقام حاصل ہے۔ یہ بات اس حقیقت کے لحاظ سے ہے کہ ان میں کلمۃ اللہ یعنی ہمارے نجات دہندہ کی حیات اور تعلیمات کی انتہائی فائق و برتر شہادت ملتی ہے۔ تمام زمانوں میں اور تمام مقامات پر کلیسا نے چاروں انجیلوں کی پیغمبرانہ حیثیت کو برقرار رکھا ہے اور ہنوز برقرار رکھے ہوئے ہے۔ حضرت عیسیٰ کے احکام کی رسولوں نے حقیقت میں جو تبلیغ کی اس کو انہوں نے اور ان کی متبعین و مقلدین نے روحانی کیفیت سے سرشار ہو کر ان تحریروں میں آئندہ نسلوں کو منتقل کیا جو عقیدہ کی بنیاد ہیں یعنی اناجیل اربعہ جو متی، مرقس، لوقا اور یوحنا سے مروی ہیں۔

''ہماری مادر مقدسہ یعنی کلیسا نے نہایت مستحکم طریقہ پر اس بات کو برقرار رکھا ہے اور انتہائی استقامت کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہے کہ یہ چاروں انجیلیں جن کو یہ بلا جھجک تاریخی اعتبار سے مستند مانتی ہے، دیانتداری سے بالکل وہی کام اور وہی کلام ہیں جو حضرت عیسیٰ ابن اللہ نے لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنی

حیات میں ان کی دائمی نجات کے لیے اس دن تک کیے جب ان کو (حضرت عیسیٰ کو) آسمان پر اٹھایا گیا.....لہٰذا ان مقدس و برگزیدہ مصنفین نے اناجیل اربعہ کو اس طریقہ سے مرتب کیا کہ ان سے حضرت یسوع مسیح کی حیات سے متعلق صحیح اور واضح معلومات ملتی رہے۔''

یہ اس صحت کا ایک غیر مبہم اقرار ہے جس سے اناجیل حضرت یسوع مسیح کے اعمال اور اقوال کو منتقل کرتی ہیں۔

کونسل کے بیان میں اور جو کچھ مذکورہ بالا مصنفین دعویٰ کرتے ہیں اس میں بمشکل ہی کوئی مطابقت دکھائی دیتی ہے، خصوصیت سے حسب ذیل بیان ہیں۔

اناجیل کو ''لفظی اعتبار سے نہیں لینا چاہیے۔'' وہ ''موقع اور محل کی مناسبت سے تحریریں'' یا ''مناظراتی تحریریں'' ہیں۔ ان کے مصنفین حضرت عیسیٰ سے متعلق خود اپنی قوم کی روایات کو ضبط تحریر میں لا رہے ہیں۔ (فادر کینن ژی ایسے)

اناجیل ایسے متن ہیں جو ''مختلف حلقوں کے لیے موزوں ہیں۔ کلیسا کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ صحیفوں کے متعلق بیانات کی توضیح و تشریح کرتے ہیں۔ غلطیوں کی اصلاح کرتے ہیں اور یہاں تک کہ موقع پڑنے پر مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی دے دیتے ہیں۔ اس طرح انجیلوں کے مرتبین میں سے ہر ایک نے اپنے نقطہ نظر سے اس مواد کو جو زبانی روایت سے اس کو ملا جمع کیا اور ترتیب دے دیا۔'' (بائبل کا عالمی ترجمہ)

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہاں ہمیں متضاد بیانات ملتے ہیں۔ کونسل کا اعلان ایک طرف ہے اور نہایت جدید دور کا اختیار کیا ہوا موقف دوسری طرف۔ دوسری

ویٹی کن کونسل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰ کے افعال واقوال کا ایک صحیح بیان اناجیل میں ملتا ہے لیکن اس کی مطابقت تضادات اور ناممکنات پر مشتمل ان تحریروں کے ساتھ پیدا کرنا ناممکن ہے جوایسی چیزیں ہیں کہ معنوی اعتبار سے غیر ممکن ہیں ۔یا ایسے بیانات ہیں جو پورے طور پر تسلیم شدہ حقیقت کے منافی ہیں۔

اگر دوسری طرف کوئی شخص اناجیل کو ایسی تحریریں مان لے جو ان لوگوں کے نقطہ نظر کو پیش کرتی ہیں جنہوں نے مختلف فرقوں کی زبانی روایتوں کو جمع کیا، یا ایسی تحریریں سمجھ لے جو موقع کے مناسب یا مناظراتی تحریریں تھیں جو اناجیل میں کوتاہیوں کا بار پانا کوئی تعجب خیز امر نہیں رہ جاتا۔ یہ تمام کوتاہیاں علامت ہیں اس بات کی کہ لوگوں نے ان کو ایسے ہی حالات میں تحریر کیا۔اس کے باوجود کہ مصنفین نے واقعات کو ان کی عدم صحت پر شبہ کیے بغیر ان کو لکھ دیا پھر بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے کام میں پوری طرح مخلص ہوں۔ ان سے ہمیں ایسی تحریریں دستیاب ہوتی ہیں جو دوسرے مصنفین کے بیانات کی تردید کرتی ہیں یا وہ مختلف فرقوں کے مابین ہونے والے مذہبی مناقشات کے دلائل سے متاثر ہیں ۔لہٰذا وہ حضرت عیسیٰ کی حیات سے متعلق ایسے قصے بیان کرتے ہیں جو ان کے مخالفین کے زاویہ نظر سے بالکل مختلف ہیں۔

یہ بات پہلے ہی ظاہر کی جا چکی ہے کہ اناجیل سے متعلق دوسرا موقف کس طرح تاریخی سیاق سے مطابقت رکھتا ہے۔متون سے متعلق ہمارے پاس جو مواد موجود ہے، وہ اس بات کی پوری طرح توثیق وتصدیق کرتا ہے۔

متی کی انجیل (۱)

عہد نامہ جدید میں موجود انجیل اربعہ میں متی سب سے پہلے آتے ہیں۔ ان کا یہ مقام اس حقیقت کی روشنی میں بالکل حق بجانب ہے کہ یہ عہد نامہ قدیم ہی کا ایک بڑھا ہوا حصہ ہے۔ یہ انجیل اس بات کے اظہار کے لیے لکھی گئی تھی کہ ''حضرت عیسیٰ نے اسرائیل کی تاریخ کی تکمیل کی۔'' جیسا کہ بائبل کے عالمی ترجمہ کے شارحین لکھتے ہیں اور جس کو ہم تفصیل سے بیان کریں گے۔ اس مقصد کے لیے متی برابر عہد نامہ قدیم سے ایسے حوالے دیئے جاتے ہیں جن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ وہی عمل کرتے رہے جو وہ مسیح کرتے جن کا یہودی انتظار کر رہے تھے۔

یہ انجیل حضرت عیسیٰ کے نسب نامے سے شروع ہوتی ہے۔ متی نے اس کو حضرت داؤدؑ کے واسطے سے حضرت ابراہیمؑ تک پہنچایا ہے۔ ہم ابھی متن میں اس کوتاہی کی نشاندہی کریں گے جو بیشتر شارحین خاموشی سے نظر انداز کر دیتے ہیں، تاہم متی کا مقصد یہ سلسلہ نسب پیش کرنے سے اپنے کام کے عمومی انداز کو ظاہر کرنا تھا۔ مصنف موصوف یہودی شریعت کے بارے میں حضرت عیسیٰ کے موقف کو برابر سامنے لا کر اپنے اس خیال کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہیں۔ اس شریعت کے خاص اصول (نماز، روزہ اور زکوۃ کی ادائیگی) یہاں مختصراً بیان کیے جاتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ اپنی تعلیمات کی اشاعت سب سے پہلے اپنے لوگوں میں کرتے

ہیں۔ یہ طریقہ ہے جس سے آپ اپنے بارہ حواریوں سے گفتگو فرماتے ہیں۔

''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا'' (متی ۱۰:۵۔۶) ''میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔'' (متی ۱۵:۲۴) انجیل کے اخیر میں ایک دوسری جگہ متی یسوع مسیح کے پہلے شاگردوں کے تبلیغی مشن کو تمام اقوام تک وسیع کر دیتے ہیں۔ وہ حضرت عیسیٰؑ سے حسب ذیل حکم دلواتے ہیں ''پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ۔'' (متی ۲۸:۱۹) لیکن مقصد اولین اسرائیل کا گھرانہ ہونا چاہیے۔ اے ٹری کوٹ کا اس انجیل کے بارے میں کہنا ہے کہ ''اس کے یونانی لبادے کے نیچے اس کتاب کے گوشت و استخوان یہودوی ہیں اور یہی اس کی روح ہے: اس میں یہودوی احساس جاری وساری ہے اور اس کی اپنی امتیازی علامات ہیں۔''

''صرف ان ہی مشاہدات کی بنیاد پر متی کی انجیل کے ماخذ یہودوی عیسائی فرقہ کی روایت میں قائم کیے جا سکتے ہیں۔ اوکلمان کے بموجب یہ فرقہ ''یہودیت سے رسے تڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی عہد نامہ قدیم کے تسلسل کو قائم رکھے ہوئے تھا۔ اس انجیل کے پہلے کے مخصوص عقائد اور اس کا عمومی انداز ایک تناؤ کی کیفیت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔''

متن میں سیاسی اجزاء بھی پائے جاتے ہیں۔ فلسطین پر رومیوں کے قبضہ نے قدرتی طور پر اس ملک کی حصول آزادی کی خواہش کو بہت بڑھا دیا تھا۔ وہ لوگ خدا سے دعا کرتے تھے کہ جن لوگوں کو اس نے دوسرے تمام لوگوں میں منتخب کیا

ہے ان کی نصرت فرمائے۔ اور بادشاہ علی الطلاق کی طرح جو نوع بشر کے امور میں براہ راست مدد کر سکتا ہے ان کی مدد کرے، جس طرح اس نے تاریخی ادوار میں بارہا مدد کی ہے۔

متی کس قسم کے بزرگ تھے؟ ہم برملا یہ بات کہتے ہیں کہ وہ اب ہرگز بھی حضرت عیسیٰ کے حواریوں میں شمار نہیں کیے جاتے۔ تاہم اے ٹری کوٹ عہد نامہ جدید کے ترجمہ پر اپنے تبصرہ میں ان کو حواریوں میں شمار کرتے ہیں۔ (۱۹۶۰ء) ''متی المعروف بہ لیوی اس زمانہ میں جب حضرت یسوع مسیح نے اس کو اپنی شاگردی میں لیا اس وقت کا پورنا وم کے مقام پر نا کہ پر یا کسٹم ہاؤس میں بحیثیت کسٹم افسر کے ملازم تھا۔'' یہ کلیسا کے فادرس اوریگن، جیروم اورا پی فینس کی رائے ہے۔ اس رائے کو آج کل قطعاً تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ایک نکتہ جو غیر اختلافی ہے یہ ہے کہ مصنف لکھ رہا ہے ''ان لوگوں کے لیے جو یونانی زبان بولتے ہیں لیکن پھر بھی یہودیوں کے طور طریقوں اور آرامی زبان سے واقف ہے۔''

اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ عالمی ترجمہ کے شارحین کے نزدیک اس انجیل کے ماخذ حسب ذیل ہیں۔

''یہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی تحریر کا کام شام میں اور غالباً انطاکیہ کے مقام پر (.....) یا فنقیہ میں ہوا ہے۔ کیونکہ ان ممالک میں بے شمار یہودی آباد تھے (....) ہمیں عبادت گاہ کی کٹر یہودیت اور فریسوں کے خلاف ایک ایسے ہی مناظرے کے شواہد ملتے ہیں۔ جس طرح کے جامنا کے مقام پر ۸۰ء کے قریب صیہونیتی اسمبلی میں رونما ہوئے تھے۔'' ان حالات میں ایسے بہت سے مصنفین

ہیں جو اناجیل میں سب سے پہلی کا تعین ۸۰۔۹۰ کے لگ بھگ کرتے ہیں، غالباً اس سے بھی کچھ پہلے کا۔ اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہمیں مصنف کا صحیح نام معلوم نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں ان چند خاکوں پر مطمئن ہو جانا پڑے گا جو خود انجیل میں دیئے گئے ہیں۔ مصنف کو خود اس کے پیشے سے پہچانا جا سکتا ہے۔ وہ یہودی تحریرات اور روایات کا ماہر ہے۔ وہ اپنی قوم کے مذہبی رہنماؤں کو جانتا، ان کی عزت کرتا۔ لیکن سختی سے اس کو چیلنج کرتا ہے۔ وہ تعلیم و تلقین کے فن میں مہارت رکھتا ہے اور اپنے سامعین کے لیے یسوع مسیح کی باتوں کو قابل فہم بنانے کا اس کو ملکہ ہے۔ وہ اپنی تعلیمات کے عملی نتائج پر ہمیشہ زور دیتا ہے۔ وہ ایک پڑھے لکھے یہودی کے جس نے عیسائیت قبول کر لی ہو، واقعات کو نہایت خوبی سے منضبط کر دیتا ہے۔ جیسا کہ متی کا بیان ہے گھر کا مالک ''جو اپنے خزانہ میں سے نئی اور پرانی چیزیں نکالتا ہے۔'' (۵۲:۱۳) یہ کا پورناؤم کے اس سول ملازم سے نہایت بعید بات ہے جس کو مرقس اور لوقا، لیوی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جو بارہ حواریوں میں شامل ہو چکا ہے۔

ہر شخص اس خیال سے متفق ہے کہ متی نے ان کے ہی ماخذوں کو کام میں لا کر انجیل لکھی جن کو مرقس اور لوقا کام میں لائے۔ ان کا بیان جیسا کہ ہم دیکھیں گے کئی ضروری نکات میں مختلف ہے۔ اس کے باوجود متی نے مرقس کی انجیل سے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔ حالانکہ موخر الذکر یسوع مسیح کے حواریوں میں سے نہیں تھے (اوکلمان)

متی متن کے سلسلہ میں بے انتہا آزادی کو کام میں لاتے ہیں۔ اس بات کو ہم

اس وقت دیکھیں گے جب ہم یسوع مسیح کے نسب نامہ کے سلسلہ میں عہد نامہ قدیم پر بحث کریں گے، جو ان کی انجیل میں شروع ہی میں مذکور ہے۔ وہ اپنی کتاب میں ایسے بیانات درج کرتے ہیں جو لفظاً قطعاً ناقابل یقین ہیں۔ یہ وہ صفت ہے جو اس کتاب میں استعمال کی گئی ہے جس کا حوالہ صدر میں فادر کینن ڑی ایسے نے اس موقع پر دیا ہے جب وہ رفع مسیح کے سلسلہ میں ایک حواری کا تذکرہ کر رہے تھے۔ یہ محافظ دستہ کے حواری تھے۔ وہ اس قصہ کے ناممکن ہونے کو بتا رہے تھے جو میں مقبرہ پر متعین فوجی محافظین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ''یہ غیر بھرتی شدہ سپاہی'' جو'' اپنے مذہبی سرداروں کو نہیں بلکہ ان اعلیٰ پادریوں کو رپورٹ دیتے ہیں جو ان کو کذب بیانی کا معاوضہ ادا کرتے ہیں۔'' لیکن وہ یہ بھی بتا دیتے ہیں ''کسی کو ان پر ہنسنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ متی کا مقصد انتہائی سنجیدگی پر مبنی تھا۔ وہ زبانی روایت سے قدیم مواد لے کر اپنی تحریر میں داخل کر لیتے ہیں تاہم یہ مخلوط عبارت یسوع مسیح کی شایان شان ہے۔''

ہمیں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ متی کے بارے میں یہ ایک مشہور عالم دین کی شہادت ہے جو پیرس کے کیتھولک عقیدہ کے ایک ادارے میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ (انسی تو کا تیولیک دپاری)

متی اپنے بیان میں ان واقعات کا ذکر کرتے ہیں جو حضرت عیسیٰ کی رحلت کے ساتھ رونما ہوئے۔ یہ ان کے قیاس کی ایک اور مثال ہے۔

''اور دیکھو۔ مقدس پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور زمین لرزی اور چٹانیں تڑک گئیں اور قبریں کھل گئیں۔ اور بہت سے جسم ان مقدسوں

کے جو سو گئے تھے جی اٹھے اور اس کے جی اٹھنے کے بعد قبروں سے نکل کر مقدس شہر میں گئے اور بہتوں کو دکھائی دیئے۔''

متی کی انجیل سے یہ اقتباس (۲۷: ۵۱۔۵۳) ایسا ہے جس کا متناظر ٹکڑا کسی دوسری انجیل میں موجود نہیں ہے۔ یہ بات سمجھنا مشکل ہے کہ زیر بحث سینٹس کی جماعت حضرت عیسیٰؑ کی رحلت کے ٹھیک بعد سے کیسے وجود میں آ گئی (اناجیل کے بموجب یہ واقعہ سبت کے موقع پر رونما ہوا) اور رفع مسیح کے بعد وہ اپنے مقبروں سے ابھرے (اسی ماخذ کے مطابق یہ واقعہ سبت کے اگلے دن ہوا)۔

سب سے زیادہ قابل غور ناممکن بات غالباً متی کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ ان تمام باتوں کی توجیہ کرنا، جو اناجیل کے مصنفین کے دعویٰ کے بموجب حضرت عیسیٰؑ سے کہیں، تقریباً دشوار ہے۔ وہ باب ۱۲ آیات ۳۸۔۴۰ میں یوحنا کی علامت کے بارے میں واقعہ کو بیان کرتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ اس وقت ان کاہنوں اور فریسیوں کے درمیان موجود تھے، جب ان لوگوں نے آپ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں مخاطب کیا۔

''اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں۔'' اس نے جواب دے کر ان سے کہا۔ ''اس زمانے کے برے اور زناکار لوگ نشان طلب کرتے ہیں لیکن یوناہ نبی (حضرت یونسؑ) کے نشان کے سوا کوئی نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ یوناہ تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ ویسے ہی ابن آدم تین دن اور تین رات زمین کے اندر رہے گا۔''

لہٰذا حضرت عیسیٰؑ یہ اعلان فرماتے ہیں کہ وہ تین دن اور تین رات زمین کے

اندر رہیں گے۔ چنانچہ متی، لوقا اور مرقس کی ہمنوائی میں حضرت عیسیٰ کی رحلت اور تدفین کو سبت کی شام میں ہونا قرار دیتے ہیں۔ اس سے وہ وقت جو زمین کے اندر گزرا یقیناً تین دن ہوتا ہے (یونانی متن میں، ترے ایس ایمر اس ہے'') لیکن یہ مدت صرف دو راتوں پر مشتمل ہو سکتی ہے نہ کہ تین پر (یونانی متن میں ترے ایس نوکتا س ہے) (۲)

انجیل کے شارحین اکثر اس واقعہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تاہم فادر روگے اس غیر امکانی بات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جب وہ یہ بات بتاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ''قبر میں رہے تین دن (ان میں سے ایک چیز مکمل) اور دو راتیں (۳)۔'' لیکن وہ اس بات کا اضافہ کرتے ہیں۔ ''یہ ایک بندھا ٹکا محاورہ ہے اور اس کا مطلب حقیقتاً تین یوم ہوتا ہے۔'' یہ بات دیکھ کر پریشانی ہوتی ہے کہ شارحین ایسے دلائل پیش کرنے پر اتر آتے ہیں جن کا کوئی مثبت مفہوم نہیں ہوتا۔ عقلی اعتبار سے یہ کہنا زیادہ اطمینان بخش ہوگا کہ اس قسم کا ایک واضح سہو کسی کاتب کی غلطی کا نتیجہ ہے۔

ان ناممکنات سے ہٹ کر جو چیز متی کی انجیل کو سب سے زیادہ ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ انجیل ایک یہودوی عیسائی فرقہ کی تحریر ہے جو اس دوران وجود میں آئی جب یہ فرقہ عہد نامہ قدیم کے ساتھ وابستہ رہ کر یہودیت سے رسے تڑا رہا تھا۔ یہودوی عیسائی تاریخ کے نقطہ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔

مرقس کی انجیل (۴)

اناجیل اربعہ میں یہ سب سے مختصر ہے۔ یہ قدیم ترین بھی ہے لیکن اس کے باوجود یہ حواری کی لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے زیادہ سے زیادہ اس کو ایک حواری کے شاگرد نے قلمبند کیا ہے۔

اوکلمان نے لکھا ہے کہ میں مرقس کو یسوع کا شاگرد نہیں سمجھتا۔ اس اعتراف کے باوجود مصنف ان لوگوں کو بتاتا ہے، جو اس انجیل کا انتساب مرقس حواری سے کرنے کی غلطی کرتے ہیں کہ "متی اور لوقا اس انجیل کو اس طور پر کام میں نہ لاتے جس طرح وہ اس کو کام میں لائے ہیں۔ اگر ان کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ حقیقتاً ایک حواری کی تعلیمات پر مبنی ہے۔" یہ استدلال کسی طرح بھی فیصلہ کن نہیں ہے اوکلمان ان تحفظات کی حمایت میں جو وہ یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ میں عہد نامہ جدید سے اکثر اوقات کسی ایک شخص یوحنا اور المعروف بہ مرقس کے اقوال کا حوالہ دیتا ہوں۔ لیکن یہ اقتباسات انجیل کے کسی مصنف کے نام کا حوالہ نہیں پیش کرتے ہیں اور مرقس کا متن خود بھی کسی مصنف کا نام نہیں ظاہر کرتا۔

اس نکتہ پر معلومات کا فقدان شارحین کو ان تفصیلات کے بیان کرنے کی طرف لے گیا کہ جو قدرے نامعقول معلوم ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ عذر پیش کر کے کہ مرقس ہی تنہا مصائب مسیح کے تذکرہ میں اس نوجوان کا قصہ بیان نہیں کرتے جس کے جسم پر ململ کے ایک کپڑے کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اور جب وہ پکڑا گیا تو ململ کا وہ کپڑا بھی وہیں چھوڑا، اور برہنہ ہی فرار ہو گیا (مرقس

۱۴،۱۵،۵۲) وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ نوجوان یقیناً مرقس ہی ہوگا۔ ''وہ تابعدار شاگرد جس نے اپنے استاد کی اتباع کرنے کی کوشش کی۔'' (عالمی ترجمہ) دوسرے شارحین اس ''ذاتی عادداشت کو اس استاد کی ایک علامت اور ایک نامعلوم نشان'' محسوس کرتے ہیں ''اس سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ وہ ایک عینی شاہد تھا۔'' (اوکلمان)

اوکلمان کا خیال ہے کہ ''ترکیب الفاظ کی کافی الٹ پھیر سے اس کلیہ کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مصنف ایک یہودی تھا۔'' لیکن لاطینی کی عبارتوں سے اس بات کی نشان دہی ہوسکتی ہے کہ اس نے اپنی انجیل روم میں بیٹھ کر تحریر کی تھی۔ ''اس کے علاوہ وہ ان عیسائیوں سے خطاب کرتا ہے جو فلسطین میں نہیں رہ رہے ہیں اور اس بات کی احتیاط رکھتا ہے کہ جو آرامی عبارتیں وہ استعمال کرتا ہے ان کی تشریح کر دے۔''

روایت کافی الحقیقت یہ رجحان ہے کہ وہ مرقس کو روم کے مقام پر پطرس کے ساتھیوں میں بتائے۔ اس کی بنیاد پطرس کے پہلے خط کے آخری حصے پر ہے۔ (ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ وہ واقعی مصنف تھا) پطرس نے اپنے خط میں تحریر کیا۔ ''بابل کے مقام پر موجود فرقہ جو اسی طرح انتخاب کیا ہوا ہے تمہیں مبارکباد دیتا ہے۔ اور اسی طرح میرا بیٹا مرقس بھی تبریک پیش کرتا ہے۔'' ''بابل سے، جس سے غالباً روم مراد ہے۔'' ہم عالمی ترجمہ کی شرح میں پڑھتے ہیں اس سے اس وقت شارحین یہ نتیجہ اخذ کرنے میں خود کو حق بجانب خیال کرتے ہیں کہ مرقس جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پطرس کے ساتھ روم میں تھا وہی

انجیل کا مرتب تھا...... یہ امر موجب حیرت ہے کہ استدلال کا یہ وہ انداز تو نہیں ہے جو ہیراپولس کے بشپ پاپیاس کو ۱۵۰ء کے لگ بھگ اس انجیل کو پطرس کے ترجمان اور پال کے امکانی شریک کار مرقس سے منسوب کرنے کی جانب راجع ہوا تھا۔

اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مرقس کی انجیل کی تدوین کے کام کو پطرس کی وفات کے بعد قرار دیا جا سکتا ہے، جو عالمی ترجمہ کے مطابق ۶۲ء اور ۷۰ء کے درمیان کا اور راو کلمان کے بموجب ۷۰ء کے لگ بھگ کا زمانہ ہے۔

خود متن سے واضح طور پر ایک بڑی کوتاہی کی نشان دہی ہوتی ہے۔ یہ تاریخی ترتیب کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ اس لیے مرقس اپنی تحریر کے شروع میں (۱:۱۶، ۲۰) ان چار ماہی گیروں کے واقعہ کو جن کو یسوع مسیح اپنے اتباع پر آمادہ کرتے ہیں۔ محض اتنا کہہ کر ختم کر دیتے ہیں۔ ''میں تمہیں انسانوں کو قابو میں کرنے والا بناؤں گا۔'' حالانکہ وہ لوگ ان کو (حضرت یسوع مسیح کو) جانتے تک نہیں۔ انجیل کا مرتب دوسری باتوں کے ساتھ بظاہر معقولیت کے مکمل فقدان کو ظاہر کرتا ہے۔

جیسا کہ فادر روگے نے کہا ہے ''مرقس ایک بے سلیقہ مصنف ہے۔ انجیل کے مرتبین میں کمزور ترین ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کسی بیان کو کس طرح قلم بند کیا جائے۔'' یہ شارح اپنے اس جائزہ کو ایک عبارت دے کر تقویت پہنچاتا ہے۔ یہ عبارت اس بارے میں ہے کہ بارہ حواریوں کا انتخاب کیسے عمل میں لایا گیا۔

یہاں ایک لفظی ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

''اور پھر وہ پہاڑ پر چڑھ گیا اور جن کو وہ آپ چاہتا تھا ان کو پاس بلایا اور وہ اس کے پاس چلے آئے اور اس نے بارہ کو مقرر کیا تاکہ وہ اس کے ساتھ رہیں اور وہ ان کو بھیجے کہ تبلیغ کریں اور بدروحوں کو نکالنے کا اختیار رکھیں اور اس نے بارہ کو بنایا اور شمعون کا نام پطرس رکھا۔'' (مرقس ۳:۱۳۔۱۶)

وہ متی اور لوقا کی تردید کرتا ہے جیسا کہ صدر میں پہلے ہی یونس (یوناہ) کے نشان کے سلسلے میں دیکھا جا چکا ہے۔ نشانوں کے موضوع پر جو یسوع نے اپنے مشن کے سلسلہ میں لوگوں کو دیئے تھے مرقس (۸:۱۱۔۱۳) ایک ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو بہ مشکل ہی قابل یقین کہا جا سکتا ہے۔

''پھر فریسی نکل کر اس سے بحث کرنے لگے اور اس کو آزمانے کے لیے اس سے کوئی آسمانی نشان طلب کیا۔ اس نے اپنی روح میں آہ کھینچ کر کہا، اس زمانے میں لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہیں دیا جائے گا اور وہ ان کو چھوڑ کر پھر کشتی میں بیٹھا اور پار چلا گیا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اقرار خود یسوع مسیح کی جانب سے اپنے اس عزم و ارادہ کے سلسلہ میں ہوا ہے کہ آپ کسی ایسے عمل کا وعدہ کریں جو مافوق الفطرت اور اعجاز ہو۔ اس لیے عالمی ترجمہ کے شارحین جو اس بات پر حیرت زدہ ہیں کہ لوقا تو کہتے ہیں کہ یسوع مسیح صرف ایک نشان دیں گے (وہ نشان یونس یا یوناہ کا ہے، دیکھئے متی کی انجیل) وہ اس بات کو متناقص قرار دیتے ہیں کہ مرقس یہ کہیں: اس

زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان نہیں دیا جائے گا۔اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھتے ہیں، حضرت یسوع مسیح خود بطور نشان معجزات پیش کرتے ہیں (لوقا، ۷۔۲۲۰ (۵) اور ۱۱۔۲۰) (۶)

مرقس کی انجیل کو مجموعی طور پر قانونی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا ہے۔ پھر بھی مرقس کی انجیل کے آخری حصے (۱۹:۱۶۔۲۰) کے بارے میں جدید مصنفین کی رائے یہ ہے کہ یہ اصل کتاب میں الحاق کیا گیا ہے۔ عالمی ترجمہ اس کے بارے میں بالکل صریح اور واضح ہے۔

یہ آخری خبر انجیل کے دو قدیم ترین مکمل مخطوطات میں شامل نہیں ہے۔ یعنی مخطوطہ ویٹ کن اور مخطوطہ سینٹی کس جن کا زمانہ چوتھی صدی عیسوی کا ہے۔ اوکلمان اس موضوع کے بارے میں بیان کرتے ہیں ''زیادہ جدید یونانی مخطوطات اور اس نقطہ پر بعض اختلافات نے ظہور سے متعلق ایک ایسے نتیجہ کا اضافہ کردیا جو مرقس کی انجیل سے نہیں بلکہ دوسری اناجیل سے اخذ کیا گیا ہے۔ حقیقت میں آخری اضافوں کے یہ متون نہایت کثیر ہیں۔ متون میں طویل وقصیر عبارتیں دونوں بائبل، نظر ثانی شدہ معیاری اشاعت ۱۹۵۲ء میں دہرائی گئی ہیں۔ بعض اوقات طویل عبارت میں کچھ اضافی مواد ہے۔

فادر کینن جی اے خاتمۃ الکتاب پر حسب ذیل تبصرہ کرتے ہیں۔ ''آخری آئتیں اس وقت دبا دی گئی ہوں گی جب کہ اس کے کام کو (یا اس کے عمومی نسخے کو) سرکاری طور پر اس فرقہ نے قبول کیا، جس نے اس کی صداقت وحقانیت کی ضمانت دی، نہ متی نے، نہ لوقا نے اور نہ یوحنا نے اس گمشدہ حصہ کو دیکھا تا ہم یہ خلا

نا قابل قبول رہا۔ ایک طویل مدت کے بعد جب متی، لوقا اور یوحنا کی تحریریں جو تمام کی تمام اسی جیسی تھیں، اشاعت پذیر ہوئیں۔ اس وقت مرقس کی انجیل میں ایک موزوں خاتمہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس کے اجزاء ان ماخذوں سے لیے گئے جو دوسری انجیلوں میں موجود تھے۔ مرقس کی انجیل کا جائزہ لے کر ان تمام اجزاء کو بہ آسانی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ (۹:۱۶۔۲۰) اس سے بھی زیادہ واضح تصور اس آزاد طریقہ کا جس میں انجیلوں کے مضمون کے بیان کرنے کا یہ ادبی طرز دوسری صدی عیسوی کے آغاز سے چل کر آیا تھا حاصل کیا جا سکتا ہے۔''

یہاں ہمارے لیے اس بات کا کتنا کھلا اعتراف موجود ہے کہ ایک عظیم ماہر دینیات کے خیال میں صحیفوں کے متن میں انسانوں کی کی ہوئی قطع و برید موجود ہے۔

لوقا کی انجیل (۷)

اوکلمان کے نزدیک لوقا کی حیثیت ایک وقائع نگار کی ہے اور فادر کینن جی اے کے بقول ان کی حیثیت ایک حقیقتی ناول نگاہ کی ہے۔ تمہید میں تھیوفیلس کو مخاطب کر کے لوقا اس امر سے آگاہ کرتے ہیں کہ میں خود ان دوسرے حضرات کی پیروی کرتے ہوئے جنہوں نے یسوع مسیح کے بارے میں واقعات قلمبند کیے ہیں، ان حقائق کا بیان ضبط تحریر میں لا رہا ہوں جس میں عینی شاہدوں کے بیانات اوران کی فراہم کردہ معلومات کو کام میں لایا جا رہا ہے...... یہ اشارہ دیتے ہوئے کہ میں خود عینی شاہدوں میں نہیں ہوں...... اس میں وہ معلومات شامل ہیں جو رسولوں کے مواعظ سے حاصل ہوئی ہیں لہٰذا یہ ایک باقاعدہ ادب پارہ ہے جس کو وہ خود حسب ذیل انداز میں پیش کرتے ہیں۔

''چونکہ بہت سے لوگوں نے اس امر پر کمر باندھی ہے کو جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں۔ جیسا کہ انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے سننے والے تھے ان کو ہم تک پہنچایا، اس لیے اے معزز تھیوفیلس میں نے بھی مناسب جانا کہ سب باتوں کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کر کے ان کو تیرے لیے ترتیب سے لکھوں تا کہ جن باتوں کی تو نے تعلیم پائی ہے، ان کی پختگی تجھے معلوم ہو جائے۔''

پہلی ہی سطر سے وہ تمام باتیں معلوم کی جا سکتی ہیں جو لوقا کو ''روئی دھنکنے والے'' مرقس سے جدا کرتی ہیں جس کی کتاب کا ہم ابھی ابھی حوالہ دے چکے ہیں

۔لوقا کی انجیل مسلسل طور پر ایک ادبی تحریر ہے جو نیم وحشی انداز سے ہٹ کر کلاسیکی یونانی میں لکھی گئی ہے۔

لوقا ایک مہذب صابی تھے جو تبدیل مذہب کر کے عیسائیت میں داخل ہوئے۔ یہودیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ پوری طرح واضح ہے، جیسا کہ اوکلمان اشارہ کرتے ہیں۔ لوقا، مرقس کی انتہائی یہودوی آیتوں کو ترک کر دیتے ہیں اور حضرت عیسیٰ مسیح کے الفاظ پر یہودیوں کی بے اعتقادی کو نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں اور سامریوں کے ساتھ جن کو یہودی ذلیل سمجھتے ہیں اپنے اچھے تعلقات کو ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری طرف متی، یسوع مسیح کی زبانی حواریوں کو یہ ہدایت کراتے ہیں کہ وہ ان سے گریز اختیار کریں۔ یہ ان بہت سی واضح مثالوں میں سے ایک ہے جن سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ انجیل کے مرتبین حضرت عیسیٰ سے وہی بات کہلواتے ہیں جو ان کے اپنے ذاتی نظریہ کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ غالباً خلوص نیت سے ایسا کرتے تھے۔ وہ حضرت عیسیٰ کے الفاظ کا وہی مفہوم ہمیں بتاتے ہیں جو ان کے فرقہ کے نقطہ نظر سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس شہادت کی موجودگی میں اس بات سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ انجیلیں مناظراتی تحریریں ہیں یا ایسی تحریریں ہیں جو کسی موقع اور محل کی مناسبت سے وجود میں لائی گئی ہیں، جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ لوقا کی انجیل اور متی کی انجیل کے عام لہجہ کے درمیان موازنہ اس اعتبار سے ایک اچھا ثبوت ہے۔

لوقا کون تھے؟ ان کو اسی نام کے ان طبیب سے جن کا سینٹ پال نے اپنے کئی خطوط میں حوالہ دیا ہے، ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ عمومی ترجمہ میں بتایا گیا

ہے کہ بہت سے شارحین کے نزدیک اس انجیل کے مصنف کے پیشۂ طبابت کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ بیماریوں کے متعلق صحت اور قطعیت سے گفتگو کرتا ہے۔ یہ تشخص فی الحقیقت انتہا سے زیادہ مبالغہ آمیز ہے۔ لوقا کے بارے میں سچ پوچھئے تو وہ ''اس نوع کی باتیں بیان نہیں کرتے۔'' ''جو الفاظ و اصطلاحات وہ استعمال کرتے ہیں وہ ایسی ہیں جو اس زمانہ کا کوئی بھی مہذب آدمی استعمال کرتا تھا۔'' ایک لوقا وہ بھی تھا جو سینٹ پال کا شریک سفر رہا۔ لیکن کیا یہ (لوقا) وہی شخص ہے؟ اوکلمان کا خیال ہے کہ یہ وہی ہے۔

لوقا کی انجیل کے زمانہ کا اندازہ کئی عوامل سے لگایا جا سکتا ہے۔ لوقا نے مرقس اور متی کی انجیلوں سے کام لیا ہے۔ ہم جو کچھ عالمی ترجمہ میں پڑھتے ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ۷۰ء میں ٹیٹس (۸) کی فوجوں کے ہاتھوں یروشلم کے محاصرہ اور اس کی تباہی کا منظر اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ انجیل کا زمانہ غالباً اس سنہ کے بعد کا ہے۔ آجکل کے ناقد اس زمانہ کا تعین اس طرح کرتے ہیں کہ یہ تقریباً ۹۰۔۸۰ء میں لکھی گئی۔ لیکن بعض حضرات زمانہ کا تعین اس سے بھی قبل کا کرتے ہیں۔

لوقا کی انجیل کا موازنہ جب ان کے پیشروؤں سے کرتے ہیں تو بہت سے بیانات میں اہم اختلافات دکھائی دیتے ہیں۔ اس چیز کا ایک خاکہ پیشگی دیا جا چکا ہے۔ عمومی ترجمہ میں ان اختلافات کو صفحات ۱۸۱ وغیرہ پر ظاہر کیا گیا ہے۔ اوکلمان اپنی کتاب ''عہد نامۂ جدید'' (لونووے تیتاماں) صفحہ ۱۸ پر لوقا کی انجیل سے وہ تحریریں نقل کرتے ہیں، جو کسی دوسری جگہ دکھائی نہیں دیتیں، اور وہ غیر وقیع

جزوی نکات سے متعلق نہیں ہیں۔

یسوع مسیح کے بچپن کے حالات لوقا کی انجیل میں عجیب وغریب ہیں۔ متی یسوع مسیح کے بچپن کو لوقا سے مختلف طریقے پر بیان کرتے ہیں اور مرقس اس کا بالکل ذکر ہی نہیں کرتے۔

متی اور لوقا دونوں یسوع مسیح کے نسب نامے ایک دوسرے سے مختلف بتاتے ہیں اور سائنسی نقطہ نظر سے اختلافات اتنے زیادہ اور ناممکنات کا احاطہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کتاب کا ایک مخصوص باب اسی موضوع کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ اس بات کی تشریح کرنا تو آسان ہے کہ متی جن کا تخاطب یہودیوں سے تھا وہ نسب نامہ کی ابتدا حضرت ابراہیمؑ سے کرتے اور حضرت داؤدؑ کو اس میں شامل کرتے اور یہ کہ لوقا چونکہ ایک نو عیسائی صابی تھے انہیں اس سے پہلے سے شروع کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ہم دیکھیں گے کہ دونوں نسب نامے حضرت داؤدؑ سے آگے چل کر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ حضرت یسوع مسیح کے مشن کو لوقا، متی اور مرقس نے بہت سے مقامات پر ایک دوسرے سے مختلف بتایا ہے۔

عیسائیوں کے نقطہ نظر سے اس قدر اہمیت کا ایک واقعہ جیسا کہ عشائے ربانی کا قانون ہے، لوقا اور باقی دو انجیلوں کے مرتبین (۹) کے درمیان اختلافی دکھائی دیتا ہے۔ فادر روگے اپنی کتاب ''انجیل کے لیے ابتدائیہ'' (افی تیاسیوں آلیوانژلی) میں صفحہ ۷۶ پر بیان کرتے ہیں کہ عشائے ربانی کی رسم میں جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ متی کی انجیل (۲۶: ۲۶۔۲۹) کے الفاظ (۱۰) سے لوقا کے یہاں مختلف طریقہ پر بیان کیے گئے ہیں (۲۲: ۱۹۔۲۴) اور مرقس کے (۱۱) یہاں (۱۴:

۲۲۔۲۴) تقریباً وہی ہیں۔ (۱۲) وہ لکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف لوقا سے جو جو الفاظ منتقل ہوکر آئے وہ بعینہٖ وہی ہیں جو سینٹ پال نے ادا کیے تھے۔ (کرنتھیوں کے نام پہلا خط ۱۱، ۲۳۔۲۵) (۱۳)

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے لوقا نے اپنی انجیل میں رفع مسیح کے موضوع پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان سے مختلف ہے جو وہ رسولوں کے اعمال میں بیان کرتے ہیں۔ لوقا کو ان (اعمال) کا مصنف سمجھا جاتا ہے اور یہ عہد نامہ جدید کا جزو لاینفک ہیں۔ انجیل میں رفع مسیح کے واقعہ کو ایسٹر کے دن قرار دیتے ہیں اور اعمال میں چالیس دن بعد ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اس تضاد اور اختلاف نے عیسائی ماہرین کو تشریحات و تفاسیر میں کیسی عجیب تاویلات کرنے کی طرف مائل کیا ہے۔

شارحین جو معروضی طریقہ اختیار کرنے کے خواہشمند تھے جیسے کہ بائبل کے عالمی ترجمہ کے شارحین۔ وہ ایک عام اصول کے طور پر یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ لوقا کے لیے ''خاص کام یہ نہیں تھا کہ وہ حقائق کو پوری صحت کے ساتھ بیان کریں۔'' جب فادر کینن ڑی ایسے رسولوں کے اعمال کے بیانات کا جو خود لوقا نے تحریر کیے ہیں، یسوع کے بارے میں اسی قسم کے رفع مسیح کے واقعات کے بیان سے جو پال کا مرتبہ ہے، مقابلہ کرتے ہیں تو وہ لوقا کے بارے میں حسب ذیل رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ''لوقا چاروں انجیلوں کے مرتبین میں سب سے زیادہ حساس اور ادبی ذوق رکھنے والے ہیں اور ان میں ایک حقیقی ناول نویس کی جملہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔''

یوحنا کی انجیل (۱۴)

یوحنا کی انجیل بنیادی طور پر باقی تین سے بالکل مختلف ہے۔ یہ اختلاف حقیقت میں اس حد تک ہے کہ فادر روگے اپنی کتاب "انجیل کا ابتدائیہ" میں باقی تین پر تبصرہ کرنے کے فوراً بعد چوتھی انجیل کے لیے چونکا دینے والا بیان پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کو "ایک مختلف دنیا" قرار دیتے ہیں۔ واقعی یہ ایک منفرد کتاب ہے۔ ترتیب میں مختلف، موضوع کے انتخاب میں مختلف، بیان اور زبان میں مختلف، طرز بیان۔ جغرافیہ، نسب نامہ میں مختلف، یہاں تک کہ دینی تصورات و نظریات میں بھی اختلافات موجود ہیں (اوکلمان) چنانچہ یوحنا نے یسوع مسیح کے الفاظ کو بھی دیگر انجیل کے مرتبین سے مختلف طریقہ پر درج کیا ہے۔ اس معاملے میں فادر روگے کا بیان ہے کہ جہاں پہلے تین مرتبین انجیل (سنوپٹکس) (۱۵) یسوع کے الفاظ کو ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں جو جاذب توجہ اور روایتی طرز سے قریب تر ہے وہیں یوحنا کے ہاں سب کچھ تخیلی ہے۔ اس حد تک ترغیب و تحریص دینے والا کہ "بعض اوقات ایسے شخص اچنبھے میں پڑ جاتا ہے کہ کیا یسوع اب بھی ہمکلام ہو رہے ہیں یا ان کے خیالات غیر محسوس طور پر انجیل کے مرتب کے اپنے خیالات کے ذریعہ توسیع تو نہیں پا گئے ہیں۔"

مصنف کون تھا؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے۔ اور اس موضوع پر انتہائی مختلف رائیں پیش کی گئی ہیں۔

اے ٹریسٹ اور فادر روگے ایک ایسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جن کے

اس بارے میں ذرہ بھر شک وشبہ نہیں ہے کہ یوحنا کی انجیل ایک عینی شاہد کا کام دیتی ہے۔ اس کے مصنف یوحنا بن زبیدی ہیں جو جیمس کے بھائی ہیں۔ اس حواری کے بارے میں بہت سی تفصیلات معلوم ہیں اور کتابوں میں عام اشاعت کے لیے درج کی گئی ہیں۔ عام تصاویر میں انہیں یسوع کے بہت قریب دکھایا جاتا ہے جیسا کہ دور ابتلا سے قبل آخری دعوت کے موقع پر اس بات کا کون تصور کرسکتا ہے کہ یوحنا کی انجیل ان یوحنا حواری کی تصنیف نہیں ہے جو اس قدر مانوس شخصیت کے مالک ہیں۔

یہ حقیقت کہ چوتھی انجیل اس قدر تاخیر سے لکھی گئی۔ اس رائے کے خلاف ایک اہم دلیل نہیں ہے اس کا فیصلہ کن نسخہ غالباً پانچویں صدی عیسوی کے اختتام کے لگ بھگ لکھا گیا۔ وقت کا یہ تعین کرنا کہ یہ یسوع سے ساٹھ سال بعد تحریر کیا گیا اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ حواری حضرت یسوع کے وقت میں نہایت نوعمر تھے اور ان کا سن تقریباً سو سال کا ہوا۔

فادر کینن ڈی ایسے اپنی تصنیف ''رفع مسیح کا مطالعہ'' میں اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عہد نامہ جدید کے مصنفین میں سے سوائے پال کے اور کوئی بھی رفع مسیح کے عینی شاہد ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ تاہم یوحنا نے ظہور کے متعلق کئی حواریوں کے ایک مجمع کو جس کا غالباً وہ ایک رکن تھا طامس کی غیر حاضری میں بتایا (۲۰:۱۹۔۲۴) پھر آٹھ دن بعد حواریوں کے مکمل اجتماع کے سامنے بیان کیا۔ (۲۰:۲۵۔۲۹)

اوکلمان اپنی تصنیف ''عہد نامہ جدید'' میں اس نظریہ کی حمایت نہیں کرتے۔ بائبل کے عالمی ترجمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ناقدین کی اکثریت اس مفروضہ کو تسلیم

نہیں کرتی کہ انجیل یوحنا نے تحریر کی ہے۔ اگر چہ امکان کو کلیتۃً مسترد نہیں کیا جا سکتا۔غرض ہر چیز اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ جو متن اس وقت ہمارے علم میں ہے اس کے کئی مصنفین ہیں۔ غالب گمان ہے کہ انجیل جس شکل میں آج ہے مصنف کے شاگردوں کے درمیان چکر لگاتی رہی ہو جنہوں نے باب ۲۱ اور اسی طرح کئی امکانی تحشیے (یعنی ۲۰۴ اور ۴:۱۰۴:۴۴۰۷:۳۷۰۱۱:۲۰۱۹:۳۵) کا اضافہ کیا ہو۔ جہاں تک کہ بدکار عورت کا تعلق ہے (۷۰۵۸۰_۱۱۸۰) ہر شخص اس بات پر متفق ہے کہ یہ ایک ایسا ٹکڑا ہے جس کا ماخذ نامعلوم ہے اور بعد میں داخل کیا گیا ہے (لیکن پھر بھی مستند صحیفہ سے تعلق رکھتا ہے) پارہ ۱۹:۳۵ ایک عینی شاہد کے دستخط کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ (اوکلمان) جو یوحنا کی تمام انجیل میں صرف ایک ہی علیحدہ دستخط ہیں لیکن شارحین کو یقین ہے کہ یہ بعد میں ایزاد کیے گئے ہیں۔

اوکلمان کا خیال ہے کہ اس انجیل میں بعد کے اضافے بالکل ظاہر ہیں۔ جیسے باب ۲۱ جو غالباً حواری کے کسی ایک شاگرد کا کام ہے جس نے انجیل کے اصل متن میں خفیف سی تبدیلیاں خاصی تعداد میں کی ہیں۔

ان تمام نظریات و مفروضات کا حوالہ دینا ضروری نہیں ہے جو ماہرین نے تفسیروں میں بتائے ہیں۔ جو ریمارک عیسائی مذہب کے نہایت سربرآوردہ مصنفین نے چوتھی انجیل کے مرتب کے سوالات پر کیے ہیں اور جو یہاں درج کیے جا چکے ہیں وہ یہ بات بتانے کے لیے کافی ہیں کہ اس کی ترتیب و تالیف کے موضوع کے سلسلہ میں کس قدر الجھن پائی جاتی ہے۔

یوحنا کے بیان کردہ قصوں کی تاریخی قدروقیمت بڑی حد تک بحث اور نزاع کا

موضوع بن چکی ہے۔ ان قصوں اور دوسری تین انجیلوں میں تناقض قطعاً بدیہی ہے .... اس کے لیے ایک وضاحت پیش کرتے ہیں۔ وہ یوحنا کے یہاں دوسری انجیلوں کے مصنفین سے مذہب کا ایک مختلف نظریہ بتاتے ہیں۔ یہ مقاصد قصوں کے انتخاب کو ان الفاظ سے مختلف کر دیتے ہیں۔ جو درج کیے گئے ہیں۔ نیز اس طریقے سے پھیر دیتے ہیں جس میں وہ بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح مصنف اکثر ان خطوط کو طول دے دیتا اور تاریخ یسوع سے وہی کچھ کہلواتا ہے جو روح القدس نے خود ان پر القا کیے تھے۔" تفسیر زیر غور کے لیے یہ وہ دلیل ہے جو تضاد کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہے۔

یہ امر یقیناً قابل فہم ہے کہ یوحنا نے جنہوں نے دوسری انجیلوں کے مصنفین کے بعد لکھنا شروع کیا اپنے لیے بعض ایسے قصے منتخب کر لیے تھے جو ان کے نظریات کی وضاحت کے لیے موزوں و مناسب تھے۔ یہ امر تعجب خیز نہیں ہونا چاہیے کہ بعض بیانات جو دوسری انجیلوں میں شامل ہیں۔ یوحنا کی انجیل میں موجود نہیں۔ عالمی ترجمہ نے ایسی چند مثالوں کی نشاندہی کی ہے (صفحہ ۲۸۲) لیکن بعض خلا بمشکل قابل فہم نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ عشائے ربانی کی رسم کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ایک ایسا واقعہ جو عیسائیت کے لیے اس قدر بنیادی حیثیت رکھتا ہو، یعنی اس کی رسم اس کا ذکر یوحنا جو انجیل کے مصنفین میں اس قدر مستند سمجھے جاتے ہیں بالکل نہ کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ دور ابتدا سے قبل کی دعوت طعام کے ذکر میں وہ خود کو محض حواریوں کے پاؤں دھلانے کے تذکرہ یہوداہ کی غداری اور پطرس کے انکار تک ہی محدود رکھتے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں ایسے قصے موجود ہیں جن میں یوحنا منفرد ہیں اور جو دوسرے تین حضرات کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ عالمی ترجمہ میں ان کا ذکر کیا گیا ہے (صفحہ ۲۸۲) یہاں پھر اس بات پر نظر کی جاسکتی ہے کہ تین مصنفین نے ان قصوں کی وہ اہمیت نہیں سمجھی جو یوحنا نے سمجھی تھی۔ لیکن یہ امر مشکل ہے کہ کوئی شخص اس صورت میں چونک نہ پڑے جب وہ یوحنا کے یہاں یسوع کے ظہور کا تذکرہ دیکھے کہ کیونکر وہ بحیرہ طبریہ کے قریب اپنے حواریوں کے سامنے مردوں میں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے (یوحنا ۲۱، ۱-۱۴) یہ بیان کسی طرح بھی مچھلیاں پکڑنے کے اس معجزہ سے کم نہیں ہے (جس میں متعدد اضافی تفصیلات موجود ہیں) جو لوقا (۶: ۱۰-۱۱) ایک قصہ کے طور پر جو یسوع کی زندگی میں واقعہ ہوا تھا پیش کرتے ہیں۔ اپنے بیان میں لوقا یوحنا حواری کی موجودگی کا حوالہ دیتے ہیں۔ جو روایت کے بموجب انجیل کے ایک مرتب تھے۔ چونکہ یوحنا کی انجیل میں یہ تذکرہ باب ۲۱ کا ایک حصہ ہے جس پر سب کا اتفاق ہے کہ بعد کا اضافہ ہے اس لیے یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ لوقا کے ہاں یوحنا کا حوالہ چوتھی انجیل میں اس کے مصنوعی اضافہ کی دلیل ہے یسوع کی زندگی ایک معلوم تذکرہ کی شکل میں ایک بیان کو ڈھالنے کی ضرورت کسی طرح بھی انجیل کے مصنف کی عبارت کو تحریف سے نہیں بچاسکتی تھی۔

ایک اور اہم نکتہ جس پر یوحنا کی انجیل میں باقی تین سے اختلاف پایا جاتا ہے وہ ہے یسوع کے مشن کی مدت مرقس، متی اور لوقا اس مدت کو ایک سال بتاتے ہیں۔ یوحنا اس کو دو سال پر پھیلا دیتے ہیں۔ اوکلمان اس حقیقت کو نوٹ کرتے

ہیں۔اس موضوع پر عالمی ترجمہ کا بیان حسب ذیل ہے:

”مرقس اور لوقا کی انجیلیں جلیل (گلیلی) کے مقام پر قیام کو طویل بتاتی ہیں، جس کے بعد کوچ ہوتا ہے، جو کم وبیش جودیس کی جانب ممتد ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر کار یروشلم میں ایک مختصر قیام ہوتا ہے۔اس کے برخلاف یوحنا ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی جانب اکثر اسفار کا تذکرہ کرتے ہیں اور جودیس کے مقام پر قیام کو طویل بتاتے ہیں۔خصوصاً یروشلم میں (۱:۱۹۔۵۱، ۲:۱۳۔۳۰، ۵:۱۔۴۷، ۱۴:۲۰۔۳۱) وہ کئی عید مسیح کی تقریبات کا بھی ذکر کرتے ہیں (۲:۱۹، ۵:۱، ۶:۴، ۱۱:۵۶) اور اس طرح ایک دورِ وزارت قرار دیتے ہیں جو دو سال سے زیادہ مدت تک قائم رہا۔“

ان میں سے کس ایک پر کوئی یقین کرے۔۔۔۔مرقس پر، متی پر، لوقا پر یا یوحنا پر؟

انجیلوں کے ماخذ

انجیلوں کا یہ عمومی خاکہ جو یہاں دیا گیا ہے اور جو متون کے تنقیدی جائزہ سے ابھرتا ہے کسی فرد کو بھی ایک ایسے لٹریچر کے بارے میں سوچنے کی جانب مائل کرتا ہے جو ایک ایسے پلان کے ساتھ کاٹا گیا ہے جس میں تسلسل کی کمی ہے اور بظاہر ناقابل عبور تناقض پایا جاتا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو اس فیصلہ میں استعمال ہوئے ہیں جو بائبل کے عالمی ترجمہ کے شارحین نے ان پر نافذ کیا ہے۔ ان کی سند پر غور کرنا ضروری ہے کیونکہ اس مضمون کی جانچ پڑتال کے نتائج نہایت شدید اور اہم ہیں۔ یہ بات پہلے ہی دیکھی جا چکی ہے کہ جس زمانہ میں انجیلیں لکھی گئی تھیں اس وقت کی مذہبی تاریخ سے متعلق بعض تصورات نے کس طرح اس ادب کے کچھ بد حواس کرنے والے پہلوؤں کی تشریح کرنے میں غور و فکر کرنے والے قاری کو مدد دی تھی۔ تاہم ضروری ہے کہ اس بات کو جاری رکھتے ہوئے اس امر کا پتہ لگائیں کہ موجودہ زمانے کی کتابیں ان ماخذوں کے بارے میں کیا اطلاع دیتی ہیں جو اپنے متون کو تحریر کرتے وقت انجیلوں کے مرتبین کام میں لائے تھے۔ یہ جاننا بھی دلچسپ ہو گا کہ آیا متون کی اس وقت کی تاریخ جب وہ قائم کیے گئے تھے بعض ان پہلوؤں کی تشریح میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے جو یہ متون موجودہ زمانے میں پیش کر رہے ہیں۔

کلیسا کو قائم کرنے والوں کے زمانہ میں ماخذوں کے مسئلہ تک رسائی نہایت

سیدھے سادے انداز میں ہوئی تھی۔ عیسائیت کی ابتدائی صدیوں میں وہ واحد ماخذ جو دستیاب تھا انجیل تھی جس کا مکمل مخطوطہ پہلے پہل پیش کیا گیا تھا۔ یعنی متی کی انجیل ۔ ماخذ کا مسئلہ بھی صرف مرقس اور لوقا سے متعلق تھا اس لیے کہ یوحنا کا معاملہ تو بالکل ہی جدا گانہ تھا۔ سینٹ آگسٹائین کا کہنا ہے کہ مرقس جو روایتی ترتیب میں دوسرے نمبر پر آتے ہیں متی سے متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے ان ہی کی کتاب کی تلخیص کر دی تھی ۔ انہوں نے مزید بتایا کہ لوقا نے جو مخطوطات کے اعتبار سے تیسرے درجہ پر آتے ہیں ان دونوں سے مواد حاصل کیا۔ ان کا ابتدائیہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے اور اس پر پہلے ہی بحث کی جا سکتی ہے ۔

اس زمانہ کی تفسیریں بیان کرنے والے ماہرین اس بات کا اندازہ لگانے کی اتنی ہی صلاحیت رکھتے ہیں جتنی ہم کہ متون اور دو یا تین کتب متفقہ کی مشترک آیات کی کثیر تعداد کے مابین کس درجہ مطابقت ہے۔ آج کل بائبل کے عالمی ترجمہ کے شارحین مندرجہ ذیل اعداد فراہم کرتے ہیں۔

مرقس، لوقا اور متی کی تینوں انجیلوں کی مشترک آیات............۳۳۰

مرقس اور متی کی مشترک آیات..............................۱۷۸

مرقس اور لوقا کی مشترک آیات..............................۱۰۰

متی اور لوقا کی مشترک آیات...............................۲۳۰

پہلی تین انجیلوں میں سے ہر ایک کے ساتھ منفرد آیات کی تعداد حسب ذیل ہے :۔ متی ۳۳۰، مرقس ۵۳ اور لوقا ۵۰۰ ۔

ابتدائی دور کے عیسائی مصنفین (فادرس آف دی چرچ) کے زمانہ سے لے

کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام تک ڈیڑھ ہزار سال کی مدت گذر گئی اور کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا کہ انجیلوں کے مرتبین کے ماخذوں کا پتہ چلایا جائے۔ لوگ روایت پر چلتے رہے۔ ازمنۂ جدید میں جا کر ان اعداد کی بنیاد پر کہیں یہ بات محسوس کی گئی کہ انجیل کے ہر مصنف نے دوسروں سے مواد لیا اور اپنے ذاتی نظریات کے مطابق اپنے مخصوص انداز میں اس کو ترتیب دے دیا۔ زیادہ زور بیان کرنے کے لیے مواد کے جمع کرنے پر دیا گیا۔ یہ مواد ایک طرف تو ان قوموں کی زبانی روایات پر مبنی تھا جن سے یہ حاصل ہوا تھا اور دوسری طرف اس تحریری آرامی ماخذ سے حاصل ہوا تھا جو دوبارہ منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ یہ تحریری ماخذ یا تو یکجا مواد تھا یا مختلف روایتوں کے بہت سے ٹکڑے تھے جن کو ترتیب دے لیا گیا اور اسی کو انجیل کے ہر مرتب نے اپنے جدید کام کو تشکیل دینے میں استعمال کیا۔

تقریباً گذشتہ سو سال سے زیادہ گہرے مطالعہ نے ان نظریات تک پہنچایا ہے جو زیادہ تفصیلی ہیں اور جو امتداد زمانہ سے اور بھی پیچیدہ ہو جائیں گے۔ جدید نظریات میں پہلا نام نہاد ''ہولٹز ماں کا دو ماخذی'' نظریہ ہے (۱۸۶۸ء)۔ اوکلمان اور عالمی ترجمہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس نظریہ کے بموجب متی اور لوقا دونوں ایک مرقس سے متاثر ہوئے ہوں اور دوسری جانب کسی دوسری مشترک دستاویز سے جو اس کے بعد ضائع ہوگئی ہے۔ علاوہ ازیں پہلے دو میں سے ہر ایک کے اپنے ذاتی ماخذ بھی ہیں اس بات سے مندرجہ ذیل خاکہ کی جانب رہبری ہوتی ہے۔

خاکہ

اوکلمان محولہ بالا پر حسب ذیل نکات کو سامنے رکھ کر تنقید کرتے ہیں:

(۱) مرقس کی تصنیف جس کو لوقا اور متی دونوں کام میں لائے وہ غالباً مصنف کی انجیل نہیں تھی بلکہ اس کا ایک ابتدائی نسخہ تھا۔

(۲) اس خاکہ میں زبانی روایت پر کافی زور نہیں دیا گیا ہے۔ یہ بے انتہا اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ تنہا اسی میں یسوع کے الفاظ کو محفوظ رکھا گیا ہے اور تیس یا چالیس سال کی مدت کے دوران اس کے مشن کے تذکرے کو قائم و برقرار رکھا گیا ہے کیونکہ انجیل کے مرتبین میں سے ہر ایک اس عیسائی فرقہ کا محض ایک ترجمان تھا جس نے زبانی روایت کو تحریر کا جامہ پہنایا۔

یہی وہ چیز ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہوا کہ جو انجیلیں اس وقت موجود ہیں وہ پرتو ہیں اس واقفیت کا جو ابتدائی عیسائی فرقے یسوع مسیح کی حیات اور پادریوں کی جماعت کے بارے میں رکھتے تھے۔ وہ ان عقائد اور دینی تصورات کی آئینہ دار بھی ہیں جن کے انجیلوں کے مرتبین ترجمان تھے۔

اناجیل کے ماخذوں پر متن سے متعلق تنقید کے جدید ترین مطالعہ نے یہ امر صاف طور پر واضح کر دیا ہے کہ متون کی تشکیل میں اور بھی زیادہ پیچیدگی اختیار کی گئی ہے۔ فادر بے نوے اور بوا اسمار نے جو یروشلم کے بائبل سکول کے پروفیسر ہیں (۱۹۷۲۔۱۹۷۳ء) ایک کتاب میں جس کا نام ''اناجیل اربعہ کا خاکہ'' ہے، اس بات پر زور دیا ہے کہ متن کا ارتقا ان مدارج سے ہوا جو روایت کے ارتقا کے متوازی

اور پہلو بہ پہلو ہے۔ یہ ان نتائج پر دلالت کرتا ہے جو فادر بے نوے نے فادر بواسمار کی تحریر کے حصہ کے ابتدائیہ میں قائم کیے ہیں۔ وہ ان کو حسب ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ''(.........) اس بیان وعبارت کے الفاظ اور شکل جو روایت کے ایک طویل ارتقاء سے برآمد ہوئے ہیں، اس قدر مستند نہیں جیسے کہ شروع کی عبارت کے ہیں۔ اس کتاب کے بعض قارئین غالباً یہ جان کر متحیر یا متوحش ہوں گے کہ یسوع کے بعض اقوال حکایتیں یا اپنے انجام کے متعلق ان کی پیش گوئیاں اس انداز سے بیان نہیں کی گئی تھیں، جس انداز سے ہم آج ان کو پڑھتے ہیں۔ بلکہ وہ ان لوگوں کے ہاتھوں بدل دی گئی ہیں یا تحریف کر دی گئی ہیں جنھوں نے ان کو ہم تک منتقل کیا ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے جو اس قسم کی تاریخی تحقیق کے خوگر نہیں ہیں حیرت کا موجب یا ایک شرمناک واقعہ ہوگی۔''

متون میں تبدیلیاں یا تحریفات جو ان لوگوں کے ہاتھوں ہوئے جنھوں نے ان متون کو ہم تک منتقل کیا ایک ایسے طریقہ سے انجام پائیں جس کی فادر بواسمار ایک انتہائی پیچیدہ شکل کے ذریعہ سے تشریح کرتے ہیں۔ یہ ایک نام نہاد ''دو ماخذی نظریہ'' کی ارتقائی شکل ہے۔ اور یہ متون کی جانچ اور ان کے موازنہ کا ایک ایسا ماحصل ہے جس کی تلخیص یہاں کرنا ممکن نہیں۔ جو قارئین مزید تفصیلات حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں وہ اس ابتدائی تحریر سے رجوع کریں جو ''لے ایدی تیون وسرف پاری'' نے شائع کی ہے۔

چار بنیادی دستاویزات ۔اے۔بی۔سی اور کیو انجیلوں کے ابتدائی ماخذات کو ظاہر کرتے ہیں۔(ملاحظہ ہو عام شکل صفحہ ۲۹۔ا)

دستاویز ''اے'' ایک یہودی عیسائی ماخذ سے حاصل ہوئی ہے۔متی اور مرقس دونوں کو اس سے تحریک ملی۔

دستاویز ''بی'' دستاویز ''اے'' کی ایک وضاحت ہے۔جو بے دین، مع عیسائی کلیساؤں میں استعمال کیے جانے کے لیے تیار کی گئی تھی۔سوائے متی کے، انجیلوں کے جملہ مرتبین کو اس سے تحریک ہوئی ہے۔

دستاویز ''سی'' سے مرقس، لوقا اور یوحنا کو تحریک ہوئی۔

دستاویز ''کیو'' متی اور لوقا میں مشترک ماخذات میں سے اکثر پر مشتمل ہے۔

یہ اس 'دو ماخذی نظریہ'' میں مشترک دستاویز ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

ان بنیادی دستاویزات میں سے کسی سے بھی وہ قطعی اور فیصلہ کن متون تیار نہیں ہوئے جو آج ہمارے علم میں ہیں۔ان اشاعتوں اور آخری اشاعتوں کے درمیان، متوسط قسم کی اور اشاعتیں ہیں۔متوسط متی، متوسط مرقس، متوسط لوقا اور متوسط یوحنا۔ان چار متوسط دستاویزات سے ہی چاروں انجیلوں کے آخری انجیلوں کے آخری نسخے تیار ہوئے۔نیز ان ہی نے دوسری انجیلوں کے آخری متناظر نسخوں کے لیے تحریک پیدا کی۔صرف اس شکل پر نظر ڈالنا ہے۔اسی سے اس پیچیدہ تعلق کا پتہ چل جائے گا جس کا اظہار مصنف نے کیا ہے۔

صحیفوں کی تحقیق کے یہ نتائج بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان سے یہ بات

معلوم ہوئی ہے کہ کس طرح انجیل کے متون کی ایک تاریخ ہے (جس پر بعد میں بحث کی جائے گی) فادر بواسار کے الفاظ میں ایک ماقبل تاریخ بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آخری نسخوں کے ظہور میں آنے سے پہلے ان کو متوسط دستاویزی درجہ کی تبدیلی سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ اس طرح مثال کے طور پر اس بات کی تشریح کرنا ممکن ہے کہ مسیح کی زندگی سے ایک نہایت معروف قصہ جیسے مچھلی پکڑنے کا معجزہ، لوقا کی انجیل میں ایک ایسے واقعہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو مسیح کی زندگی میں پیش آیا تھا اور یوحنا کے ہاں اس کو رفع مسیح کے بعد ان کے ظہور کے طور پر دکھایا گیا ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے جو نتیجہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم انجیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ذرا بھی اس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ ہم مسیح کے الفاظ پڑھ رہے ہیں۔ فادر بینوئے انجیل کے قارئین سے خطاب کرتے ہیں اور ان کو متنبہ کرتے ہوئے حسب ذیل صلہ ان کو دیتے ہیں۔ ''اگر قاری ایک سے زیادہ حالت میں اس خیال کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ یسوع کی آواز براہ راست سن رہا ہے تب بھی یہ سمجھ لے کہ وہ کلیسا کی آواز تو سنتا ہے اور وہ اس پر اسی طرح مالک کے روحانی مقررہ ترجمان پر بھروسہ کرے کہ اسی نے طویل عرصہ تک اس سطح ارض پر گفتگو کی تھی اور اب وہ اپنے جمال روحانی کے پردے سے ہم سے ہم کلام ہے۔''

بعض متن کی غیر مستند عبارتوں کو دوسری ویٹی کن کونسل کے ذریعہ حاصل ہونے والے الہام پر مبنی اعتقادی آئین میں مستعمل عبارت کے ساتھ کیسے اس طرح

مطابقت دی جاسکتی ہے کہ ہمیں مخالف بیان پر یقین آ جائے۔یعنی یسوع کے الفاظ کے صحیح طور پر منتقل ہونے کا۔''یہ چاروں انجیلیں جن کو یہ (کلیسا) نہایت تیقن کے ساتھ تاریخی اعتبار سے مستند قرار دیتا ہے، نہایت دیانتداری سے وہ باتیں منتقل کرتی ہیں جو حضرت عیسیٰ ابن اللہ نے نوع انسانی کے درمیان رہتے ہوئے اپنی حیات میں واقعی کی، یا بتائی تھیں تا کہ ان کی ابدی نجات ممکن ہو۔اور یہ سلسلہ اس دن تک جاری تھا جب ان کو آسمان پر اٹھایا گیا۔''

یہ بالکل واضح ہے کہ یروشلم کے بائبلیکل سکول کا کام کونسل کے اعلان کی قطعاً تردید کرتا ہے۔

ایم۔ ای بوسمار۔ چاروں انجیلوں کا خاکہ۔ عمومی نقشہ

سنوپس وے کیترا یوانژلیہ

خاکہ

دستاویزات اے، بی، سی، کیو = بنیادی دستاویزات جو متون کی ترتیب میں مستعمل ہوئی ہیں۔

متوسط — متن کا متوسط نسخہ

متون کی تاریخ

اگر کوئی شخص یہ سمجھے تو وہ غلطی کرے گا کہ انجیلیں جب ایک مرتبہ لکھی گئیں تو ان میں نوزائیدہ عیسائیت کے بنیادی صحیفے شامل تھے اور لوگ ان سے اسی طرح رجوع کرتے تھے جس طرح عہد نامہ قدیم سے۔ اس وقت اولین سند زبانی روایت تھی جس کو یسوع کے ارشادات اور حواریوں کی تعلیمات کا ذریعہ قرار دیا جاتا تھا۔ اشاعت کے لیے پہلی تحریریں پال کے خطوط تھے اور وہ انجیلوں سے کافی عرصہ پہلے سے رواج پا چکے تھے۔ وہ بہر حال کئی دہ سالہ پہلے ضبط تحریر میں آ چکے تھے۔

یہ بات پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ اس کے بات کے برعکس جو آج بھی بعض شارحین لکھ رہے ہیں، ۱۴۰ء سے پہلے کوئی بھی ایسا شاہد موجود نہیں تھا جس کو یہ علم ہو کہ انجیل کے کسی مجموعے کا کوئی نسخہ موجود تھا۔ ۱۷۰ء کے بعد جا کر کہیں یہ معلوم ہوا کہ چاروں انجیلوں نے شریعت کے لٹریچر کا درجہ پایا۔

عیسائیت کے ابتدائی ایام میں، یسوع کے حالات کے سلسلہ میں بہت سی تحریریں رائج تھیں۔ وہ بعد کے زمانہ میں استناد کے طور پر محفوظ نہیں رکھی گئیں اور کلیسا نے ان کو چھپا دینے کا حکم دے دیا اور اس لیے ان کا نام ''اسفار محرفہ'' پڑ گیا۔ ان کتابوں کے بعض متون اچھی طرح باقی رہ گئے۔ ان کو اس حقیقت سے فائدہ پہنچ گیا کہ وہ مقبول عام تھے۔ یہ مقولہ ہے عمومی ترجمہ کا۔ یہی بات برناباس کے خطوط کے لیے بھی صحیح تھی کہ بدقسمتی سے دوسری تحریریں نہایت درندگی سے نکال ڈالی گئیں اور ان کے صرف ٹکڑے باقی رہ گئے۔ ان کو غلطی کے نامہ برقرار دے دیا گیا اور عقیدت مندوں کی نظروں سے چھپا دیا گیا۔ ایسی کتابیں جیسی نظارت کی انجیلیں، عبرانیوں کی انجیلیں اور مصریوں کی انجیلیں، جن کا علم ابتدائی پادریوں کے اقتباسات سے ہوتا تھا پھر بھی مستند شرعی انجیلوں سے خاصا گہرا تعلق رکھتی تھیں۔ یہی بات طامس کی انجیل اور برناباس کی انجیل پر صادق آتی ہے۔

ان اسفار محرفہ قسم کی تحریروں میں بعض فرضی تفصیلات ہیں جو عوامی نوعیت کی داستانوں کی پیداوار ہیں۔ اسفار محرفہ کے سلسلہ میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے مصنفین پورے وثوق کے ساتھ ایسی عبارتیں بھی دہراتے ہیں جو سچ مچ مضحکہ خیز ہیں۔ تاہم اس قسم کی عبارتیں تمام انجیلوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ ذرا ان واقعات

کے فرضی بیانات پر غور کیجئے جو متی کے ادعاء کے بموجب مسیح کی رحلت کے موقع پر رونما ہوئے تھے۔ اس بات کا امکان موجود ہے کہ عیسائیت کی تمام ابتدائی تحریروں میں ایسی عبارتیں مل جائیں جن میں سنجیدگی کی کمی ہو۔ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے کافی دیانتداری کا اظہار کرنا پڑے گا۔

مسیح سے متعلق لٹریچر کی کثرت نے کلیسا کو اس جانب مائل کیا کہ جب موخر الذکر ترتیب کے مرحلہ سے گزر رہا تھا۔ اس وقت اس میں قطع و برید سے کام لے۔ غالباً ایک سی انجیلیں دبا دی گئیں۔ صرف چار کو باقی رکھا گیا۔ اور عہد نامہ جدید کی تحریرات کی سرکاری فہرست میں اس طرح ان کو جگہ دی گئی کہ وہی مسلمہ و مصدقہ کتب کہلائی جانے لگیں۔

دوسری صدی عیسوی کے وسط میں سنوپ (۱۷) کے مارسیون (۱۸) نے کلیسائی مقتدرین پر بڑا زور ڈالا کہ وہ اس بارے میں سخت رویہ اختیار کریں۔ یہ صاحب یہودیوں کے پکے دشمن تھے اور اس وقت انہوں نے سارے عہد نامہ قدیم اور ان تحریروں میں سے جو یسوع کے بعد وجود میں آئی تھیں اور عہد نامہ قدیم سے کافی قریبی تعلق رکھتی تھیں یا جو یہودوی عیسائی روایت سے حاصل ہوئی تھیں، ہر ایک کو مسترد کر دیا۔ مارسیون نے صرف لوقا کی انجیل کی اہمیت کو تسلیم کیا اس لیے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ لوقا پال اور ان کی تحریروں کے ترجمان ہیں۔

کلیسا نے مارسیون کو گمراہ قرار دے دیا اور اپنی مستند کتاب میں پال کے تمام خطوط شامل کر لیے۔ لیکن متی، لوقا، مرقس اور یوحنا کی دوسری انجیلیں شامل کر لیں۔ انہوں نے کئی دوسری تحریروں کا بھی اضافہ کر لیا۔ جیسے رسولوں کے اعمال۔

بایں ہمہ پہلی صدی عیسوی کے دوران وقت کے ساتھ ساتھ سرکاری فہرست میں ردوبدل ہوتی رہی۔ کچھ عرصہ وہ تحریریں جو بعد میں مستند نہیں سمجھی گئیں (یعنی اسفار محرفہ) وہ اس میں شامل رہیں۔ جب کہ دوسری تحریریں جو آج کل کے عہد نامہ جدید کے مستند نسخے میں شامل ہیں، اس وقت اس سے خارج کر دی گئی تھیں۔ یہ کشمکش کونسل آف ہپوریگیس (Hippo Regius) تک جو ۳۹۳ء میں اور کارتھیج میں ۳۹۷ء میں ہوئی، جاری رہی۔ تاہم چاروں انجیلیں اس میں شامل رہیں۔

فادر بواسمار کے ساتھ اس کثیر مقدار لٹریچر کے معدوم ہونے پر افسوس کا اظہار کیا جائے جس کو کلیسا نے اسفار محرفہ قرار دے دیا تھا۔ حالانکہ اس کی ایک تاریخی اہمیت تھی۔ مذکورہ بالا مصنف نے اس چیز کو اپنی چار انجیلوں کے خلاصہ میں سرکاری انجیلوں کے ساتھ جگہ دی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ یہ کتابیں چوتھی صدی عیسوی کے اختتام کے لگ بھگ زمانہ تک موجود تھیں۔

یہ وہ صدی تھی جس میں ان چیزوں کو باقاعدگی نصیب ہوئی۔ انجیلوں کے قدیم ترین مخطوطے اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے کی دستاویزات یعنی تیسری صدی عیسوی کے طومار اور غالباً ایک دوسری صدی عیسوی کا ہم تک صرف جزوی طور پر پہنچے ہیں۔ دو قدیم ترین چرمی مخطوطے یونانی زبان میں ہیں اور چوتھی صدی عیسوی کے ہیں۔ وہ کوڈیکس ویٹیکانس (کتاب ویٹی کن) ہے جس کو کتب خانہ ویٹی کن میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ اور اس کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں سے دستیاب ہوا تھا اور کوڈیکس سینائیکس (کتاب سینائی) ہے جو کوہ

سینا پر ملا تھا اور اب برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ ثانی الذکر میں دو اسفار محرفہ کی کتابیں شامل ہیں۔

عالمی ترجمہ کے مطابق دو سو پچاس دوسرے معلوم طومار دنیا بھر میں موجود ہیں، جن میں سب سے آخر پندرہویں صدی عیسوی کا ہے لیکن عہد نامہ جدید کے ان تمام نسخوں میں جو ہم تک پہنچے ہیں یکسانیت نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان کے درمیان مختلف درجہ کے اہمیت رکھنے والے فرق نظر آنا ممکن ہے لیکن وہ خواہ کتنے ہی اہم ہوں، ان کی تعداد ہمیشہ بہت زیادہ رہی ہے۔ ان میں سے بعض کا تعلق محض قواعد زبان کی جزئیات کے اختلاف سے ہے اور بعض کا لغات سے یا ترتیب الفاظ سے۔ تاہم مخطوطات کے مابین کہیں ایسے بھی اختلافات دکھائی دے جاتے ہیں جو تمام عبارتوں کے مفہوم کو متاثر کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ وہ متن کے اختلافات کی وسعت کا پتہ چلائے تو اس کو صرف ایک نظر ''نووم ٹیسٹامینٹم گریس'' (یونانی کا عہد نامہ جدید) پر ڈالنا ہوگا اس کتاب میں برائے نام یونانی متن کا ''درمیان کا راستہ'' اختیار کیا گیا ہے۔ یہ مختلف تحریروں کو ملا کر ایک نسخہ تیار کیا گیا ہے جس میں ایسے حواشی دیئے گئے ہیں جن میں مختلف نسخوں میں پائے جانے والے تمام اختلافات شامل ہیں۔

کسی متن کے مستند ہونے کا اور سب سے زیادہ مقدس مخطوطہ کا مسئلہ بھی ہمیشہ بحث و تمحیص کے لیے کھلا رہتا ہے۔ کوڈیکس ویٹکانس (کتاب ویٹ کن) اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ جو چھ بہ ویٹ کن سٹی نے ۱۹۶۵ء میں مرتب کیا تھا اس میں مرتبین کی جانب سے ایک ایسا حاشیہ شامل ہے جس میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ''اس

کے نقل کیے جانے کے کئی صدی بعد (جو یقین ہے کہ دسویں یا گیارہویں صدی کے قریب کا زمانہ ہے) ایک کاتب نے سوائے ان کے جن کو اس نے غلط سمجھا تمام حروف پر سیاہی پھیر دی۔''متن میں ایسی عبارتیں موجود ہیں جن میں ابتدائی حروف ہلکے بادامی رنگ کے نیچے سے اب بھی نظر آتے ہیں جو باقی عبارت سے جو گہرے بادامی رنگ میں ہے واضح طور پر مختلف معلوم ہوتی ہے۔اس بات کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی کہ یہ اصل کا صحیح نمونہ ہے۔اس کے علاوہ حاشیہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ''کئی صدیوں کے دوران مخطوطہ میں جو صحت کی گئی ہے یا حاشیہ چڑھایا گیا ہے اس میں جو مختلف ہاتھ لگے ان کو ابھی تک تیقن کے ساتھ نہیں پہچانا گیا ہے۔جب متن پر سیاہی پھیری گئی اس وقت چند تصحیحات ضروری گئی تھیں۔'' تمام مذہبی نوشتوں میں متن کو چوتھی صدی کی نقل بتایا جاتا ہے۔یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہوسکتا ہے مختلف ہاتھوں نے صدیوں بعد متن میں تبدیلی کی ہو، ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ ویٹی کن میں دستیاب ہونے والے ماخذوں سے رجوع کرے۔

اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ مقابلہ کے لیے دوسرے متون کو کام میں لایا جا سکتا ہے لیکن ان تبدیلیوں کے درمیان انتخاب کرنا کس طرح ممکن ہے جو مفہوم کو بدل دیتی ہیں؟ یہ ایک اچھی طرح جانی پہچانی حقیقت ہے کہ ایک نہایت ہی قدیم کاتب کی تصحیح سے اصلاح شدہ متن کو فیصلہ کن انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ہم بعد میں دیکھیں گے کہ فارقلیط سے متعلق یوحنا کی ایک عبارت میں صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے اس کے معنی بدل جاتے ہیں اور دینی نقطہ نظر سے دیکھئے تو اس کے

مفہوم میں بالکلیہ تبدیلی ہو جاتی ہے۔

اوکلمان اپنی کتاب ''عہد نامہ جدید'' میں اختلافات کے موضوع پر حسب ذیل تحریر پیش کرتے ہیں۔

''بعض اوقات موخر الذکر نتیجہ ہوتے ہیں بلاقصد سہو کا۔نقل کرنے والے سے کوئی لفظ چھوٹ جاتا ہے۔یا اس کے برعکس دو مرتبہ لکھا جاتا ہے، یا ایک جملہ کا پورا ٹکڑا لاپرواہی کے سبب ترک ہو جاتا ہے، کیونکہ مخطوطہ میں، جس کی نقل کی جارہی ہے، یہ ٹکڑا بالکل ایک سے ہی دو الفاظ کے درمیان استعمال ہوا تھا۔بعض اوقات دیدہ و دانستہ تصحیحات کی گئی ہیں جو یا تو اس لیے ہوئی ہیں کہ نقل کرنے والے کو یہ آزادی رہی ہے کہ وہ متن کو اپنے خیالات کے مطابق درست کرلے یا اس کو کسی دوسرے رائج الوقت متن سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے کچھ ایسی استادانہ سعی و کوشش کی ہے کہ کوتاہیاں کم سے کم ہو گئیں۔ جب آہستہ آہستہ عہد نامہ جدید کی تحریریں ابتدائی عیسائی لٹریچر سے الگ ہو گئیں، اور انہوں نے مقدس صحیفہ کا درجہ حاصل کرلیا، تو اب نقل کرنے والوں نے وہ آزادی برتنے میں تذبذب اختیار کیا جو ان کے اسلاف برت چکے تھے۔ انہوں نے یہ خیال کرنا شروع کردیا کہ ہم ایک مستند متن کی نقل کر رہے ہیں۔حالانکہ حقیقت میں وہ ان تحریفات کو لکھتے چلے آرہے ہیں۔آخر میں یہ ہوا کہ نقل کرنے والے نے بعض اوقات ایک مبہم عبارت کی وضاحت کے لیے حاشیہ میں تحریری نوٹ چڑھا دیئے۔بعد میں نقل کرنے والے نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ جملے جو حاشیہ میں دکھائی دے رہے ہیں۔ میرے پیشترو سے اصل عبارت میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے ضروری سمجھا کہ

حاشیے کے ان نوٹوں کو متن میں شامل کر دے۔ اس عمل نے نئے متن کو اکثر اوقات اور بھی زیادہ مبہم کر دیا۔''

بعض مخطوطوں کے لکھنے والوں نے کبھی کبھی متن کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ ہی آزادی برتی۔ یہ حال محولہ بالا دو مخطوطات کے بعد اکثر مقدس مخطوطوں میں سے ایک کا ہوا۔ اور وہ ہے چھٹی صدی کا ''کوڈیکس بزائی کینٹا برگیانس'' (Codex Bazae Cantabrigiensis) لکھنے والے نے غالباً لوقا اور متی کے یہاں مسیح کے نسب نامے میں فرق محسوس کیا۔ لہٰذا اس نے اپنے لوقا کے نسخہ میں متی کے نسب نامے کو درج کر دیا۔ لیکن چونکہ ثانی الذکر میں اول الذکر کے مقابلہ میں کم نام شامل تھے تو اس نے زائد ناموں کے ساتھ (توازن قائم رکھے بغیر) ان کو جوڑ دیا۔

کیا یہ کہنا ممکن ہے کہ لاطینی ترجمے جیسے کہ سینٹ جیروم کا چھٹی صدی کا ولگیٹ یا قدیم تر تراجم (ویٹس اٹالا) یا شامی اور قبطی ترجمے بنیادی یونانی مخطوطات کی بہ نسبت زیادہ مطابق اصل ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ وہ ایسے مخطوطات سے تیار کیے گئے ہوں جو محولہ بالا مخطوطات سے زیادہ پرانے ہوں۔ اور آج کے دن مفقود ہو گئے ہوں ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔

یہ امر بھی ممکن رہا ہے کہ ان نسخوں میں بہت سوں کی اس طرح جماعت بندی کر دی جائے کہ ان سب میں مشترک علامات کی ایک خاص تعداد موجود ہو۔ اوکلمان کے بیان کے بموجب اسے اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔ایک نام نہاد شامی متن جس کا ڈھانچہ قدیم ترین مخطوطات

کی اکثریت کی جانب رہبری کرتا ہے۔ یہ متن وسیع پیانے پر فن طباعت کی بدولت چھٹی صدی عیسوی سے عصر مابعد تک یورپ بھر میں پھیلتا رہا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ غالباً بدترین متن ہے۔

---------ایک نام نہاد مغربی متن مع قدیم لاطینی نسخے اور ''کوڈیکس بزائی کیناء برگیانس'' (Codex Bazae Cantabrigiensis) جو یونانی اور لاطینی دونوں زبانوں میں ہے---------- عالمی ترجمے کے بموجب اس کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا واضح رجحان تشریحات، غلط مواد اور ہم آہنگی پیدا کرنا (تاویلات) ہے۔

---------وہ نام نہاد غیر متعین متن جس میں کتاب ویٹ کن اور کتاب سینا شامل ہیں اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے پیانہ پر پاک اور بے میل ہے۔ عہد نامہ جدید کے جدید ایڈیشن اس کے فوراً بعد وجود میں آ جاتے ہیں۔ اگر چہ اس کے اپنے نقائص ہیں۔ (عالمی ترجمہ)

متن سے متعلق جدید دور کی تمام تنقید اس اعتبار سے جو کچھ کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کوشش کرے اور ''ایک ایسے متن کو تشکیل دے جس میں اس بات کا سب سے زیادہ امکان ہو کہ وہ ابتدائی متن کے بالکل قریب آ جائے۔ کسی حالت میں بھی خود ابتدائی متن کی جانب مراجعت کرنے کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔'' (عالمی ترجمہ)

حواشی

۱۔ کاپورناوم کے مقام پر محصول وصول کرنے پر تعینات تھے۔ حضرت عیسیٰ کے ظہور پر ان کے پیروؤں میں شامل ہو گئے۔ بارہ حواریوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر لیوی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ روایت کے بموجب پہلی انجیل کے مرتب ہیں۔ (مترجم)

۲۔ اس انجیل کے اور حصہ میں متی پھر اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ لیکن زمانے کے بارے میں صحیح تعین نہیں کرتے (۱۶،۱-۴) یہی بات لوقا کے بارے میں صحیح ہے (۱۱،۲۹۔۳۲) ہم بعد میں دیکھیں گے کہ کس طرح مرقس (کی انجیل) میں یسوع کو یہ اعلان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس نسل کو کوئی نشان نہیں دیا جائے گا۔ (مرقس ۸،۱۱) اصل عبارت یہ ہے۔

''پھر فریسی نکل کر اس سے بحث کرنے لگے اور اسے آزمانے کے لیے اس سے کوئی آسمانی نشان طلب کیا۔ اس نے اپنی روح میں آہ کھینچ کر کہا'' اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہیں دیا جائے گا۔''

۳۔ پورا نام جان مارک ہے۔ ان کا شمار انجیل کے مرتبین میں ہوتا ہے۔ پال یا پولس کے رفیق کار تھے۔ پہلی صدی عیسوی کے دوسرے

ربع میں موجود تھے۔ روایت ہے کہ انہوں نے دوسرے نمبر کی انجیل مرتب کی تھی۔ (مترجم)

۴۔ اسی گھڑی اس نے بہتوں کو بیماریوں اور آفتوں اور بری روحوں سے نجات بخشی اور بہت سے اندھوں کو بینائی عطا کی۔

۵۔ میں بدروحوں کو بعلزبوں کی مدد سے نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمہارے پاس آ پہنچی۔

۶۔ سینٹ لوقا۔ انجیل کے مرتب ایک فرانسیسی اور سینٹ پال کے حواری۔ روایتی طور پر تیسری انجیل انہوں نے مرتب کی۔ اس کے علاوہ رسولوں کے اعمال کے مرتب بھی وہی خیال کیے جاتے ہیں۔ (مترجم)

۷۔ پورا نام ٹیٹس فلاویٹس سالی نس ویسپا سیانس تھا (۴۰ (؟)۔ ۸۱ء) رومتہ الکبریٰ کا دوسرا فلاوی شہنشاہ تھا۔ اپنے باپ کے دور حکومت میں ۷۰ء میں یروشلم کا محاصرہ کیا اور اس پر قبضہ کرلیا۔ اس کا دور حکومت رعایا کی خوشحالی کا دور سمجھا جاتا ہے۔ (مترجم)

۸۔ یوحنا کے ساتھ مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ مصائب مسیح کے قبل آخری کھانے کے دوران عشائے ربانی کی رسم کا کوئی حوالہ نہیں دیتے۔

۹۔ اس نے اس سے کہا ''تو نے خود کہہ دیا۔ جب وہ کھا رہے تھے تو یسوع نے روٹی لی اور برکت دے کر توڑی اور شاگردوں کو دے

کر کہا لو کھاؤ۔ یہ میرا بدن ہے۔ پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور ان کو دے کر کہا تم سب اس میں سے پیو۔ کیونکہ یہ میرا وہ عہد کا خون ہے جو بہتیروں کے لیے گناہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے۔'' (متی کی انجیل ۲۶:۲۶۔۲۹)

۱۰۔ پھر اس نے روٹی لی اور شکر کر کے توڑی اور یہ کہہ کر ان کو دی کہ ''یہ میرا بدن ہے جو تمہارے واسطے دیا جاتا ہے۔ میری یادگاری کے لیے یہی کیا کرو اور اسی طرح کھانے کے بعد پیالہ یہ کہہ کر دیا کہ یہ پیالہ میرے اس خون میں نیا عہد ہے جو تمہارے واسطے بہایا جاتا ہے۔ مگر دیکھو میرے پکڑوانے والے کا ہاتھ میرے ساتھ میز پر ہے کیونکہ ابن آدم تو جیسا اس کے واسطے مقرر ہے پکڑا جاتا ہے مگر اس شخص پر افسوس ہے جس کے وسیلہ وہ پکڑوایا جاتا ہے۔'' اس پر وہ آپس میں پوچھنے لگے کہ ہم میں سے کون ہے جو یہ کام کرے گا اور ان میں یہ تکرار بھی ہوئی کہ ہم سے کون بڑا سمجھا جاتا ہے۔ (لوقا کی انجیل ۲۲: ۱۹۔۲۴)

۱۱۔ اور وہ کھا ہی رہے تھے کہ اس نے روٹی لی اور برکت دے کر توڑی اور ان کو دی اور کہا میرا یہ بدن ہے پھر اس نے پیالہ لے کر شکر کیا اور ان کو دیا اور ان سبھوں نے اس میں سے پیا۔ (مرقس کی انجیل ۱۴: ۲۲۔۲۴)

۱۲۔ کیونکہ یہ بات مجھے خداوند سے پہنچی اور میں نے تم کو بھی پہنچا

دی کہ خداوند یسوع نے جس رات کو وہ پکڑوایا گیا روٹی لی اور شکر کر کے توڑی اور کہا یہ میرا بدن ہے اور تمہارے لیے ہے میری یادگاری کے واسطے یہی کیا کرو۔ اسی طرح اس نے کھانے کے بعد پیالہ بھی لیا اور کہا ''یہ پیالہ میرے خون میں نیا عہد ہے جب کبھی پیو میری یادگار کے لیے یہی کیا کرو۔'' (۱۱:۲۲۔۲۵)

۱۳۔ انجیل کے مرتب، زبیدی کے بیٹے اور بارہ حواریوں میں سے تھے۔ وہ چوتھی انجیل کے مرتب سمجھے جاتے ہیں۔ کتاب وحی بھی ان ہی سے منسوب کی جاتی ہے۔ (مترجم)

۱۴۔ کتب متفقہ یعنی متی، مرقس اور لوقا کی انجیلیں جن کی ترتیب یکساں ہے برخلاف یوحنا کی انجیل کے جوان سے کسی قدر مختلف ہے۔ (مترجم)

۱۵۔ فلسطین کا جنوبی حصہ جو یہودہ کے بعد ایرانی، یونانی اور رومی سلطنتوں میں شامل رہا ہے مغرب میں یہ علاقہ بحیرۂ روم تک پھیلا ہوا تھا۔ پومپی کی فتح کے بعد یہ علاقہ رومہ کا ایک حصہ بن گیا۔ (مترجم)

۱۶۔ ایشیائی ترکی کے شمال میں بحیرہ اسود کے ساحل پر ایک بندرگاہ ہے۔ پہلے اس نام کی ایک ولایت بھی تھی۔ اس کا دارالحکومت بھی۔ یونانی دور میں اس کو کافی فروغ حاصل رہا۔ ابتدائی دور میں عیسائیت کا بھی یہ ایک اہم مرکز تھا۔ (مترجم)

۱۷۔ دوسری صدی عیسوی میں ایک عیسائی راہب تھا۔ کٹر عیسائی

اس کو گمراہ قرار دیتے ہیں۔اس نے ایک نیا فرقہ ایجاد کیا۔ جو اس کے نام پر مارسیونک کہلاتا ہے۔اس فرقہ کے گرجا شمالی افریقہ، گالیہ، ایشیائے کوچک اور مصر میں قائم ہوئے۔ وہ مادہ کے ازلی ہونے کا قائل ہے۔(مترجم)

باب چہارم

اناجیل اور جدید سائنس

حضرت مسیح کے نسب نامے

اناجیل میں بہت کم ایسی عبارتیں ہیں جو موجودہ سائنسی مواد کے مقابلے میں لائی جاسکیں۔ چنانچہ پہلی بات یہ ہے کہ ان میں بہت سے بیانات معجزوں سے متعلق ہیں جن پر سائنسی اعتبار سے بمشکل نقد و تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ معجزات لوگوں سے متعلق ہیں۔ بیمار کی شفایابی (دیوانہ، نابینا، مفلوج، کوڑھی کو شفا دینا۔ لزاری کا قبر سے اٹھ کر کھڑے ہونا) نیز خالص مادی حوادث جو فطرت کے اصولوں سے ماوراہیں (مسیح کا پانی پر چلنے کا بیان جوان کو سہارے رہتا ہے۔ پانی کا شراب میں تبدیل ہو جانا) بعض اوقات کسی غیر معمولی زاویہ نگاہ سے ایک قدرتی حادثہ کا مشاہدہ کیا جاتا ہے جو اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ اس میں وقت کا عنصر نہایت مختصر رہ جاتا ہے۔ فوری طور پر طوفان کا رک جانا۔ انجیر کے درخت کا آناًفاناً خشک ہو جانا۔ مچھلی پکڑنے کا معجزہ گویا سمندر کی تمام مچھلیاں مل کر ٹھیک اس جگہ پر آ گئی تھیں جہاں جال پھینکے گئے تھے۔

ان تمام واقعات میں اس کی (مسیح کی) قدرت کاملہ میں خداوند دخل دیتا

ہے۔ کسی شخص کو بھی اس بات پر متعجب ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ مسیح علیہ السلام کیا حاصل کر سکتے ہیں۔ بشر کے معیار سے یہ سب کچھ عظیم ہے۔ لیکن ان کے لیے ایسا نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کوئی عقیدت مند سائنس کو قطعاً فراموش کر دے۔ ربانی معجزات اور سائنس پر عقیدہ رکھنا بالکل مطابقت رکھتا ہے۔ ایک ربانی سطح پر ہے اور دوسرا بشری سطح پر۔

ذاتی طور پر یہ عقیدہ رکھنے پر پوری طرح آمادہ ہوں کہ مسیح نے ایک کوڑھی کو شفا دی تھی لیکن میں اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ ایک ایسا متن مستند اور منزل من اللہ ہے جس میں میں یہ پڑھتا ہوں کہ اول البشر اور ابراہیم علیہ السلام کے درمیان محض بیس پشتیں تھیں۔ لوقا نے اپنی انجیل میں یہی بات لکھی ہے (۳: ۲۳۔۲۸) ہمیں ایک ہی لمحہ میں اس کے وجوہ معلوم ہو جائیں گے کہ اسی موضوع پر عہد نامۂ قدیم کے متن کی طرح، لوقا کا متن بھی کس طرح محض انسانی فکر کا نتیجہ ہے۔

اناجیل (قرآن کی طرح) ہمیں یسوع کی جسمانی تخلیق کے بارے میں وہی باتیں بتاتی ہیں۔ یسوع کا رحم مادر میں قدرت کے ان قوانین کے خلاف ظہور رہوا جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔ ماں کے بیضہ دان میں جو بیضہ پیدا ہوا اس کو مرد کے اس مادہ منویہ کے ساتھ ملنے کی ضرورت نہیں ہوئی جو باپ کی طرف سے آئے تا کہ جنین کی تشکیل ہو۔ اور ایک زندہ بچہ وجود میں آئے۔

ایک عام فرد کی ولادت کا واقعہ بغیر کسی نر کے نطفہ پہنچائے ''خودزائی'' کہلاتا ہے۔ عالم حیوانات میں خودزائی کا واقعہ بعض شرائط کے تحت ظہور پذیر ہوتا ہے۔

یہ بات مختلف حشرات کے لیے صحیح ہے۔جن میں کچھ غیر فقرہ دار جانور اور بہت سے موقعوں پر ایک منتخب نسل کا پرندہ شامل ہے۔تجربہ کے طور پر یہ بات مثلاً چند دودھ پلانے والے جانوروں (مادہ خرگوش) میں ممکن ہوتی ہے کہ ایک جنین میں بیضہ کی بالیدگی کے آغاز کو بے انتہا بنیادی حالت میں بغیر کسی نر کے مادہ منویہ کی مداخلت کے حاصل کیا جا سکے لیکن اس معاملہ کو زیادہ آگے جانا ممکن نہ تھا اور مکمل خودزائی کی مثال خواہ تجرباتی ہو یا قدرتی ابھی تک علم میں نہیں آئی ہے۔مسیح علیہ السلام کا معاملہ منفرد تھا۔حضرت مریم علیہ السلام ایک کنواری ماں تھیں۔ انہوں نے اپنے کنوارپنے کو جاری رکھا اور یسوع کے علاوہ ان کے کوئی بچہ نہیں ہوا۔یسوع ایک حیاتیاتی استثناء ہیں۔(۱)

یسوع کے نسب نامے

وہ دو نسب نامے جو متی اور لوقا کی انجیلوں میں شامل ہیں، شائبہ اصلیت سائنسی مواد سے مطابقت اور اس لیے استثناء کے مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے ہیں جو عیسائی شارحین کے لیے بڑی پریشانی اور تشویش کا موجب ہیں کیونکہ موخر الذکر حضرات ان کے متعلق یہ بات ماننے سے انکار کرتے ہیں جو صراحتاً انسانی تخیل کا نتیجہ ہے۔ کتاب پیدائش کے مرشدانہ متن کے مصنفین جن کا تعلق چھٹی صدی قبل مسیح سے ہے پہلے ہی اول البشر کے نسب ناموں کے سلسلہ میں تخیل کو کام میں لا چکے تھے۔ تخیل ہی نے پھر متی اور لوقا کو اس مواد کو کام میں لانے کے لیے ابھارا جو انہوں نے عہد نامہ قدیم سے مستعار نہیں لیا تھا۔

یہ بات دوٹوک طریقہ پر ماننی پڑے گی کہ پدری نسب ناموں کی یسوع علیہ السلام سے قطعاً کوئی موزونیت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص حضرت مریم علیہ السلام کے اکلوتے صاحبزادے کا نسب نامہ بیان کرتا ہے تو جوڑ کا ایک صلبی باپ کے بغیر تھا۔ اس کا یہ نسب نامہ اس کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہ السلام کا نسب نامہ ہوگا۔

یہ بائبل کے ۱۹۵۲ء کے نظر شدہ معیاری نسخہ کا متن ہے۔

متی کے مطابق جو نسب نامہ ہے وہ اس انجیل کے شروع میں دیا گیا ہے۔

یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہیم کا نسب نامہ

ابرہام سے اضحاق پیدا ہوئے اور اضحاق سے یعقوب پیدا ہوا اور یعقوب سے یہوداہ اور اس کے بھائی پیدا ہوئے اور یہوداہ سے فارص اور زارح تمر سے پیدا ہوئے اور فارص سے حصرون پیدا ہوا اور حصرون سے رام پیدا ہوا اور رام سے عمیند اب پیدا ہوا اور عمیند اب سے نحسون پیدا ہوا اور نحسون سے سلمون پیدا ہوا اور سلمون سے بوعز راجب پیدا ہوا اور بوعز سے عوبید روت پیدا ہوا اور عوبید سے یسعی پیدا ہوا اور یسعی سے داؤد بادشاہ پیدا ہوا۔

اور داؤد سے سلیمان اس عورت سے پیدا ہوا جو پہلے اوریاہ کی بیوی تھی۔ اور سلیمان سے رحبعام پیدا ہوا اور رحبعام سے ابیاہ پیدا ہوا اور ابیاہ سے آسا پیدا ہوا اور آسا سے یہوسفط اور یہوسفط سے یورام پیدا ہوا اور یورام سے عزیاہ پیدا ہوا اور عزیاہ سے یوتام پیدا ہوا اور یوتام سے آخز پیدا ہوا اور آخز سے حزقیاہ پیدا ہوا اور حزقیاہ سے منسی پیدا ہوا اور منسی سے امون پیدا ہوا اور امون سے یوسیاہ پیدا ہوا اور گرفتار ہو کر بابل جانے کے بعد یکونیاہ سے سیالتی ایل پیدا ہوا اور سیالتی ایل سے زربابل پیدا اور زربابل سے ابیہود پیدا ہوا اور ابیہود سے الیاقیم پیدا ہوا اور الیاقیم سے عازور پیدا ہوا اور عازور سے صدوق پیدا ہوا اور صدوق سے اخیم پیدا ہوا اور اخیم سے الیہود پیدا ہوا اور الیہود سے الیعزر پیدا ہوا اور الیعزر سے متان پیدا ہوا اور متان سے یعقوب پیدا ہوا اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا۔ یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلاتا ہے۔

پس سب پشتیں ابراہام سے داؤد تک چودہ پشتیں ہوئیں اور داؤد سے لے کر گرفتار ہوکر بابل جانے تک چودہ پشتیں اور گرفتار ہوکر بابل جانے سے لے کر مسیح تک چودہ پشتیں ہوئیں۔(متی ۱:۱۔۱۷)

لوقا نے جو نسب نامہ دیا ہے(۳:۲۳۔۳۸)وہ متی سے مختلف ہے۔جو متن پیش کیا گیا ہے۔وہ بائبل کے نظر ثانی شدہ معیاری نسخہ سے لیا گیا ہے۔

''جب یسوع خود تعلیم دینے لگا قریباً تیس برس کا تھا اور (جیسا کہ سمجھا جاتا تھا)یوسف کا بیٹا تھا اور وہ عیلی کا اور وہ متات کا اور وہ لاوی کا اور وہ ملکی کا اور وہ ینا کا اور وہ یوسف کا اور وہ متیاہ کا اور وہ عاموس کا اور وہ ناحوم کا اور وہ یوحناہ کا اور وہ نوگہ کا اور وہ ماعت کا اور وہ متتیاہ کا اور وہ شمعی کا اور وہ یوسخ کا اور وہ یوداہ کا اور وہ یوحنا کا اور وہ ریسا کا اور وہ زربابل کا اور وہ سالتی ایل کا اور وہ نیری کا اور وہ ملکی کا اور وہ ادی کا اور وہ قوسام کا اور وہ المودام کا اور وہ عیر کا اور وہ یسوع کا اور وہ الیعزر کا اور وہ یوریم کا اور وہ متات کا اور وہ لاوی کا اور وہ شمعون کا اور وہ یہوداہ کا اور وہ یوسف کا اور وہ یونان کا اور وہ الیاقیم کا اور وہ ملے آہ کا اور وہ مناہ کا اور وہ متتاہ کا اور وہ ناتن کا اور وہ داؤد کا اور وہ یسی کا اور وہ عوبید کا اور وہ بوعز کا اور وہ سلمون کا اور وہ نحسون کا اور وہ عمینداب کا اور وہ ارنی کا اور وہ حصرون کا اور وہ فارص کا اور وہ یہوداہ کا اور وہ یعقوب کا اور وہ اضحاق کا اور وہ ابراہام کا اور وہ تارہ کا اور وہ نحور کا اور وہ سروج کا اور وہ رعو کا اور وہ فلج کا اور وہ عبر کا اور وہ سلح کا اور وہ قینان کا اور وہ ارفکسد کا اور وہ سم کا اور وہ نوح کا اور وہ لمک کا اور وہ متوسلح کا اور وہ حنوک کا اور وہ یارد کا اور وہ مہللی ایل کا اور وہ قینان کا اور وہ انوس کا اور وہ سیت کا اور وہ آدم کا اور وہ خدا کا تھا۔''

یہ نسب نامے اس وقت اور بھی واضح ہو جاتے ہیں جب دو جدولوں میں پیش کیے جائیں۔ ایک داؤد سے قبل کے نسب نامہ کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری ان کے بعد کے۔

یسوع کا نسب نامہ

داوٗد سے قبل ۔۔۔۔۔۔۔۔اور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔داوٗد کے بعد

متی کے مطابق	لوقا کے مطابق	
متی	۱۔آدم	۱۱۔سم
ابراہام	۲۔سیت	۱۲۔ارفکسد
سے	۳۔انوس	۱۳۔قینان
قبل	۴۔قینان	۱۴۔سلح
کوئی	۵۔مہلل ایل	۱۵۔عبر
نام	۶۔یارد	۱۶۔فلج
نہیں	۷۔حنوک	۱۷۔رخو
بتاتے	۸۔متوسلح	۱۸۔سروج
	۹۔ملک	۱۹۔نخور
	۱۰۔نوح	۲۰۔تارہ
۱۔ ابرہام	۲۱۔ ابرہام	
۲۔ اضحاق	۲۲۔ اضحاق	
۳۔ یعقوب	۲۳۔ یعقوب	

۴۔ یہوداہ
۵۔ فارص
۶۔ حصرون
۷۔ رام
۸۔ عمینداب
۹۔ نحسون
۱۰۔ سلمون
۱۱۔ بوعز
۱۲۔ عوبید
۱۳۔ یسی
۱۴۔ داؤد
۱۵۔ سلیمان
۱۶۔ رحبعام
۱۷۔ ابیاہ
۱۸۔ آسا
۱۹۔ یہوسفط
۲۰۔ یورام
۲۱۔ عزیاہ
۲۲۔ یوتام

۲۴۔ یہوداہ
۲۵۔ فارص
۲۶۔ حصرون
۲۷۔ ارنی
۲۸۔ عمینداب
۲۹۔ نحسون
۳۰۔ سلمون
۳۱۔ بوعز
۳۲۔ عوبید
۳۳۔ یسی
۳۴۔ داؤد
۳۵۔ ناتن
۳۶۔ متتاہ
۳۷۔ مناہ
۳۸۔ ملے آہ
۳۹۔ الیاقیم
۴۰۔ یونان
۴۱۔ یوسف
۴۲۔ یہوداہ

۲۳۔ آخز ۴۳۔ شمعون

۲۴۔ حزقیاہ ۴۴۔ لاوی

۲۵۔ ملنسی ۴۵۔ متات

۲۶۔ امون ۴۶۔ یوریم

۲۷۔ یوسیاہ ۴۷۔ الیعزر

۲۸۔ یکونیاہ ۴۸۔ یسوع

بابل کی جانب جلاوطنی ۴۹۔ عیر

۲۹۔ سیالتی ایل ۵۰۔ المودام

۳۰۔ زربابل ۵۱۔ قوسام ۵۸۔ یوحناہ

۳۱۔ ابیہود ۵۲۔ ادی ۵۹۔ یوداہ

۳۲۔ الیاقیم ۵۳۔ ملکی

۶۰۔ یوسخ

۳۳۔ عازور ۵۴۔ نیری

۶۱۔ شمعی

۳۴۔ صدوق ۵۵۔ سالتی ایل ۶۲۔ متتیاہ

۳۵۔ اخیم ۵۶۔ زربابل ۶۳۔ ماعت

۳۶۔ الیہود ۵۷۔ ریسا

۶۴۔ نوگہ

۳۷۔ الیعزر ۶۷۔ عاموس ۶۵۔ اماۓاہ

۳۸۔ متان ۶۸۔ تیتیاہ

۶۶۔ ماحوم

۳۹۔ یعقوب ۶۹۔ یوسف ۷۳۔ متات

۴۰۔ یوسف ۷۰۔ نیا ۷۴۔ عیلی

۴۱۔ یسوع (مسیح) ۷۱۔ ملکی ۷۵۔ یوسف

۷۲۔ لاوی ۷۶۔ یسوع

مسیح

مخطوطات اور عہد نامہ قدیم کے اعتبار سے اختلافات

ہجوں کے اعتبار سے اختلاف کے علاوہ حسب ذیل اختلافات ملاحظہ ہوں۔

ا۔ متی کی انجیل

نسب نامہ ''کوڈیکس بزائی کینٹا برگیانس'' سے غائب ہو جاتا ہے جو چھٹی صدی کا یونانی اور لاطینی دونوں میں ایک اہم مخطوطہ ہے۔ یونانی متن سے یہ بالکل ہی غائب ہے اور لاطینی متن کا بھی ایک بڑا حصہ معدوم ہے۔ سادہ سی توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ ابتدائی صفحات ضائع ہو گئے۔

یہاں یہ امر واضح ہے کہ متی نے عہد نامۂ قدیم کے ساتھ کافی آزادی برتی ہے۔ انہوں نے ایک عجیب سی عددی یکسانیت حاصل کرنے کی غرض سے نسب ناموں میں کاٹ چھانٹ کر دی ہے۔ (جن کو وہ جیسا کہ ہمیں معلوم ہو گا آخر میں نہیں دیتے۔)

ب۔ لوقا کی انجیل

ا۔........ابرہام سے پہلے: لوقا بیس نام بتاتے ہیں۔ عہد نامہ قدیم میں کل (۱۹) مذکور ہیں۔ (اس کتاب کے عہد نامہ قدیم والے حصہ میں آدم کے اخلاف کی جدول ملاحظہ ہو) آرفکسد (نمبر ۱۲) کے بعد لوقا نے ایک ایسے شخص مسمی قینان

(نمبر ۱۳) کا اضافہ کر دیا ہے جس کو کتاب پیدائش میں ارنکسد کا بیٹا نہیں بتایا گیا ہے۔

۲۔......ابرہام سے داؤد تک: مخطوطات کے بموجب ۱۴ سے ۱۶ تک نام ملتے ہیں۔

۳۔......داؤد سے یسوع تک: سب سے زیادہ اہم اختلاف کوڈیکس بزائی کینٹابرگیانس کا ہے جو لوقا سے ایک عجیب وغریب نوع کا نسب نامہ منسوب کرتی ہے۔ جو متی سے لیا گیا ہے اور کاتب نے اس میں پانچ ناموں کا اضافہ کر دیا ہے۔ بدقسمتی سے متی کی انجیل کا نسب نامہ اس مخطوطہ سے غائب ہے۔ اس لیے موازنہ کا اب کوئی امکان نہیں رہا۔

متون کا باریک بینی سے جائزہ

یہاں ہمارے سامنے دو مختلف نسب نامے آتے ہیں۔جن میں ایک ضروری نکتہ مشترک ہے یعنی دونوں ابرہام اور داؤد سے ہو کر گزرتے ہیں۔ان جائزہ کو زیادہ آسان بنانے کے لیے ہم اس سب کو تین حصوں میں بانٹ دیں گے۔

۱۔ آدم سے ابرہام تک

۲۔ ابرہام سے داؤد تک

۳۔ داؤد سے یسوع تک

۱۔ آدم سے ابرہام تک کا دور

متی نے اپنا نسب نامہ ابرہام سے شروع کیا تھا۔ چنانچہ یہاں ہمارا ان کے متن سے کوئی سروکار نہیں ہے۔تنہا لوقا ابرہام کے اجداد کے بارے میں حضرت آدم تک کی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔کل ۲۰ نام ہیں جن میں سے ۱۹ کتاب پیدائش میں موجود ہیں۔(ابواب ۴، ۵ اور ۱۱) جیسا کہ پہلے ہی بتایا جاچکا ہے۔
کیا یہ یقین کرنا ممکن ہے کہ ابرہام سے پہلے نوع بشر کی صرف ۱۹ یا ۲۰ پشتیں ہی گزری تھیں؟ یہ مسئلہ عہدنامہ قدیم کی بحث میں پہلے ہی زیرغور آچکا ہے۔اگر کوئی شخص آدم کے اخلاف کی جدول پر نظر ڈالے جس کی بنیاد کتاب پیدائش پر ہے اور بائبل کے متن میں شامل وقت کے جو اعداد دیئے گئے ان کو دیکھے تو یہ بات معلوم

ہوسکتی ہے کہ ہبوط آدم اور ابرہام کی ولادت کے درمیان تقریباً ۱۹ صدیاں گزر گئیں۔ آج کل یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ابرہام ۱۸۵۰ ق م میں حیات تھے اور اسی سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ عہد نامہ قدیم میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، اس کے مطابق انسان کا سطح ارض پر ظہور تقریباً ۳۸ صدی قبل مسیح ہوا تھا۔ واضح طور پر لوقا کو اپنی انجیل کے لیے اسی سے رہبری حاصل ہوئی۔ وہ بہت شدومد سے یہ غلط بیانی کرتے ہیں کہ میں نے ان سے نقل کیا ہے اور ہمیں پہلے ہی اس بیان تک پہنچنے کے لیے فیصلہ کن تاریخی دلائل مل چکے ہیں۔

یہ خیال کہ عہد نامۂ قدیم میں دیئے گئے اعداد وشمار موجودہ زمانے میں نا قابل قبول ہیں، حتمی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔ یہ اعداد اس خلاف شدہ مواد سے تعلق رکھتے ہیں جس کا حوالہ دوسری ویٹی کن کونسل میں دیا گیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت کہ اناجیل نے سائنسی اعتبار سے ان ہی غیر صحیح اعداد کو لے لیا ہے۔ ایک انتہائی قابل لحاظ جائزہ ہے جس کو ان لوگوں کی مخالفت میں استعمال کیا جاسکتا ہے جو انجیل کے متون کی تاریخی صحت کی حمایت کرتے ہیں۔

شارحین نے اس خطرہ کو جلد ہی محسوس کرلیا ہے۔ وہ اس مشکل کو یہ کہہ کر رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ مکمل شجرۂ نسب نہیں ہے۔ اور یہ کہ انجیل کے مرتب نے نام چھوڑ دیئے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ کام بالکل سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا اور مرتب کا واحد مقصد یہ تھا کہ ''وہ واضح خطوط یا نسب نامہ کے ان لازمی ناموں کو دے دے جن کی بنیاد تاریخی حقیقت پر ہے۔'' (۲) متون میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ان کو اس مفروضہ کے قائم کرنے کی اجازت دیتا ہو۔ متن میں

صاف طور پر بتایا جا رہا ہے: عمرو، بکر کا باپ ہے اور بکر عمرو کا بیٹا۔ علاوہ ازیں ابرہام سے پہلے کے حصے کے لیے بالخصوص انجیل کے مرتب عہد نامہ قدیم سے اخذ کرتے ہیں جہاں نسب نامے حسب ذیل شکل میں مرتب کیے گئے ہیں۔

جب فلاں شخص کی عمر اتنے سال کی ہوئی تو وہ فلاں شخص کا باپ بنا۔ جب فلاں کا سن اتنے سال کا ہوگیا تو وہ فلاں شخص کا باپ بن گیا........

اس لیے درمیان میں کوئی انقطاع نہیں ہوتا۔

لوقا کے بموجب یسوع کا وہ نسب نامہ جو ابرہام سے پہلے پڑتا ہے۔ جدید معلومات کی روشنی میں قابل قبول نہیں ہوتا۔

۲۔ ابرہام سے داؤد تک کا زمانہ

یہاں دونوں نسب ناموں میں مطابقت ہو جاتی ہے۔ (یا تقریباً یکساں ہیں) بجز ایک یا دو ناموں کے اس فرق کی تاویل کاتب کی غلطی کہہ کر کی جا سکتی ہے۔

تاریخ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تقریباً ۱۰۰۰ سال قبل مسیح قرار دیتی ہے اور ابرہام کے دور کو ۱۸۰۰۔۱۸۵۰ ق م بتاتی ہے۔ ۱۴ سے ۱۶ پشتیں تقریباً آٹھ صدیوں کے لیے کیا اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے؟ اس دور کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ انجیل کے متون قابل قبول ہونے کے لیے آخری حد پر پہنچ جاتے ہیں۔

۳۔ حضرت داؤد کے بعد کا دور

اس دور کی حالت قابل رحم ہے۔لیکن بدقسمتی سے متون کی مطابقت اس وقت باقی ہی نہیں رہتی جب داؤد سے یوسف کا نسلی رشتہ قائم کیا جاتا ہے اور انجیل کی زبان میں کہیں تو یسوع کا رشتہ۔

اس صریح غلط بیانی کو جو لوقا کے بارے میں کوڈیکس بزائی کینٹا برگیانس میں کی گئی ہے۔نظر انداز کر کے ہم اب اس چیز کا موازنہ کرتے ہیں جو دونوں انتہائی مقدس مخطوطے پیش کرتے ہیں۔ایک کوڈیکس ویٹیکانس اور دوسرا کوڈیکس سینائی ٹیکس۔

لوقا کے بموجب نسب نامہ میں داؤد (نمبر ۳۵) کے بعد ۴۲ نام مسیح (نمبر ۷۷) تک دیئے گئے ہیں۔متی کے مطابق داؤد (نمبر ۱۴) سے مسیح (نمبر ۴۱) تک ۲۷ نام بتائے گئے ہیں۔لہٰذا داؤد کے بعد یسوع کے فرضی آباؤاجداد کی تعداد جو دونوں انجیلوں میں دی گئی ہے۔وہ مختلف ہے،خود نام بھی مختلف ہیں۔

پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔

متی ہمیں بتاتے ہیں کہ انہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ یسوع کا نسب نامہ ابرہام کے بعد ۱۴ ناموں کے تین گروپوں میں بٹ جاتا ہے۔پہلا گروپ ابرہام سے داؤد تک۔دوسرا داؤد سے بابل کی جانب جلاوطنی تک۔تیسرا جلاوطنی سے یسوع تک۔ان کے متن میں فی الحقیقت پہلے دو گروپوں میں ۱۴،۱۴ نام ہیں۔البتہ تیسرے میں یعنی جلاوطنی سے یسوع تک محض ۱۳ نام ہیں۔اور چودہ نہیں ہیں جیسا کہ ہونا چاہیے۔شجرہ سے پتہ چلتا ہے کہ سیالتی ایل کا نمبر ۲۹ اور یسوع کا نمبر ۴۱ ہے۔متی کے ہاں کوئی ایسا متبادل نسخہ نہیں ہے جو اس گروپ میں ۱۴ نام بتاتا

ہو۔ اپنے قائم کردہ دوسرے گروپ میں ۱۴ نام پورے کرنے کے لیے متی عہد نامہ قدیم کے متن کو بڑی آزادی کے ساتھ کام میں لاتے ہیں۔ داؤد کے پہلے چھ اخلاف کے نام (نمبر ۱۵ تا ۲۰) عہد نامہ قدیم میں دیئے ہوئے ناموں سے مل جاتے ہیں۔ لیکن یورام (نمبر ۲۰) کے تین اخلاف جو بائبل کے حصہ تواریخ ۲ میں عزریاہ، یوراس، امصیاہ کے ناموں کو متی نے دبا دیا ہے۔ ایک اور موقع پر یکونیاہ (نمبر ۲۸) متی کے نزدیک یوسیاہ کا بیٹا ہے۔ حالانکہ سلاطین ۔۲ میں جو بائبل کا ایک حصہ بتایا گیا ہے یوسیاہ اور یکونیاہ کے درمیان الیاقیم کا نام آتا ہے۔

اس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ متی نے عہد نامہ قدیم میں دیئے ہوئے نسب نامہ کو داؤد اور اسیری بابل کے درمیان ۱۴ ناموں کا ایک مصنوعی گروپ بنانے کے لیے بدل دیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ متی کے قائم کردہ تیسرے گروپ میں ایک نام غائب ہے۔ لہٰذا دور حاضر کی انجیل کے متون میں کسی میں بھی وہ بیالیس نام موجود نہیں ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو بات حیرت خیز ہے وہ اتنا زیادہ ایک نام کا ترک ہونا نہیں ہے (غالباً اس کی توجیہہ تو یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ بہت عرصہ ہوا کسی کاتب کی غلطی تھی جو بعد میں مستقل صورت اختیار کر گئی۔) جتنا کہ اس موضوع پر شارحین کا مکمل سکوت ہے۔ اس ترک کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ڈبلیو ٹریلنگ اپنی کتاب ''متی کے بموجب انجیل'' (لے وانژیل سیلون ماتیو) میں خاموشی اور سکوت کی اس مقدس سازش کا پردہ چاک کر دیتے ہیں اور اس کے لیے صرف ایک سطر وقف کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جو انتہائی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس انجیل کے شارحین جن میں دوسروں کے علاوہ عالمی

ترجمہ اور کارڈینال ڈینیلو بھی شامل ہیں متی کی ۳×۱۴ کی علامتی خوبی پر بڑا زور دیتے ہیں۔ انجیل کے مرتب کے لیے یہ خوبی اس درجہ اہم ہے کہ اس نے اپنے عددی مظاہرہ پر پہنچنے کے لیے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بائبل کے ناموں کو دبا دیا ہے۔

اس کو صحیح بنانے کے لیے شارحین یقیناً معذرت خواہانہ نوعیت کے بعض ایسے یقین دلانے والے بیانات وضع کر لیں گے جن سے یہ واقعہ حق بجانب ہو جائے کہ ناموں کو نہایت فنی کاری سے دبایا گیا ہے اور وہ لوگ ہوشیاری کے ساتھ اس ترک سے بچیں گے جو اس تمام نکتہ کو اکھاڑ پھینکتا ہے جو انجیل کا مرتب ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تفاسیر میں جدید ماہرین کی تشریحات

اپنی کتاب ''عالم طفلی کی انجیل'' (۱۹۶۷ء) (لے ثرے دانتریلی دے لیفنانس) (۳) میں کارڈینال ڈینیلو متی کے ''عددی نقشے'' کو انتہائی اہمیت کی ایک علامتی قدر کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ''یہی تو وہ ذریعہ ہے جس سے یسوع کے آباؤ اجداد کے بارے میں اس امر کا تعین ہوتا جس کی تصدیق لوقا نے بھی کی ہے۔'' ان کے نزدیک لوقا اور متی ''مورخین'' ہیں جنہوں نے اپنی تاریخی تحقیقات کو مکمل کرلیا ہے اور ''نسب نامہ یسوع کے خاندان کے محافظ خانے سے حاصل کیا گیا ہے۔'' یہاں اس بات کا بھی اضافہ کر دینا پڑے گا کہ محافظ خانے کبھی دریافت نہیں ہوئے۔(۴)

کاردینال ڈینیلو چھوٹتے ہی ہر اس شخص کو ملامت کرنے لگتے ہیں جو ان کے نقطہ نظر پر تنقید کرتا ہے۔''یہ مغربی ذہنیت ہے۔یہودوی عیسائیت سے ناواقفیت اور سامی نظریہ کا فقدان ہے جس نے تفاسیر کے اتنے ماہرین کو اناجیل کی تشریح کرتے وقت ان کے راستے سے بھٹکا دیا ہے۔انہوں نے اپنے ذہنی قالبوں کو ان پر منڈھا ہے (مثلاً) افلاطونی، کارتیزی ہیگلین اور ہڈیگری وغیرہ۔اس سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ انکے ذہنوں میں ہر چیز کیوں گڈمڈ ہوگئی ہے۔'' افلاطون، دے کارت، ہیگل اور ہیڈیگر کا واضح طور پر اس تنقیدی طرز عمل سے کوئی واسطہ نہیں ہے جو لوگوں نے ان فرضی نسب ناموں کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے۔

متی کے ۳ □x۱۴ کے معنی و مفہوم کے کھوج میں مصنف عجیب وغریب قسم

کے مفروضات قائم کرتا ہے جو اس موقع پر درج کر دینے کے قابل ہیں۔" اس کا جو مطلب لیا جا سکتا ہے وہ یہودوی مکاشفہ کے عمومی دس ہفتے ہیں۔ پہلے تین جو آدم سے ابرہام تک کے وقت سے مطابقت رکھتے ہیں خارج کر دیئے جاتے ہیں۔ تب سالوں کے سات ہفتے رہ جاتے ہیں۔ پہلے چھ، سات کے اس چھ گنے سے مطابق ہو جاتے ہیں جو چودہ کے تین گروپوں کو ظاہر کرتے ہیں اور پھر ساتواں باقی رہ جاتا جو یسوع مسیح سے شروع ہوتا ہے جن سے دنیا کے ساتویں دور کا آغاز ہوتا ہے۔" اس نوع کی تشریحات تنقید و تبصرہ سے ماورا ہیں۔

عالمی ترجمہ کے شارحین۔ عہدنامہ جدید بھی ایک معذرت خواہانہ انداز کا عددی نظریہ پیش کرتے ہیں جو مساوی طور پر غیر متوقع ہیں۔

متی کے ۳ □x۱۴ کے لیے

(ا) ۱۴ عبرانی نام داؤد (ڈی = ۴، وی = ۶) میں تین حروف صحیح کا عددی مجموعہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ۴+۶+۴=۱۴

(ب) ۳ □x۱۴=۶x۷ اور یسوع اس مقدس تاریخ کے جو ابرہام سے شروع ہوتی ہے چھ ہفتے کے اختتام پر آئے۔

لوقا کے مطابق اس ترجمہ میں آدم سے یسوع تک ۷۷ نام دیئے گئے ہیں جس میں ۷ کا عدد بار دیگر آیا ہے۔ اس مرتبہ ۷۷ کو ۷ پر تقسیم کر کے ہوا (۷x۱۱=۷۷) یہ بالکل واضح ہے کہ لوقا کے لیے تحریفات کی یہ تعداد جہاں الفاظ جوڑے جاتے یا گھٹائے جاتے ہیں ایسا ہی ہے کہ ۷۷ ناموں کی یہ فہرست بالکل من گھڑت ہے۔ تاہم اس کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ یہ ان عددی کھیلوں سے مطابقت

اختیار کر لیتی ہے۔

یسوع کے جو نسب نامے اناجیل میں پائے جاتے ہیں وہ غالباً ایسا موضوع بن گئے ہیں جنہوں نے عیسائی شارحین کو جدلیاتی بازیگری کے ایسے انتہائی خصوصی نوعیت کے کرتب دکھانے کی طرف مائل کر دیا ہے جو لوقا اور متی کے تخیل کی یقیناً ہم سطح ہیں۔

حواشی

۱۔ انجیلوں میں بعض اوقات یسوع مسیح کے بھائیوں اور بہنوں کے حوالے ملتے ہیں (متی ۱۲۔۴۶:۵۰ اور ۵۴۔۵۶، مرقس ۶:۱۔۶، یوحنا ۷، ۳ اور ۲، ۱۲) یونانی زبان کے الفاظ ''ایڈیلفوئی'' اور ''ایڈیلفائی'' یقیناً سگے بھائیوں اور بہنوں کو ظاہر کرتے ہیں لیکن غالباً وہ ابتدائی سامی الفاظ کا ناقص ترجمہ ہیں جن کا مفہوم ثانی ہے۔ اس صورت سے غالباً وہ چچیرے بھائی بہن تھے۔

۲۔ اے ڑی کوٹ عہدنامہ جدید کی چھوٹی لغت (پیتی وکتیونارڈ ونوایوے تیتاماں ان لاینت بیل ''و یسکلے۔ شائع کردہ۔ پیرس)

۳۔ ایڈی سیون دوسیوں۔ پاری (پیرس)

۴۔ حالانکہ مصنف ہمیں یہ یقین دلاتے ہیں کہ ان کو ''کلیسا کی تاریخ'' مصنفہ یوزی بیس چمیفلی (جس کے ماننے اور تسلیم کرنے کے سلسلہ میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے) سے ان مفروضہ محافظ خانوں کی موجودگی کا علم ہوا ہے۔ تاہم یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یسوع کے خاندان نے دو شجرے کیوں تیار کیے تھے جو بنیادی طور پر مختلف تھے اس لیے ان دونوں نام نہاد ''مورخین'' میں سے ہر ایک نے جو نسب نامہ دیا ہے وہ بڑی حد تک ان لوگوں کے ناموں کے سلسلہ میں مختلف ہے۔ جو یسوع کے اجداد کی صف میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔

باب پنجم

بیانات میں

تضادات اور ناممکنات

چار انجیلوں یں سے ہر ایک میں متعدد واقعات کے بیانات ایسے ہیں جن میں یا تو کوئی ایک انجیل منفرد ہے یا اگر سب میں نہیں تو وہ واقعات کئی میں مشترک ہیں۔ جب وہ واقعات کسی ایک انجیل میں منفرد ہوتے ہیں۔ اس وقت ان سے بڑے شدید نوعت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک انتہائی اہمیت کے واقعہ کی حالت میں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کو صرف ایک انجیل کے مرتب نے ہی بیان کیا ہے۔ مثال کے لیے قبر سے نکلنے کے دن مسیح کے آسمان پر اٹھائے جانے کے واقعہ کو لے لیجئے۔ ہر کہیں بہت سے واقعات کو مختلف طریقوں پر بیان کیا گیا ہے۔ بعض دفعہ تو واقعی بہت ہی مختلف ہو جاتے ہیں اور یہ اختلاف دو یا زیادہ انجیل کے مرتبین کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ عیسائی اکثر اوقات انجیلوں کے مابین اس قسم کے اختلافات کی موجودگی پر حیران وششدر رہ جاتے ہیں، اس صورت میں کہ وہ اختلافات ان کے علم میں آجائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو انتہائی تیقن کے ساتھ بار بار بتایا جاتا رہا ہے کہ عہد نامہ جدید کے مصنفین ان

واقعات کے جو وہ بیان کرتے ہیں عینی شاہد تھے۔

ان پریشان کن تضادات اور ناممکنات میں سے کچھ سابقہ ابواب میں بتائے جا چکے ہیں۔تاہم یہ خصوصیت سے یسوع کی زندگی کے آخری واقعات ہیں جن کے ساتھ دور ابتلاء کے بعد والے واقعات بھی شامل ہو گئے ہیں جو متنوع اور متضاد بیانات کا موضوع بنتے ہیں۔

دورِ ابتلاء کے بیانات

فادر روگے بذات خود اس بات کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ یسوع کے اپنے حواریوں کے ساتھ آخری شام کے کھانے کے تعلق سے کتب متفقہ (متی، مرقس اور لوقا کی انجیلوں) اور یوحنا کی انجیل میں عید فسخ کو مختلف وقتوں پر بتایا گیا ہے۔ یوحنا آخری کھانے کو عید فسخ کی تقریبات سے پہلے قرار دیتے ہیں اور باقی تین انجیلوں کے مرتبین خود تقریبات کے دوران بتاتے ہیں۔ اس اختلاف سے واضح قسم کی ناممکنات کا صدور ہو جاتا ہے۔ جب کسی شخص کو اس اہمیت کا علم ہوتا ہے جو اس واقعہ کو یہودی قسم کی عشائے ربانی میں ہے اور اس طعام کی اہمیت کا پتہ چلتا جس میں یسوع اپنے حواریوں کو الوداع کہتے ہیں تو یقین کرنا کیسے ممکن ہے کہ ایک واقعہ کی دوسرے واقعات کے لحاظ سے یاد اس حد تک اس روایت میں جو انجیلوں کے مرتبین نے محفوظ کی دھندلکے میں چلی گئی؟

ایک زیادہ عام سطح پر ابتلاء کے زمانہ کے بیانات انجیل کے ایک مرتب سے دوسرے مرتب کے ہاں مختلف ہیں اور خصوصیت سے یوحنا اور پہلی تین انجیلوں کے مابین یہ اختلاف زیادہ ہے۔ آخری کھانا اور دورِ ابتلاء یوحنا کی انجیل میں دونوں ہی بہت طویل ہیں۔ یہاں تک کہ مرقس اور لوقا کے مقابلہ میں یہ مدت دگنی ہے۔ اور متی کے متن سے تقریباً ڈیڑھ گنا ہے۔ یوحنا یسوع کی ایک طویل تقریر درج کرتے ہیں، جو انہوں نے اپنے حواریوں کے سامنے کی تھی۔ (۱۴ تا ۱۷) اس اہم تقریر کے دوران یسوع اعلان کرتے ہیں کہ میں آخری ہدایات چھوڑوں گا

اوران کو اپنا آخری عہد نامہ دیتے ہیں۔ دوسری انجیلوں میں اس کا کوئی نشان نہیں ہے۔ بنابریں یہی عمل دوسرے طریقہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ متی، لوقا اور مرقس جیسمیں کے باغ میں مرقس کی دعا بیان کرتے ہیں لیکن یوحنا اس کا ذکر نہیں کرتے۔

یوحنا کی انجیل میں عشائے ربانی کی رسم کا تذکرہ نہیں ہے

سب سے اہم حقیقت جو یوحنا کی انجیل میں قاری کو دورِ ابتلاء میں تذکرہ پڑھتے وقت کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ یوحنا یسوع کے اپنے حواریوں کے ساتھ آخری کھانے کے دوران ماس کی رسم کا قطعاً کوئی حوالہ نہیں دیتے۔

کوئی بھی عیسائی ایسا نہیں ہے جو آخری کھانے کی مورتیوں کے بیان سے واقف نہ ہو جب کہ یسوع آخری بار اپنے حواریوں کے درمیان دسترخوان پر بیٹھتے ہیں۔ دنیا کے عظیم ترین نقاشوں نے اس آخری اجتماع کو ہمیشہ اس طرح پیش کیا ہے کہ یوحنا کو یسوع کے دائیں جانب بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یوحنا وہی صاحب ہیں جن کو ہم اسی نام کی انجیل کے مصنف کی حیثیت سے سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

تاہم یہ امر بہت سے لوگوں کو خواہ کتنا ہی حیرت ناک معلوم ہو لیکن ماہرین کی اکثریت ایسی ہے جو یوحنا کو چوتھی انجیل کا مصنف نہیں مانتے۔ نہ ہی موخر الذکر ماس کی رسم کا ذکر کرتے ہیں۔ روٹی اور شراب کا نذر و نیاز جو یسوع کے گوشت اور خون قرار دیے گئے ہیں، عیسائی عشائے ربانی کا سب سے زیادہ لازمی عمل ہے۔ دوسری انجیلوں کے مرتبین اس کا حوالہ دیتے ہیں، خواہ جیسا کہ ہم صدر میں بتا چکے ہیں وہ اس تذکرہ میں مختلف البیان ہی ہوں۔ یوحنا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ چاروں انجیلوں کے بیانات میں صرف دو باتیں مشترک ہیں۔ پطرس کے انکار کرنے اور حواریوں میں کسی ایک کے دھوکہ دینے کی پیشین گوئی (یہوداہ

اسکر یوتی کا نام حقیقی طور پر صرف متی اور یوحنا میں دیا گیا ہے) یوحنا کا بیان اس معاملے میں منفرد ہے کہ اس میں کھانے کے شروع میں یسوع کے اپنے حواریوں کے پاؤں دھلانے کا حوالہ ملتا ہے۔(۱)

یوحنا کی انجیل میں اس ترک کی تاویل کیسے کی جاسکتی ہے؟

اگر کوئی شخص معروضی طور پر توجیہہ کرتا ہے تو وہ دعویٰ جو فوری طور پر دفاع میں پیدا ہوتا ہے (ہمیشہ یہ خیال کرتے ہوئے کہا کہ جو کہانی باقی تین انجیلوں کے مرتبین نے بیان کی ہے صحیح ہے) کہ یوحنا کی انجیل کا وہ ٹکڑا جو مذکورہ واقعہ کو بیان کرتا تھا ضائع ہو گیا ہے۔عیسائی شارحین اس نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔

اب ہم ان چند نقطہ ہائے نظر کا جائزہ لیتے ہیں جو انہوں نے اختیار کیے ہیں۔ اپنی عہد نامہ جدید کی چھوٹی لغت (پیٹی ڈکسیونار دونو دے تیتا ماں) میں آخری طعام (سین) کے تحت اے ترِیکو یہ بیان دیتے ہیں۔

”آخری کھانا یسوع نے اپنے بارہ حواریوں کے ساتھ کھایا جس میں انہوں نے ماس کی رسم کا آغاز کیا۔اس کا تذکرہ کتب متفقہ میں موجود ہے۔“ (متی، مرقس اور لوقا کے حوالے ہیں)... ”اور چوتھی انجیل ہمیں مزید تفصیلات فراہم کرتی ہے۔“ (یوحنا کے حوالے)اس کے بارے میں جو اندراج ہے اس کے متعلق یہی مصنف حسب ذیل تحریر پیش کرتے ہیں۔”ماس کی رسم پہلی تین انجیلوں میں اختصار سے بیان کی گئی ہے۔یہ مذہبی تعلیمات کے پاپائی طرز کا انتہائی اہم جزو ہے۔سینٹ یوحنا نے ان مختصر بیانات پر اس تذکرہ میں ایک غیر منفک تکملہ کا اضافہ کیا ہے،جس میں انہوں نے یسوع کی زندگی کی روٹی پر وعظ کے متعلق لکھا

ہے۔(۶:۳۲۔۵۸)

نیتجتاً شارح نے یہ بات نہیں بتائی کہ یوحنا یسوع کی عشائے ربانی کی رسم کا ذکر نہیں کرتے۔ مصنف تکمیلی تفصیلات پر گفتگو کرتا ہے۔ لیکن یہ تفصیلات عشائے ربانی کی تکمیلی نہیں ہے۔ (وہ بنیادی طور پر حواریوں کے پاؤں دھلانے کی تقریب کو بیان کرتے ہیں) شارح زندگی کی روٹی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے لیکن (آخری کھانے سے بالکل جداگانہ) یسوع کا یہ حوالہ خدا کے اس انعام کے سلسلہ میں ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرکردگی میں یہودیوں کے خروج کے وقت صحرانوردی میں من وسلویٰ کی شکل میں نازل ہوا تھا۔ انجیلوں کے مرتبین میں یوحنا واحد شخص ہیں جو اس تلمیح کو بیان کرتے ہیں۔ اپنی انجیل کی اگلی عبارت میں یوحنا یقیناً یسوع کے عشائے ربانی کے حوالے کو روٹی پر تجاویز کی شکل میں بیان کرتے ہیں لیکن کوئی دوسرا انجیل کا مرتب اس واقعہ کے متعلق گفتگو نہیں کرتا۔

اسی لیے ان دونوں امور پر ہر ایک شخص کو حیرت ہوتی ہے کہ جو بات باقی تین مرتبین انجیل بیان کرتے ہیں اس پر یوحنا خاموش رہتے ہیں، اور اس بات پر جو یوحنا کے بموجب یسوع نے پیشین گوئی کے طور پر کہی تھی وہ لوگ خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

بائبل، عہد نامہ جدید کے عالمی ترجمہ کے شارحین یوحنا کی انجیل میں اس ترک کا ضرور اعتراف کرتے ہیں۔ اس واقعہ کو کہ عشائے ربانی کی رسم کا تذکرہ غائب ہے بتاتے ہوئے وہ یہ تشریح پیش کرتے ہیں۔ ''عام طور پر یوحنا قدیم اسرائیلی روایات اور رسوم کے بیان کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ ہوسکتا ہے کہ اسی چیز

نے ان کو عید فسخ پر عشائے ربانی کے قیام کا اظہار کرنے سے باز رکھا ہو۔'' کیا ہم لوگ سنجیدگی سے اس بات پر یقین کر لیں کہ یہودی عید فسخ میں عدم دلچسپی ہی وہ سبب تھا جس نے یوحنا کو جدید مذہب کی عشائے ربانی میں انتہائی اساسی نوعیت کے عمل کی ایک رسم کو بیان کرنے سے باز رکھا؟

تفاسیر کے ماہرین اس مسئلے سے ایسے بوکھلائے کہ مذہبی لوگوں نے اپنے دماغوں کو پیشین گوئیوں یا یسوع کی زندگی کے واقعات میں عشائے ربانی کے مترادف باتوں کو جو یوحنا نے بیان کی ہیں تلاش کرنے میں لگا دیا ہے۔ مثلاً اوکلمان اپنی کتاب ''عہد نامہ جدید'' (لے نوا یو ے تیتا ماں) میں بیان کرتے ہیں کہ ''پانی کا شراب کی شکل میں تبدیل ہو جانا اور پانچ ہزار کو کھانا کھلا دینا۔ آخری کھانے (عشائے ربانی) کی متبرک رسم کا پیشگی نمونہ ہے'' یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پانی شراب میں اس لیے تبدیل ہوا کہ موخر الذکر قانا کے مقام پر ایک شادی میں ٹھہر گئی تھی (یہ یسوع کا پہلا معجزہ تھا جو یوحنا نے باب ۲: ۱۔۱۲ میں بیان کیا ہے۔ (۲) وہ واحد مرتب انجیل ہیں جنہوں نے یہ بات بتائی) جہاں تک پانچ ہزار کو کھلانے کا تعلق ہے یہ ان لوگوں کی تعداد تھی جن کو جو کے پانچ کلچوں پر کھانے کے لیے بٹھایا گیا اور ان کی تعداد میں معجزانہ طریقے پر اضافہ ہو گیا۔ یوحنا جب ان واقعات کو بیان کرتے ہیں تو وہ ان پر کوئی خاص تبصرہ نہیں کرتے اور اس سے ملتا جلتا واقعہ تفسیر کرتے وقت اس ماہر کے دماغ میں موجود رہتا ہے۔ کسی شخص کی سمجھ میں اس واقعہ کی جو وہ (ماہر) اس سے اخذ کرتا ہے اس کے اس نظریہ کے سوا کوئی دلیل نہیں آتی کہ ایک مفلوج شخص کو اچھا کرنے اور ایک مادر زاد اندھے کو بینائی

عطا کرنے سے بپتسما کی پیش گوئی ہوتی ہے، اور یہ کہ پانی اور خون جو یسوع کے قریب سے ان کی رحلت کے بعد جاری ہوئے ایک واحد حقیقت بن جاتے ہیں جو بپتسما اور عشائے ربانی دونوں کے حوالے ہیں۔

عشائے ربانی سے متعلق ایک اور نظیر، جو یہی ماہر تفسیر میں پیش کرتا ہے، فادر روگے اس کا حوالہ اپنی کتاب ''انجیل کی ابتداء'' (انی سی ایسیون ایوانژیل) میں دیتے ہیں۔ ''بعض علمائے دین جیسے آسکر کلمان (او کلمان) آخری کھانے سے پہلے پیروں کو دھونے کے بیان میں عشائے ربانی کی رسم سے ایک علامتی مترادف نکال لیتے ہیں.....''

تمام نظائر کی جو شارحین نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے اختراع کی ہیں تا کہ وہ زیادہ آسانی سے یوحنا کی انجیل کی ان انتہائی پریشان کن فروگذاشتوں کو مان لیں معقولیت تلاش کر لینا مشکل ہے۔

یسوع کے مردوں میں سے اٹھنے کی وہمی صورتیں

ایک بیان میں تخلیق کی کارفرمائی کی ایک عمدہ مثال اس غیر معمولی واقعہ کی تصویر کشی کے سلسلے میں پہلے ہی پیش کی جا چکی ہے جو متی کی انجیل میں یسوع کی رحلت کے ساتھ رونما ہونے کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ رفع مسیح کے بعد جو واقعات پیش آئے انہوں نے انجیلوں کے تمام ہی مرتبین کے لیے متضاد اور نامعقول بیانات کے لیے مواد فراہم کیا۔

فادر روگے اپنی کتاب ''انجیل کی ابتداء'' صفحہ ۱۸۲ پر اس انتشار، بدنظمی اور تضاد بیانی کی مثالیں پیش کرتے ہیں جو ان تحریروں میں کارفرما ہے۔

''ان عورتوں کی فہرست جو مقبرہ پر آئیں تینوں کتب متفقہ (متی، مرقس اور لوقا کی انجیلوں) میں سے ہر ایک میں یکساں نہیں ہے۔ یوحنا کے مطابق صرف ایک عورت آئی تھی یعنی میری میگڈ یلین۔ لیکن اس کی گفتگو جمع کے صیغہ میں ہوتی ہے جیسے کہ وہ کسی کی معیت میں ہے۔ ''ہمیں نہیں معلوم کہ انہوں نے اس کو کہاں دفن کیا ہے۔'' متی کی انجیل میں فرشتہ عورتوں کو بطور پیش گوئی بتاتا ہے کہ یہ یسوع کا دیدار گلیل میں کریں گی لیکن چند لمحوں بعد یسوع مقبرہ کے قریب ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ غالباً لوقا اس وقت دشواری کا احساس کر لیتے ہیں اور ماخذ کو تھوڑا سا بدل دیتے ہیں۔ فرشتہ کہتا ہے۔ ''یاد کیجئے کہ جب وہ گلیل ہی میں تھا تو اس نے تم سے کیا کہا تھا...'' ''حقیقت میں لوقا محض تین وہمی صورتوں کا حوالہ دیتے ہیں...''

''یوحنا یروشلم کے بالائی کمرے میں ایک ہفتے کے وقفہ سے دو وہمی صورتوں کا تعین

کرتے ہیں اور تیسری کو جھیل کے قریب یعنی گلیل میں بتاتے ہیں۔ متی گلیل میں محض ایک وہمی صورت کا اندراج کرتے ہیں۔'' شارح اس جائزہ سے مرقس کی انجیل کے آخری جز کو خارج کر دیتا ہے جس کا تعلق وہمی صورتوں سے ہے اس لیے کہ اس کو یقین ہے کہ غالباً اس کی تحریر میں کوئی دوسرا ہاتھ تھا۔

یہ تمام حقائق یسوع کی ان وہمی صورتوں کے تذکرہ کی تردید کرتے ہیں جو پال کے کورنتھیوں کے نام پہلے خط میں مذکور ہیں۔ (۱۵: ۵۔۷) (۳) اور جو صورتیں ایک دم پانچ سو سے زیادہ لوگوں کو، یعقوب کو، پھر رسولوں کو اور پھر فی الحقیقت خود پال کو دکھائی دیں۔

لہٰذا اس کے بعد فادر روگے کی اسی کتاب میں یہ نکتہ چینی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جب رفع مسیح پر گفتگو کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ''بعض اسفار محرفہ میں شکوہ لفظی اور طفلانہ قسم کی توہم پرستی دکھائی دیتی ہے۔'' یقیناً یہ الفاظ خود متی اور پال کے لیے پوری طرح موزوں ہیں۔ وہ یسوع کے مردوں میں سے اٹھنے کی وہمی صورتوں کے موضوع پر دوسری انجیلوں سے قطعاً متناقض ہیں۔

اس سے ہٹ کر رسولوں کے اعمال میں یسوع کی وہمی صورت کے بیان میں لوقا اور پال کے درمیان تضاد ہے اور اس بات میں بھی تناقض ہے جو خود پال اس کے متعلق ایجاز کے ساتھ ہمیں بتاتے ہیں۔ اسی چیز نے فادر کینن ڑی ایسے کو اپنی کتاب ''رفع مسیح کا عقیدہ، عقیدہ کا کھوڈ النا'' ۱۹۷۴ء میں اس بات پر زور دینے کی جانب مائل کیا ہے کہ پال جو مسیح کے اٹھائے جانے کے واحد عینی شاہد تھے اور ان ہی کی تحریروں کے ذریعہ مسیح کی آواز براہ راست ہم تک پہنچتی ہے، وہ کہیں بھی

یسوع مسیح کے ساتھ اپنی ذاتی مڈبھیڑ کا ذکر نہیں کرتے۔ وہی مسیح جو مردوں کے درمیان سے اٹھائے گئے تھے.... سوائے تین انتہائی محتاط حوالوں کے...... وہ اس کے بیان کرنے تک سے احتراز کرتے ہیں۔

پال کے جو واحد عینی شاہد تھے لیکن غیر معتبر ہیں اور اناجیل کے درمیان تضاد بالکل واضح ہے۔

اوکلمان اپنی کتاب ''عہد نامہ جدید'' (لونیووے تیتاماں) میں لوقا اور متی کے مابین تضادات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اول الذکر یسوع کے ظہور کو یہودہ میں اور ثانی الذکر گلیل میں قرار دیتے ہیں۔

لوقا اور یوحنا کے تضاد کو بھی یاد رکھنا ضروری ہے۔ یوحنا (۲۱:۱۔۱۴) (۴) ایک ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں جس میں یسوع مردوں کے درمیان سے اٹھ کر بحیرۂ طبریا کے قریب ماہی گیروں کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اتنی مچھلیاں پکڑ لیتے ہیں جو ان سے اٹھائے نہیں اٹھتیں۔ یہ مچھلی پکڑنے کے اس واقعہ سے متعلق معجزہ کی تکرار کے سوا کچھ بھی نہیں ہے جو اسی جگہ پر رونما ہوا تھا اور جس کو لوقا نے بھی یسوع کے حیات کے ایک واقعہ کے طور پر بیان کیا تھا۔ (۵:۱۔۱۱)، (۵)

ظہور کے ان واقعات کے متعلق گفتگو کرتے وقت فادر روگے ہمیں اپنی کتاب میں اس کا یقین دلاتے ہیں کہ ''ان حضرات کا غیر مربوط، مبہم اور بے ترتیب طرز عمل اعتماد پیدا کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ تمام حقائق اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ انجیلوں کے مرتبین کے مابین کوئی اندرونی مصالحت نہیں تھی۔ ورنہ

وہ حضرات اپنے بیان کردہ قصوں میں ضرور مطابقت پیدا کرتے۔" یہ یقیناً استدلال کا عجیب وغریب طریقہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کے سب پوری دیانت داری سے ان قوموں کی روایت کو بیان کر سکتے تھے جو (ان کے لیے نامعلوم) تمام تر توہم کے عناصر پر مشتمل تھیں۔ یہ مفروضہ اس صورت میں ناگزیر ہے جب کوئی شخص واقعات کے بیان میں ایسے تضادات اور ناممکنات سے دوچار ہوتا ہے۔

رفع مسیح

تضادات، بیانات کے بالکل آخر تک موجود رہتے ہیں۔ اس لیے کہ نہ تو یوحنا اور نہ متی رفع مسیح کا کوئی حوالہ دیتے ہیں۔ صرف مرقس اور لوقا ہی ہیں جو اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

جہاں تک مرقس کا تعلق ہے ان کے نزدیک یسوع (۱۶، ۱۹) (۶) ''آسمان پر لے جائے گئے اور وہاں خداوند خدا کے دائیں جانب بٹھا دیئے گئے۔'' لیکن وہ کوئی صحیح تاریخ ان کے قبر سے اٹھائے جانے کی نہیں دیتے۔ تاہم اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مرقس کی انجیل کی وہ مختتم عبارت جس میں یہ جملہ شامل ہے، فادر روگے کے خیال میں ایک موضوع روایت ہے حالانکہ کلیسا کے نزدیک یہ مستند حیثیت رکھتی ہے۔ اب رہ جاتے ہیں لوقا جو انجیل کے وہ واحد مرتب ہیں جو رفع مسیح کے قصہ کی غیر متنازعہ روایت فراہم کرتے ہیں۔ (۲۴، ۵۱) ''وہ ان سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اٹھایا گیا۔'' انجیل کے مرتب (لوقا) اس واقعہ کا تعین قبر سے اٹھائے جانے کے بیان کے اختتام پر اور گیارہ حواریوں (۷) کے سامنے مسیح کے ظہور پر کرتے ہیں۔ انجیل کے بیان کی تفصیلات اس جانب اشارہ کرتی ہیں کہ رفع مسیح، قبر سے اٹھائے جانے کے بعد ظہور پذیر ہوا۔ رسولوں کے اعمال میں لوقا (جن کو ہر شخص ان کا مصنف خیال کرتا ہے) باب ۱، ۳ میں یسوع کے حواریوں کے سامنے ظہور کا تذکرہ دور ابتلاء اور رفع مسیح کی درمیانی مدت میں حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

''اس کے دکھ سہنے کے بعد بہت سے ثبوتوں سے اپنے آپ کو ان پر زندہ ظاہر بھی کیا۔ چنانچہ وہ چالیس دن تک انہیں نظر آتا اور خدا کی بادشاہی کی باتیں کرتا۔''

رفع مسیح کے عیسائی تہوار کو ایسٹر یعنی قبر سے اٹھائے جانے کے تہوار کے چالیس دنوں کے بعد منعقد کرنے کی ابتدا رسولوں کے اعمال میں دی ہوئی اسی عبارت سے ہوئی۔ لہٰذا یہ تاریخ لوقا کی انجیل سے متناقض ہے۔ دوسری کسی انجیل کا متن بھی اس کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اس سے مختلف انداز میں کچھ نہیں بتاتا۔

جو عیسائی اس بات سے واقف ہے وہ اس واضح تضاد سے بے انتہا بدحواسی اور گھبراہٹ محسوس کرتا ہے۔ بائبل کے عالمی ترجمہ، عہدنامہ جدید میں ان حقائق کا اعتراف کیا گیا ہے۔ لیکن وہ اس تضاد بیانی کی کوئی تشریح نہیں کرتا۔ وہ خود کو اس حد تک محدود رکھتا ہے کہ وہ وضاحت پیش کردے جس سے چالیس دنوں کی یسوع کے مشن سے مناسبت ہو سکتی ہے۔

شارحین جو ہر چیز کی تشریح کرنے اور ناموافق باتوں میں توافق پیدا کرنے کے خواہشمند ہیں، اس موضوع کی بعض عجیب وغریب تاویلات اور تشریحات پیش کرتے ہیں۔

مثلاً اناجیل اربع کا خاکہ مرتبہ ۱۹۷۲ء از مدرسہ بائبل واقع یروشلم (بائبلیکل سکول آف جیروشلم) کی جلد ۲ صفحہ ۴۵۱ پر نہایت عجیب وغریب تشریحات ملتی ہیں۔

خود لفظ رفع مسیح پر حسب ذیل انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ ''فی الحقیقت واقعتہ''

جسمانی اعتبار سے رفع مسیح ہوا ہی نہیں کیونکہ خدا تو جس طرح بلندیوں پر ہے اسی طرح پستیوں پر ہے۔'' (لیکن) اس تشریح کے مفہوم کو سمجھنا ہے مشکل۔ کیونکہ ہر شخص اس شش و پنج میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ پھر آخر لوقا اپنے مافی الضمیر کو کیسے ادا کرے۔

دوسری جگہ اس شرح کے مصنف صاحب اس واقعہ میں ایک ادبی نوعیت کی حکمت تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ یہ کہ ''اعمال میں رفع مسیح کے واقعہ کو قبر سے اٹھائے جانے کے چالیس دن بعد وقوع پذیر ہونا بتایا گیا ہے۔'' اس حکمت سے اس خیال پر زور دیا گیا ہے کہ ''زمین پر یسوع کے ظہور کا زمانہ اختتام کو پہنچ گیا ہے۔'' تاہم وہ اس واقعہ کے تعلق سے اس بات کا اضافہ کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل میں ''یہ واقعہ ایسٹر کے اتوار کی شام کو رونما ہوتا ہے اس لیے کہ انجیل کا مرتب ان مختلف واقعات کے درمیان کوئی انقطاع نہیں بتاتا جو قبر سے اٹھائے جانے کے دن صبح میں خالی قبر ملنے کے بعد رونما ہوئے..... '' ''یقیناً یہ بھی ادبی نوعیت کی ایک حکمت اور تدبیر ہے جس کا مقصد یسوع کے جو مردوں کے درمیان سے اٹھائے گئے تھے ظاہر ہونے سے پہلے کچھ وقفہ دینا ہے۔''

بوکھلاہٹ جو ان تشریحات میں کارفرما ہے، فادر روگے کی کتاب میں اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان کی دریافت کے بموجب رفع مسیح ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو دفع ہوا۔

''جب کہ یسوع کے نقطہ نظر سے رفع مسیح کا واقعہ قبر سے اٹھائے جانے کے بعد منطبق ہو جاتا ہے اور حوارین کے نقطہ نظر سے یہ واقعہ اس وقت تک رونما نہیں

ہوتا جب تک یسوع خود کو ان کے سامنے ظاہر نہیں کرتے تا کہ روح ان کو دے دی جائے اور کلیسا کا دور شروع ہو سکے۔''

ان قارئین کے لیے جو اس دلیل کی دینی باریکیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ (جس کے لیے قطعاً کوئی الہامی بنیاد نہیں ہے) مصنف حسب ذیل عمومی نوعیت کی یہ تنبیہ کر دیتا ہے جو عذر خواہانہ اطناب سخن کا ایک نمونہ ہے۔

''یہاں جیسا کہ اور بہت سی ایسی ہی حالتوں میں ہوا کرتا ہے کہ مسئلہ صرف اس صورت میں نا قابل حال ہو جاتا ہے جب کوئی شخص بائبل کے بیانات کو لفظی طور پر سمجھنا چاہتا ہے اور ان کی مذہبی اہمیت کو فراموش کر دیتا ہے۔ جو حقائق کو علامتی شکل دے کر مسخ کر دینے کا معاملہ نہیں ہے کہ اشاریت ایک غیر مستحکم شے ہے بلکہ ان لوگوں کے دینی نقطۂ نگاہ سے مقاصد کو سمجھنے کا مسئلہ ہے جنہوں نے ان اسرار و رموز کو ایسے حقائق پیش کر کے ہم پر منکشف کیا ہے، جن کو ہم اپنے حواس اور ایسی علامتوں سے سمجھ سکتے ہیں جو ہماری روح مجسم کے لیے موزوں و مناسب ہیں۔''

یسوع کے آخری مکالمے

یوحنا کی انجیل کا فارقلیط

یوحنا انجیل کے واحد مرتب ہیں جنہوں نے حواریوں کے ساتھ آخری مکالمے کے واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ آخری کھانے کے بعد اور یسوع کی گرفتاری سے پہلے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ ایک طویل تقریر پر اختتام کو پہنچتا ہے۔ یوحنا کی انجیل میں چار ابواب (۱۴ تا ۱۷) اس بیان کے لیے مختص ہیں جس کا دوسری انجیلوں میں کہیں ذکر تک نہیں کیا گیا۔ بنابریں یوحنا کے یہ ابواب مستقبل کے لیے اولین اہمیت اور بنیادی ضرورت کے سوالات سے بحث کرتے ہیں۔ وہ اس کی تمام عظمت اور سنجیدگی و وقار کے ساتھ مرتب کیے گئے ہیں جو آقا اور ان کے حوارین کے درمیان الوداعی منظر کی خصوصیت ہیں۔

یہ رقت انگیز رخصتی کا منظر جس میں یسوع کی روحانی وصیت بھی شامل ہے۔ متی، مرقس اور لوقا کے بیان سے قطعاً غائب ہے۔ اس بیان کی عدم موجودگی کی تشریح کیسے کی جاسکتی ہے؟ اس سلسلے میں حسب ذیل سوالات کیے جاسکتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ ابتدا میں پہلی تین انجیلوں میں موجود تھا؟ کیا اس کو بعد میں دبا دیا گیا؟ ایسا کیوں ہوا؟ فوری طور پر تو اس کے بارے میں یہ بات کہنی پڑے گی کہ ان سوالات کا کوئی حل نہیں ہے۔ پہلی تین انجیلوں کے راویوں کے بیانات میں اس

زبردست خلا کا راز ہمیشہ کی طرح اب بھی دھندلکے میں ہے۔

اس بیان کی نمایاں خصوصیت جو چوٹی کی تقریر میں دکھائی دیتی ہے، انسان کے اس مستقبل کا منظر ہے جس کا تذکرہ یسوع نے کیا ہے۔ان کی وہ احتیاط جو اپنے حواریوں کو اور ان کے ذریعہ تمام نوع انسانی کو خطاب کرنے میں وہ برتتے ہیں ان کے وہ تفویضات اور اوامر ونواہی اور ان کی شریعت سے متعلق وہ احکام جن پر ان کی رخصتی کے بعد لوگوں کو عمل کرنا ضروری ہے۔یوحنا کی انجیل کا متن وہ واحد متن ہے جس میں ان کو یونان میں پراکلیتوس کے لقب سے ملقب کرایا ہے اور انگریزی زبان میں پہنچ کر پیراکلیت (فارقلیط) ہو جاتا ہے۔ذیل میں ضروری اقتباسات دیئے جارہے ہیں۔

''اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار (فارقلیط) بخشے گا۔'' (۱۴:
۱۵۔۱۶)

مددگار (فارقلیط) کا کیا مطلب ہے؟ یوحنا کی انجیل کا موجودہ متن اس کا مفہوم حسب ذیل بیان کرتا ہے۔

''لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔'' (۱۴:۲۶)

''وہ میری گواہی دے گا۔'' (۸) (۱۵:۲۶)

''میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو مددگار

تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔"
.......(۱۶: ۷۔۸)

"جب وہ یعنی روح قدس آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا.....(۱۶: ۱۳۔۱۴)

یہ بات قابل غور ہے کہ یوحنا کی انجیل کے ابواب ۱۴۔۱۷ کی وہ عبارتیں جو یہاں بطور حوالہ پیش کی گئی ہیں ان اقتباسات کے حال مفہوم میں کسی طرح کی تبدیلی پیدا نہیں کرتیں۔

اگر سرسری طور پر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات قرین قیاس نہیں رہتی کہ جس متن میں یونانی لفظ پیراکلیت (فارقلیط) کو روح القدس قرار دیا گیا ہے وہ توجہ کو اپنی جانب مبذول کرے۔ یہ بات بالخصوص اس صورت میں صحیح ہے جب عموماً متن کے ذیلی عنوانات کا ترجمہ کیا جاتا ہے اور مصطلحات کے شارحین اس کو عام اشاعت کے لیے کام میں لاتے ہیں۔ اس وقت وہ قارئین کی توجہ ان عبارات میں اس مفہوم کی جانب منعطف کراتے ہیں جو انتہائی راسخ الاعتقادی کی بناء پر ان کو سمجھنا چاہیے۔ اگر کسی کو ان کے فہم میں ذرا سی بھی دقت محسوس ہو تو اس موضوع پر روشنی ڈالنے کے لیے بہت سی تشریحات مل جائیں گی جیسے کہ اے ٹریکوٹ نے اپنی "عہد نامہ جدید کی چھوٹی لغت" (پیتی دکسونائر دونواویے تیتاماں) میں دی ہیں۔ یہ شارح پیراکلیت (فارقلیط) کے اندراج میں حسب ذیل بیان دیتا ہے۔

''یہ نام یا لقب جو یونانی سے ترجمہ ہو کر آیا ہے، عہد نامہ جدید میں صرف یوحنا نے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے شام کے کھانے کے بعد یسوع کی تقریر کے سلسلہ میں جو بیان دیا ہے اس میں اس کو چار مرتبہ استعمال کیا ہے۔ (۹) (۱۴:۱۔ ۱۵:۲۶، ۱۶:۷) اور ایک دفعہ اپنے مکتوب اول میں (۲،۱) یوحنا کی انجیل میں یہ لفظ روح القدس کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مکتوب میں اس سے مراد حضرت عیسیٰ ہے۔ پیرا کلیت (فارقلیط) پہلی صدی عیسوی کے دوران ہیلینی (یونانی) یہودیوں میں مروج ایک اصطلاح تھی جس کا مطلب تھا ''شافع'' یا ''محافظ و ناصر'' یسوع پیشینگوئی کرتے ہیں کہ روح القدس کو باپ اور بیٹا دونوں بھیجیں گے۔ اس کا کام یہ ہو گا کہ وہ اس کردار میں بیٹے کی جگہ لے گی جو اس (بیٹے) نے اپنی فانی زندگی کے دوران اپنے حوارین کی فلاح و بہبود کے لیے بطور مددگار ادا کیا تھا۔ روح القدس درمیان میں آئے گی اور یسوع کے قائم مقام کی حیثیت سے کام کرے گی۔ اس کا کردار پیرا کلیت (فارقلیط) یا شافع مطلق کا ہو گا۔''

اس لیے یہ تشریح روح القدس کو یسوع کے جانے کے بعد نوع انسانی کے آخری رہنما اور ہادی کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ یہ بات یوحنا کے متن سے کیسے مطابقت رکھتی ہے؟

یہ ایک ضروری سوال ہے کیونکہ بنیادی طور پر یہ چیز عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مذکورہ بالا آخری پیراگراف کو روح القدس سے منسوب کیا جائے۔ ''کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبر دے گا۔'' یہ بات ناقابل تصور معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص روح القدس سے یہ امر منسوب

کرے کہ جو کچھ وہ سنے وہی کہے.... منطقی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے لیکن جہاں تک میرے علم میں ہے، یہ عام طور پر تشریحات کا موضوع نہیں ہے۔ اس مسئلہ کا صحیح تصور حاصل کرنے کے لیے اصلی یونانی متن کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے یہ بات خصوصیت سے اہم ہے۔ اس لیے کہ یوحنا کے بارے میں عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی دوسری زبان کی بجائے یونانی میں تحریر کیا تھا جس یونانی متن سے رجوع کیا گیا تھا وہ نوم ٹیٹا مینٹم گریسے (۱۰) (یونانی عہد نامہ جدید) تھا۔

متن پر کوئی سنجیدہ تنقید، اختلافات کے متعلق تحقیق سے شروع ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں پتہ چلے گا کہ یوحنا کی انجیل کے تمام مخطوطات میں وہ واحد اختلاف جس سے اس جملہ کے مفہوم میں فرق پڑ جاتا ہے، مشہور پالمیسٹ (۱۱) کی اشاعت کے جز ۱۴، ۲۶ میں ہے جو سریانی میں تحریر کیا گیا تھا۔ اس موقع پر وہ روح القدس نہیں ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے بلکہ نہایت سیدھے اور صاف طریقے پر روح ہے۔ کیا کاتب سے ایک لفظ ترک ہو گیا ہے یا یہ جانتے بوجھتے کہ جس متن کو وہ نقل کر رہا ہے۔ اس بات کا متقاضی ہے کہ روح القدس کو اس طرح پیش کرے کہ جو کچھ وہ سنے وہی کہے؟ اس نے غالباً کوئی ایسی بات جو اس کو نامعقول معلوم ہوئی لکھنے کی جرأت نہیں کی۔ اس مشاہدہ سے ہٹ کر دوسرے اختلافات کے کھوج لگانے کی زحمت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ یہ اختلافات قواعد کی رو سے ہیں اور ان سے عام مفہوم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ خاص بات جس کا اظہار افعال ''سننے'' اور ''کہنے'' کے صحیح مفہوم کے سلسلہ میں اس موقع پر کیا گیا

ہے وہ یوحنا کی انجیل کے جملہ مخطوطات پر بھی صادق آنا چاہیے اور یہی فی الحقیقت صحیح ہے۔

ترجمہ میں فعل ''سننا'' یونانی زبان کا فعل ''آکوؤ'' ہے جس کا مفہوم ہے ''آوازوں کا محسوس کرنا۔'' مثال کے طور پر اسی سے ہمیں لفظ ''اکوسٹکس'' حاصل ہوا ہے جس کو سمعیات (آوازوں کا علم) کہتے ہیں۔

فعل ''کہنا'' یونانی زبان کے لفظ ''لالیو'' کا ترجمہ ہے جس کے عام معنی ہیں ''آوازیں نکالنا'' اور یہ ''کہنے'' یا بولنے کا خصوصی مفہوم ہے۔ یہ لفظ اناجیل کے یونانی متن میں بڑی کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ یہ یسوع کے اس باضابطہ بیان کا خصوصی نام ہے جو انہوں نے اپنے مواعظ کے دوران دیا تھا۔ لہذا یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ بنی نوع انسان کو وہ اطلاع جس کا وہ (یسوع) اس موقع پر اظہار کر رہے ہیں کسی اعتبار سے بھی ایک ایسا بیان نہیں ہو سکتا جو روح القدس کے ذریعہ سے دل میں ڈالا جائے۔ علاوہ ازیں اس کی ایک نہایت واضح مادی خصوصیت ہے جو آوازوں کے نکالنے کے تصور سے برآمد ہوتی ہے اور یہ تصور اس یونانی لفظ سے ادا ہوتا ہے جو اس کی وضاحت کرتا ہے۔

لہذا یونانی زبان کے دو مصادر ''آکوؤ'' اور ''لالیو'' ایسے مرئی افعال کا تعین کرتے ہیں جن کا اطلاق ایک ایسی ہستی پر ہوتا ہے جو سماعت اور نطق کے اعضاء رکھتی ہو۔ نتیجتاً یہ بات ناممکن ہے کہ ان کو ''روح القدس'' کے لیے استعمال کیا جائے۔

اسی وجہ سے اس عبارت کا متن یوحنا کی انجیل سے جو یونانی مخطوطہ کے ذریعہ

ہم تک پہنچا ہے، ماخوذ ہے اس صورت میں قطعاً نا قابل فہم ہو جاتا ہے اگر اس کو بحیثیت مجموعی لیا جائے جس میں اجزاء ۱۴، ۲۶ میں شامل روح القدس کے الفاظ بھی داخل ہوں: ''لیکن پیراکلیت (مددگار) یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا۔'' وغیرہ یہ یوحنا کی انجیل میں واحد عبارت ہے جو مددگار (پیراکلیت) کو روح القدس سے متماثل کرتی ہے۔

اگر الفاظ روح القدس (ٹونیو ماٹیو آجیون) کو عبارت سے خالی کر دیا جائے تو یوحنا کا مکمل متن بامعنی ہو جاتا ہے جو بالکل واضح اور صاف ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات اسی انجیل کے مرتب کے ایک دوسرے متن یعنی مکتوب اول سے بھی مستحکم ہو جاتی ہے جہاں یوحنا نے اسی لفظ پیراکلیت (مددگار کو صرف یسوع کے مفہوم کے لیے استعمال کیا ہے جو خداوند خدا کے نزدیک ''شافع'' کا درجہ رکھتے ہیں (۱۲) یوحنا کے قول کے بموجب جب یسوع کہتے ہیں۔ (۱۴، ۱۶) اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا۔'' جو کچھ یسوع اس موقع پر کہہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کے پاس ایک دوسری شفاعت کرنے والا بھیجا جائے گا، جیسے کہ وہ خود اپنی حیات دنیوی کے دوران انسانوں کی طرف سے بارگاہ خداوندی میں شفاعت کرتے رہے ہیں۔

اس لیے منطق کے اصولوں کے مطابق یوحنا کے پیراکلیت (فارقلیط یا مددگار) میں یسوع کے مانند ایک بشر نظر آتا ہے جو سماعت اور نطق کی وہ صلاحیتیں رکھتا ہے جن کا اظہار یوحنا کے یونانی متن سے ہوتا ہے۔ بنابریں یسوع پیشینگوئی کرتے ہیں کہ خداوند بعد میں ایک فرد بشر کو کرہ ارض پر بھیجے گا جو وہی کردار ادا

کرے گا جس کا تعین یوحنا نے کیا ہے۔ یعنی وہ ایک پیغمبر ہوگا جو خدا کا کلام سنتا ہے اور اس کا پیغام بنی نوع انسان کو پہنچاتا ہے۔ اگر الفاظ کو ان کے مناسب معنی دیئے جائیں تو یوحنا کے متون کی یہ وہ منطقی توضیح وتشریح ہوتی ہے جس پر بالآخر انسان پہنچ جاتا ہے۔

''روح القدس'' کی اصطلاح کی موجودگی جو آج کل کے متن میں ہے بعد کے اضافوں کا نتیجہ ہوسکتی ہے جو عمداً کیے گئے ہیں۔ اس کا مقصد اس ابتدائی مفہوم کو بدلنا ہوسکتا ہے جس سے یسوع کے بعد ایک پیغمبر کی بعث کی پیشینگوئی ہوتی تھی اور اس لیے اس سے عیسائی گرجاؤں کی اس تعلیم وتبلیغ کی مخالفت ہوتی تھی جو ان کی تخلیق کے وقت کی جارہی تھی۔ ان تعلیمات میں یہ بتایا جاتا تھا کہ مسیح سب سے آخری نبی ہیں۔

حواشی

۱۔ یسوع نے یہ جان کر کہ باپ نے سب چیزیں میرے ہاتھ کر دی ہیں اور میں خدا کے پاس سے آیا اور خدا ہی کے پاس جاتا ہوں، دسترخوان سے اٹھ کر کپڑے اتارے اور رومال لے کر اپنی کمر میں باندھا۔ اس کے بعد برتن میں پانی ڈال کر اپنے شاگردوں کے پاؤں دھوئے اور جو رومال کمر میں باندھ رکھا تھا اس سے پونچھنے شروع کیے۔ (یوحنا کی انجیل ۱۳: ۳۔۵) (مترجم)

۲۔ پھر تیسرے دن قانای گلیل میں ایک شادی ہوئی اور یسوع کی ماں وہاں تھی اور یسوع اور اس کے شاگردوں کی بھی اس شادی میں دعوت تھی اور جب مے ہو چکی تو یسوع کی ماں نے اس سے کہا کہ اس کے پاس مے نہیں رہی۔ یسوع نے اس سے کہا۔ ''اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام ہے؟ ابھی میرا وقت نہیں آیا۔'' اس کی ماں نے خادموں سے کہا۔ ''جو کچھ یہ تم سے کہے وہ کرو۔'' وہاں یہودیوں کی طہارت کے دستور کے موافق پتھر کے چھ مٹکے رکھے گئے تھے اور ان میں دو دو تین تین من کی گنجائش تھی۔ یسوع نے ان سے کہا۔ ''مٹکوں میں پانی بھر دو۔'' پس انہوں نے ان کو لبالب بھر دیا۔ پھر اس نے ان سے کہا۔ ''اب نکال کر میر مجلس کے پاس لے جاؤ۔'' پس وہ لے گئے۔ جب میر مجلس نے پانی چکھا جو مے بن گیا تھا اور جانتا نہ تھا کہ یہ کہاں سے آئی ہے۔ (مگر خادم جنہوں نے پانی بھرا تھا جانتے تھے) تو میر مجلس نے دلہا کو بلا کر اس سے کہا۔ ''ہر شخص پہلے اچھی مے پیش کرتا ہے اور ناقص اس وقت جب پی کر چھک گئے، مگر تو نے اب تک اچھی مے رکھ چھوڑی

ہے۔" یہ پہلا معجزہ یسوع نے قانائی گلیل میں دکھا کر اپنا جلال ظاہر کیا اور اس کے شاگرد اس پر ایمان لائے۔(مترجم)

۳۔ اور کیفا اور اس کے بعد ان بارہ کو دکھائی دیا۔ پھر پانچ سو سے زیادہ بھائیوں کو ایک ساتھ دکھائی دیا۔ جن میں سے اکثر اب تک موجود ہیں اور بعض سو گئے پھر یعقوب کو دکھائی دیا پھر رسولوں کو اور سب سے پیچھے مجھ کو۔(مترجم)

۴۔ ان باتوں کے بعد یسوع نے پھر اپنے آپ کو تبریاس کی جھیل کے کنارے شاگردوں پر ظاہر کیا۔" (یوحنا)

۵۔ جب بھیڑ اس پر گری پڑتی تھی اور خدا کا کلام سنتی تھی اور وہ گینسرت کی جھیل کے کنارے کھڑا تھا تو ایسا ہوا کہ اس نے جھیل کے کنارے دو کشتیاں لگی دیکھیں......(لوقا) یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ایسا کیوں ہوتا۔(مترجم)

۶۔ غرض خداوند یسوع ان سے کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا۔ (مترجم)

۷۔ یعنی گیارہویں حواری۔ کیونکہ بارہویں (حواری) جیوراس پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔

۸۔ باب ۱۵ کی آیت ۲۶ کی پوری عبارت یہ ہے:۔

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا۔ یعنی روح حق جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا..... اور تم بھی گواہ ہو کیونکہ شروع سے میرے ساتھ ہو۔" (مترجم)

۹۔ فی الحقیقت یوحنا کے نزدیک یہ واقعہ آخری کھانے کے دوران ہوا کہ

یسوع نے وہ طویل تقریر کی جس میں پیراکلیت کا ذکر آیا ہے۔(مترجم)

۱۰۔ نیلے اینڈ ایلانہ شائع کردہ یونائیٹڈ بائبلس سوسائیٹیز۔لندن ۱۹۷۱ء (مترجم)

۱۱۔ یہ مخطوطہ چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں لکھا گیا تھا اور اس کو آگنس ایس۔لیوس نے جبل سینا پر ۱۸۱۲ء میں دریافت کیا تھا۔اس کا یہ نام اس لیے ہوا کہ پہلے متن کو بعد کے ایک متن نے چھپا لیا تھا جس کے محو اور نیست و نابود ہونے پر اصل متن برآمد ہوا تھا۔

۱۲۔ انجیل کے بہت سے ترجموں اور تشریحات میں خصوصاً ان میں جو زیادہ قدیم ہیں اس کا ترجمہ "تسلی دینے والا" کیا گیا ہے لیکن یہ کلیتہً غیر صحیح ہے۔

باب ششم

نتائج

جو حقائق یہاں بیان کیے گئے ہیں اور متعدد انتہائی معروف عیسائی مفسرین کی جو تشریحات پیش کی گئی ہیں، وہ اسی راسخ العقیدگی کی تردیدی توثیقات ہیں جن کی حمایت ان خطوط پر کی گئی ہے جو اناجیل کے مطابق تاریخی استناد کی بنیاد پر آخری کونسل نے اختیار کیے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ یسوع نے واقعی میں کیا اور سکھایا تھا وہی باتیں دیانت داری سے منتقل کر دی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف نوعیت کے متعدد دلائل دیئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ خود اناجیل کے اقتباسات سے ہی صاف طور پر تضادات کا اظہار ہوتا ہے۔ دو ایسے حقائق پر جو باہم متناقص ہوں یقین کر لینا ناممکن ہے۔ نہ ہی بعض ان ناممکنات کو اور ان بیانات کو تسلیم کیا جا سکتا ہے جو ان مصدقہ مقدمات کے صریحاً خلاف ہیں جو جدید معلومات نے فراہم کیے ہیں۔ اس اعتبار سے اناجیل میں دیئے ہوئے یسوع کے دو نسب نامے اور وہ غلط بیانیاں جو ان میں مضمر ہیں قطعی طور پر تصفیہ کن امور ہیں۔

یہ تضادات، ناممکنات اور مباینات بہت سے عیسائی نظر انداز کرتے چلے آئے ہیں۔ انہیں اس وقت حیرت ہوتی ہے جب وہ ان پر منکشف ہوتے ہیں

اس لیے کہ وہ ان تشریحات کے مطالعہ سے متاثر ہوئے ہیں جن میں دقیق قسم کی ایسی توضیحات اور تاویلات پیش کی گئی ہیں جو ان کو یقین دلا دیتی اور معذرت خواہانہ جذباتیت سے غنائی انداز میں ان کے اذہان میں مرتسم کر دی جاتی ہیں۔ بعض بڑی مخصوص طرز کی مثالیں اس فنکاری سے دی گئی ہیں جو تفاسیر میں بعض ماہرین نے ان باتوں کے ذریعہ پھیلانے میں اختیار کی ہیں جن کو وہ معصومانہ طور پر ''مشکلات'' کا نام دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اناجیل میں بہت کم ایسی عبارتیں ہیں جن کو غیر مستند قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ کلیسا ان کے شرعی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

فادر کینن ژی ایسے کے قول کے مطابق متن سے متعلق جدید تنقید پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں انہوں نے ایسے حقائق کو واشگاف کیا ہے جو بائبل کی تفاسیر کے طریقوں میں ایک ایسا انقلاب بپا کر دیں گے جن سے یسوع کے متعلق حقائق جو اناجیل میں درج ہیں ان کے لغوی معنی نہ لیے جائیں بلکہ ان کو ''موقع کے مناسب تحریریں'' یا ''مناظرانہ تحریریں'' قرار دیا جائے۔ جدید معلومات سے یہودوی عیسائیت کی تاریخ اور فرقوں کا مابین رقابت پر روشنی پڑی ہے جس سے ان حقائق کے وجود کا سبب معلوم ہوتا ہے جن کو آج کل کے قارئین پریشان کن سمجھتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے والے راویان انجیل کا تصور اب ایسا نہیں رہا ہے جس کی حمایت کی جا سکے۔ اگرچہ متعدد عیسائی آج بھی ایسے ہیں جو اس تصور کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یروشلم کے بائبلیکل سکول میں جو کام ہوا ہے (فادرس بنوائے اور بوامار) اس سے یہ بات صاف صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ

اناجیل متعدد بار لکھی گئیں، ان پر نظر ثانی کی گئی اور ان میں اصلاح ہوئی۔ ان سے قاری کو یہ تنبیہ بھی ہو جاتی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ حالت میں اس تصور کو ترک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یسوع کی آواز براہ راست سنی جاتی ہے۔''

اناجیل کی تاریخی حیثیت خرج از بحث ہے۔ تاہم یسوع سے متعلق بیانات کے ذریعہ یہ شہادتیں سب سے زیادہ ہمیں ان کے مصنف کے کردار کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں۔ وہ لوگ ابتدائی دور کے ان عیسائی فرقوں کی روایت کے ترجمان تھے جن سے ان کا تعلق تھا اور خصوصیت سے یہودوی عیسائیوں اور پال کے مابین ہونے والے تنازع کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہے۔ کارڈینل وینیولو کا بیان ان نکات پر سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس حقیقت پر حیرت کی کیا بات ہے کہ کچھ راویان انجیل یسوع کی زندگی کے بعض واقعات کو ایک ذاتی نقطہ نظر کے تحفظ کی غرض سے توڑ مروڑ کر پیش کر دیتے ہیں؟ پھر بعض واقعات کے ترک کر دینے پر تعجب کیوں ہو؟ اور ان دیگر واقعات کی جو بیان کیے گئے ہیں فرضی نوعیت پر حیرت واستعجاب کے کیا معنی؟

یہ بات ہماری رہنمائی اس امر میں کرتی ہے کہ اناجیل کا مقابلہ ان بیانیہ نظموں سے کریں جو قرون وسطی کے ادب میں پائی جاتی ہیں۔ ایک واضح مقابلہ رولینڈ کے نغمہ (شانسوں دے رولاں) سے کیا جا سکتا ہے جو اس نوعیت کی تمام نظموں میں سب سے زیادہ معروف ہے اور جس میں ایک حقیقی واقعہ کو تخیل کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ (۱)

واضح رہے کہ یہ ایک حقیقی سانحہ ہے۔ رولینڈ شارلیمان کے عقبی دستے کی

قیادت کر رہا تھا جب اس دستے پر رانسی وال کے درہ پر کمین گاہ سے نکل کر حملہ کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سانحہ جو معمولی نوعیت کا تھا تاریخی دستاویزات کے بموجب ۱۵ اگست ۷۷۸ء کو رونما ہوا (ایگن ہارڈ) اس کو بڑھا چڑھا کر ایک عظیم جنگی کارنامہ کا درجہ دے دیا گیا اور ایک مذہبی لڑائی کی شکل میں پیش کیا گیا۔ یہ ایک انوکھی قسم کا بیان ہے لیکن تخیلی عنصر اس واقعی جنگ کو محو نہیں ہونے دیتا۔ جو شارلیمان کو اپنی حدود سلطنت کی ان کوششوں کے خلاف حفاظت کے لیے لڑنی پڑی جو پڑوس کی قوموں نے اس کی مملکت میں گھسنے کے لیے کی تھیں۔ یہ عنصر صداقت کا ہے اور داستان کا رزمیہ انداز اس عنصر کو ختم نہیں کر دیتا۔

یہی بات اناجیل پر بھی صادق آتی ہے۔ متی کے توہمات، اناجیل کے درمیان واضح تضادات، ناممکنات اور جدید سائنسی معلومات کے ساتھ تناقضات، متن میں متواتر غلط بیانیاں۔۔ یہ تمام وہ باتیں ہیں جو اس حقیقت کو نمایاں کر دیتی ہیں کہ اناجیل میں ایسے ابواب اور اجزاء شامل ہیں جو خالص انسانی تخیل کی پیداوار ہیں۔ تاہم یہ کوتاہیاں یسوع کے مشن کے وجود میں شک و شبہ پیدا نہیں کرتیں۔ شبہ جو ہے وہ کلیتہً اس طریقہ کار تک محدود ہے جو اس سلسلہ میں اختیار کیا گیا۔

حواشی

۱۔ اس واقعہ کا تعلق تاریخ اندلس سے ہے۔ جب عبدالرحمٰن الداخل اندلس پہنچ کر سریر آرائے سلطنت ہو گئے تو شہنشاہ فرانس شارلیمان نے اشتوراس کے حکمران کے ایماء سے اندلس پر حملہ کر دیا اور سرقسط کا محاصرہ کر لیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وڈی کنڈ نے جلاوطنی سے واپس آ کر سیکسن کو دوبارہ برانگیختہ کر دیا ہے، وہ واپسی پر مجبور ہوا لیکن باسکی قوم کے ہاتھوں اس کی عقبی فوج تباہ ہو گئی۔ لین پول لکھتا ہے کہ سپین کے شاعروں اور بھاٹوں نے اس کے متعلق جھوٹ سچ واقعات لکھے ہیں۔ (مترجم)

اختتام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حصہ اول

باب اول

قرآن اور جدید سائنس

تمہید

قرآن اور سائنس کے درمیان تعلق بنیادی طور پر ایک حقیقت خیز امر معلوم ہوتا ہے، خصوصیت سے اس صورت میں جب یہ تعلق یکسانیت وہم آہنگی کا ہو اور اختلاف و ناموافقت کا نہ ہوا۔ ایک مذہبی کتاب اور دنیوی خیالات کے مابین مقابلہ وہ بھی سائنس کی بنیاد پر غالباً بہت سے لوگوں کی نگاہ میں آج کل ایک الٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ دراصل ایک مختصر سی تعداد کے استثنٰی کے ساتھ سائنسدانوں کی اکثریت مادی نظریات سے وابستہ ہے اور وہ مذہبی مسائل سے محض لاتعلقی یا نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں جس کو وہ اکثر خرافات و روایات پر مبنی قرار دیتے ہیں، علاوہ ازیں مغربی دنیا میں جب سائنس اور مذہب پر بحث ہوتی ہے تو لوگ مذہبوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہودیت اور عیسائیت کا ذکر کرنے پر قانع رہتے ہیں اور اسلام کے بارے میں مشکل سے ہی سوچتے ہیں۔ دراصل اس کے بارے میں غیر صحیح تصورات کی بنیاد پر اس قدر غلط فیصلے کر دیئے گئے ہیں کہ فی زمانہ اسلام کی حقانیت پر کوئی صحیح تصور قائم کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اسلام سے متعلق الہام اور سائنس کے درمیان کسی مقابلہ کی تمہید کے طور پر جب یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس مذہب کا جس کے متعلق مغربی دنیا میں بہت کم معلومات ہیں ایک خاکہ پیش کر دیا جائے۔

اسلام کے بارے میں جو انتہائی غلط بیانات مغرب میں پیش کیے جاتے ہیں وہ بعض اوقات تو ناواقفیت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات باقاعدہ طور پر بدنام کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ تمام غلط بیانیوں میں جو اس سلسلہ میں کی جاتی ہیں سب سے زیادہ سنگین وہ ہیں جن کا تعلق واقعات سے ہے۔ اس لیے کہ غلط رائیں پھر بھی قابل معافی ہیں لیکن واقعات کو جو حقیقت کے مخالف ہوں پیش کرنا معاف نہیں کیا جا سکتا۔ جب ان گرانقدر کتابوں میں جن کے مصنفین بنیادی طور پر نہایت فاضل ہیں نہایت مکروہ قسم کی غلط بیانیاں مطالعہ میں آتی ہیں تو ذہن میں پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ذیل میں ایک مثال درج ہے جو یونیورسلیز انسائیکلوپیڈیا جلد ششم سے لی گئی ہے۔ اناجیل کے عنوان کے تحت مصنف موخر الذکر اور قرآن کے مابین اختلاف کا حوالہ دیتا ہے۔ ''انجیل کے مرتبین (.......) قرآن کی طرح خودنوشت سوانح عمری کو منتقل کرنے کا دعویٰ نہیں کرتے (.......) جسے کہ خدا وحی کے ذریعہ پیغمبر صاحب کو پہنچاتا ہے.....'' فی الحقیقت قرآن کریم کا خودنوشت سوانح عمری سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ایک اخلاقی درس ہے۔ اگر ناقص ترین ترجمہ کی بھی مدد لی جاتی تو مصنف پر یہ امر منکشف ہو جاتا۔ جس بیان کا ہم نے حوالہ دیا ہے وہ حقیقت سے اتنا ہی بعید ہے جتنا کہ کوئی شخص یہ کہے کہ انجیل تذکرہ ہے، انجیل کے ایک مرتب کی زندگی کا۔ قرآن کے بارے میں اس غلط

بیانی کا مرتکب ایک ایسا شخص ہے جو فرقہ جسوٹ کے شعبہ دینیات واقع لیون میں پروفیسر ہے۔ اس واقعہ سے کہ لوگ اس نوع کی غلط بیانیاں کرتے رہتے ہیں، قرآن اور اسلام کا ایک غلط تصور اور تاثر قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تاہم اس وقت ایک امید بندھتی ہے اس لیے کہ اب مذاہب کی حیثیت کسی داخلی مشاہدہ کی نہیں رہی ہے جیسے کہ پہلے تھی اور ان میں سے کئی ایسے ہیں جو باہمی مفاہمت کے درپے ہیں۔ اس حقیقت کو جان کر یقیناً ہر شخص کو ایک گونہ طمانیت ہو گی کہ رومن کیتھولکس کی جانب سے کلیسائی حکومت کی بلند ترین سطح پر یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ روابط پیدا کیے جائیں، وہ لوگ غلط فہمیوں کے خلاف ایک طرح کی جدوجہد کر رہے ہیں اور ان کی انتہائی کوشش ہے کہ اسلام کے خلاف جو غلط نظریات اس قدر وسعت سے قائم ہو گئے ہیں ان کو بدلا جائے۔

اس کتاب کے ابتدائیہ میں میں نے اس بڑی تبدیلی کا ذکر کیا تھا جو گذشتہ چند سالوں میں رونما ہوئی ہے اور میں نے ایک ایسی دستاویز کا حوالہ دیا تھا، جو ویٹی کن میں واقع غیر عیسائی امور کے دفتر سے اس عنوان کے ساتھ جاری کی گئی تھی کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مناظرہ کا تعین (اوریئنٹا سیوں پوران دیا لوگ انیتر کرتیں اے مسلمان) یہ اس اعتبار سے ایک نہایت اہم دستاویز ہے کہ اس میں اسلام کی جانب اختیار کیے جانے والے ایک نئے رویہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس تحریر کی تیسری اشاعت (۱۹۷۰ء) کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ طرز عمل اسلام کی جانب ہمارے رویہ پر نظر ثانی کرنے اور ہماری عصبیتوں کا تنقیدی جائزہ لینے کی طرف مائل کرتا ہے ''...... ہمیں پہلے اس طریقہ میں جو ہمارے

عیسائی بھائی اس کا جائزہ لینے میں اختیار کرتے ہیں، تدریجی طور پر تبدیلی کر لینی چاہیے۔ یہ کام سب سے زیادہ اہم ہے.... ہمیں اس فرسودہ تصور کو جو ماضی سے ورثہ میں ملا ہے یا عصبیت اور بہتان کے سبب مسخ ہو گیا ہے، صاف کر لینا پڑے گا..... اور ہمیں مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی سابقہ ناانصافی کا جس کا مغرب اپنی عیسائیت کی تعلیم کی وجہ سے قصوروار ٹھہرتا ہے اعتراف کر لینا پڑے گا۔ (۲)

ویٹی کن کی دستاویز تقریباً ۱۵۰ صفحات کی ہے۔ لہذا اس میں اس کلاسیکی نظریہ کے ابطال کو تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے جو عیسائی اسلام کے بارے میں قائم کیے ہوئے تھے اور ساتھ ہی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔

اس عنوان کے تحت ''اپنی بدترین عصبیتوں سے ہمارے تئیں آزادی دلانا'' (نولبر یر دنو پرے ژوژلے پلونوتابل) مصنفین عیسائیوں کو حسب ذیل مشورے دیتے ہیں۔ ''یہاں بھی ہمیں اپنے طرز عمل کی بڑی حد تک تطہیر کرنی پڑے گی۔ خصوصاً اس سے جو کچھ مراد ہے وہ بعض مقررہ فیصلے ہیں جو اکثر و بیشتر اور انتہائی رواداری میں اسلام کے بارے میں کر لیے جاتے ہیں۔ یہ امر لازمی ہے کہ ہم اپنے قلب کی گہرائیوں میں ایسے نظریات قائم نہ کر لیں جن پر ہم آسانی اور سہل انگاری سے پہنچ جاتے ہیں اور جو راسخ العقیدہ مسلمانوں کو خلجان میں مبتلا کر دیتے ہیں۔''

اس نوع کا انتہائی اہم نظریہ ہمارا وہ طرز عمل ہے جس کی وجہ سے لوگ لفظ ''اللہ'' کو تواتر کے ساتھ ''مسلمانوں کے خدا'' کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں ، گویا مسلمان ایک ایسے خدا پر یقین رکھتے ہیں جو عیسائیوں کے خدا سے مختلف ہے

''اللہ'' کے معنی عربی میں ''معبود یا قابل پرستش ہستی'' کے ہیں۔ یہ خدائے واحد کی ذات ہے جس کی صحیح تشریح کرنے سے ہی لفظ ''خدا'' اس لفظ کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ اللہ سے مراد حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ مسیح کے خدا کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ویٹی کن میں واقع غیر عیسائی امور کے دفتر سے جاری شدہ دستاویز اس بنیادی نکتہ پر حسب ذیل الفاظ میں زور دیتی ہے۔

''اس بات پر جمے رہنا کہ اللہ حقیقتاً خدا نہیں ہے ایک لایعنی سی بات ہے۔ مغرب کے بعض لوگ یہی طرز عمل اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کلیسائی دستاویزات نے مذکورہ بالا اپنے اس بیان و ادعاء کی صحت کر لی ہے۔ خدا پر اسلامی عقیدہ کے اظہار کے لیے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ ''لومین گینٹیم'' (۲) کے حسب ذیل اقتباسات کا حوالہ دے دیا جائے۔ ''مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عقیدہ کو مانتے ہیں اور ہماری طرح خدائے واحد و رحیم کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ وہی خدا ہے جو یوم الحساب میں انسانوں کے اعمال کا فیصلہ کرے گا......''

اسی لیے یورپی زبانوں کے اس عام رواج پر کہ وہ ''خدا'' کے بجائے ''اللہ'' کہتے ہیں، مسلمانوں کا احتجاج کرنا سمجھ میں آ سکتا ہے..... شائستہ اطوار مسلمانوں نے دی ماسوں کے قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمہ کی تعریف کی ہے جنھوں نے آخر کار بجائے اللہ کے دیو، (خدا) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ویٹی کن دستاویز حسب ذیل وضاحت کرتی ہے۔ ''اللہ وہ واحد لفظ ہے جو عربی بولنے والے عیسائی خدا کے لیے استعمال کرتے ہیں۔''

مسلمان اور عیسائی ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

اس کے بعد ویٹی کن دستاویز ان دوسرے غلط فیصلوں کا ایک تنقیدی جائزہ لیتی ہے جو اسلام کے متعلق کیے جاتے ہیں۔

''اسلامی مسئلہ تقدیر'' ایک اور عصبیت ہے جو بے حد شہرت پائے ہوئے ہے۔ دستاویز اس کا بھی جائزہ لیتی ہے اور اپنی تائید کے لیے قرآن کا حوالہ دیتی ہے۔ وہ اس تصور کے خلاف انسان کی ذمہ داری قرار دیتی ہے جس کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ اس کا فیصلہ اس کے اعمال کے مطابق ہوگا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت پرستی کا تصور غلط ہے۔ (۳) اس کے برخلاف یہ دستاویز اس عقیدہ کی پختگی کی مخالفت قرآن کی دو آیتوں کا حوالہ دے کر کرتی ہے اور یہ وہ آیتیں ہیں جن کو مغرب میں نہایت غلط طریقہ پر سمجھا گیا ہے۔

لا اکراہ فی الدین. (سورۃ ۲: آیت ۲۰۶)

''دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔''

وما جعل علیکم فی الدین من حرج (سورۃ ۲۲: آیت ۷۸)

''اور (اللہ نے) تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

یہ دستاویز اسلام کے بارے میں کثرت سے پھیلے ہوئے اس تصور کی بھی مخالفت کرتی ہے کہ اسلام کوئی خوف و ہراس کا مذہب ہے۔ یہ دین ہے محبت کا۔۔۔۔۔۔ محبت ہمسایہ کی جس کی بنیاد الوہیت کے عقیدہ پر ہونی چاہیے۔ یہ اس غلط طور پر پھیلے ہوئے تصور کو بھی رد کرتی ہے کہ اسلام میں مشکل سے ہی کوئی ضابطہ اخلاق ہے اور دوسرے اس تصور کی جس میں بہت سے یہودی اور عیسائی

شریک ہیں کہ اسلام میں تعصب اور تشدد ہے۔ ''درحقیقت اسلام اپنی تاریخ کے زمانہ میں اس سے زیادہ متشدد و متعصب نہیں رہا جتنے کہ عیسائیت کے وہ مقدس بروج تھے جب کہ عیسائی عقیدہ نے سیاسی قدر کو اپنایا تھا۔'' اس موقع پر مؤلفین قرآن سے ان عبارتوں کا حوالہ دیتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ ''مغرب میں حروب مقدس'' (۴) کی اصطلاح کا غلط ترجمہ کیا گیا ہے۔ عربی میں عبارت ہے۔ ''الجہاد فی سبیل اللہ'' یعنی راہ خدا میں سعی و کوشش کرنا۔'' ''اشاعت اسلام کے لیے جدوجہد کرنا اور معاندین سے اس کا دفاع کرنا۔'' ویٹی کن دستاویز میں مزید بیان کیا گیا ہے ''جہاد کا وہ مطلب قطعاً نہیں ہے جو بائبل میں خیرم کا۔ یہ استیصال و بیخ کنی کی جانب نہیں لے جاتا۔ بلکہ نئی سرزمینوں میں خدا اور بندے کے حقوق کو وسیع کرتا ہے۔''

۔۔۔۔۔ ''سابق میں جہاد میں رونما ہونے والا تشدد عموماً جنگ کے اصولوں کے مطابقت میں تھا۔ علاوہ ازیں حروب صلیبی کے زمانہ میں قتل و غارتگری کے مرتکب ہمیشہ مسلمان ہی نہیں ہوتے تھے۔''

آخر میں دستاویز میں اس تعصب کا ذکر کیا گیا ہے جس کے مطابق ''اسلام ایک تنگ نظر مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو ایک نوع کے فرسودہ ازمنۂ متوسط میں مقید رکھتا ہے جو ان کو دور حاضرہ کی تکنیکی کامیابیوں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کے معاملہ میں ناکارہ بنا دیتا ہے۔'' یہ (دستاویز) ان مماثل حالات سے جو عیسائی ممالک میں دکھائی دیتے ہیں مقابلہ کرتی ہے اور حسب ذیل بیان دیتی ہے۔ ''ہمیں اسلامی تفکر (....) کے روایتی پھیلاؤ میں ایک مہذب سماج کے

امکانی ارتقاء کا اصول دکھائی دیتا ہے۔''

مجھے یقین ہے کہ ویٹی کن کی جانب سے اسلام کا یہ دفاع اس زمانہ میں بہت سے معتقدین کو محو حیرت کر دے گا۔ خواہ مسلمان ہوں خواہ یہودی یا نصرانی۔ یہ خلوص اور وسیع النظری کا اظہار ہے جو حیرت خیز طور پر اس رویہ کے خلاف ہے جو ماضی میں ورثہ میں ملا تھا۔ مغرب میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو اس نئے رویہ سے واقفیت رکھتے ہیں جو کیتھولک مذہب کے کلیساء کی انتہائی مقتدر جماعت نے اختیار کیا ہے۔

ایک مرتبہ جب کسی کو اس حقیقت سے واقفیت ہو جاتی ہے تو پھر یہ جان کر زیادہ حیرت نہیں ہوتی کہ اس مفاہمت پر مہر تصدیق ثبت کرانے میں یہ امور انجام دیئے گئے۔ اولاً یہ کہ ویٹی کن میں واقع غیر عیسائی امور کے دفتر کے صدر نے سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل کے علاقہ میں دورہ کیا اس کے بعد ۱۹۷۴ء کے دوران پوپ پال ششم نے سعودی عرب کے عظیم علماء کا استقبال کیا۔ اس بات سے یہ امر بخوبی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ واقعہ کی دینی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ تقدس مآب بشپ ایلکنگر نے عظیم علماء کا اسٹریسبرگ کے مقام پر اپنے کلیسا میں استقبال کیا اور ان کے دورے کے موقع پر ان کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی دعوت دی انہوں نے قبلہ رو ہو کر قربان گاہ کے سامنے نماز پڑھی۔

اس طرح عالم اسلام اور عیسائی دنیا کے نمائندوں نے بلند ترین سطح پر کہ وہ دونوں اسی ایک خدا پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اختلاف رائے کے معاملہ میں دونوں ایک دوسرے کا لحاظ کرتے ہیں۔

آپس میں مکالمہ کرنے پر رضامندی ظاہر کی جب یہ معاملہ ہے تو یقیناً یہ امر بالکل فطری اور قدرتی ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے الہامی مذہب کے دیگر پہلوؤں پر دوبدو ہو کر گفتگو کر لے۔ اس مقابلہ کا موضوع الہامی کتابوں کا وہ جائزہ ہو جو متون کے مستند ہونے سے متعلق سائنسی مواد اور معلومات کی روشنی میں لیا جائے۔ یہ جائزہ قرآن کا جس صورت میں یہ ہے اور یہودوی عیسائی تنزیل کا ہونا چاہیے۔

مذاہب اور سائنس کے مابین تعلق کسی ایک جگہ یا ایک وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ کسی توحید پرست مذہب میں کوئی ایسی تحریر نہیں ہے جو سائنس کو رد کرتی ہو۔ تاہم عملاً یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ بعض فرقوں کے مذہبی مقتداؤں سے سائنسدانوں کو نمٹنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عیسائی دنیا میں صدیوں تک زیر غور مقتدلی سائنسی ترقیات کی مخالفت کرتے رہے۔ لیکن یہ مخالفت ان کی اپنی مرضی سے تھی اور مستند مذہبی کتابوں کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ ہمیں پیشتر سے ہی ان کارروائیوں کا علم ہے جو ان لوگوں کے خلاف کی گئیں جو سائنس کو ترقی دینے کے خواہاں تھے۔ وہ کارروائیاں ایسی تھیں جن میں زندہ جلا دیے جانے کے ڈر سے بہت سے سائنس دان جلاوطنی پر مجبور ہو گئے یہاں تک کہ انہیں توبہ کرنا، اپنے رویہ کو تبدیل کرنا اور معافی کا خواستگار ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں **گلیلیو** کا مسئلہ ہمیشہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر اس لیے مقدمہ چلا کہ اس نے اس نظریہ کو مان لیا تھا جو زمین کی گردش کے بارے میں **کوپرنیکس** نے دریافت کیا تھا۔ بائبل کی ایک غلط تاویل کے نتیجہ میں **گلیلیو** کو سزا دی گئی۔ اس لیے کہ کوئی بھی صحیفہ ایسا نہیں ہے جو معقولیت کے ساتھ اس کے خلاف پیش کیا جاتا۔

جہاں تک اسلام کا معاملہ ہے، سائنس کی جانب اس کا رویہ عام طور پر قطعاً مختلف تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی اس مشہور حدیث سے زیادہ واضح اور کیا ہوگا اطلبو العلم ولو کان بالصین "علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ملے" یا ایک دوسری حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔" چونکہ ہم اس مسئلہ پر بعد میں گفتگو کریں گے، اس وقت ایک دوسرے نازک واقعہ کو لیتے ہیں۔ وہ یہ کہ قرآن جہاں ہمیں سائنس کو ترقی دینے کی دعوت دیتا ہے وہاں خود اس میں قدرتی حوادث سے متعلق بہت سے مشاہدات وشواہد ملتے ہیں اور اس میں ایسی تشریحی تفصیلات موجود ہیں جو جدید سائنسی مواد سے کلی طور پر مطابقت رکھتی ہیں۔ یہودوی عیسائی تنزیل میں اس جیسی کوئی بات نہیں۔

اس کے باوجود یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ تاریخ اسلام میں کچھ عقیدت مندوں نے کبھی بھی سائنس کی جانب سے ایک مختلف رویہ کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ بعض ادوار میں اپنے آپ کو اور دوسرے لوگوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داری کو نظر انداز کیا گیا۔ یہ مساوی طور پر صحیح ہے کہ عالم اسلام میں دوسری جگہوں کی طرح بعض اوقات سائنسی ترقی کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ پھر بھی یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام کی انتہائی ترقی کے زمانہ میں جو آٹھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے درمیان کا زمانہ ہے، یعنی وہ زمانہ جب سائنسی ترقی پر عیسائی دنیا میں پابندیاں عائد تھیں۔ اسلامی جامعات میں مطالعہ اور تحقیقات کا کام بڑے پیانہ پر جاری تھا۔ یہی وہ جامعات ہیں جہاں اس دور کے قابل ذکر

ثقافتی سرمائے ملتے ہیں۔قرطبہ کے مقام پر خلیفہ (الحکم ثانی) کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔ابن رشد وہاں درس دیتا تھا اور یونانی، ہندوستانی اور ایرانی علوم سکھائے جاتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ تمام یورپ سے کھنچ کر طلبہ قرطبہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جایا کرتے تھے، بالکل اسی طرح جیسے آج کل لوگ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے ریاست ہائے متحدہ جاتے ہیں۔مہذب عربوں کا یہ ہمارے اوپر بڑا احسان ہے کہ ان کی بدولت قدیم مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ ہمیں بہم دست ہو گیا ہے۔ان ہی عربوں نے مفتوحہ ممالک کے کلچر کو منتقل کرنے کا کام کیا۔ہم ریاضی (الجبرا عربوں کی ایجاد ہے) فلکیات، طبیعات (مناظر و مرایا) ارضیات، نباتات، طب (ابن سینا) وغیرہ کے لیے بھی بڑی حد تک عربی تمدن کے ممنون احسان ہیں۔سائنس نے پہلے پہل قرون وسطیٰ کی اسلامی جامعات میں بین الاقوامی صورت اختیار کی۔اس زمانہ میں لوگ مذہبی رنگ میں آج کل سے کہیں زیادہ رنگے ہوئے تھے، لیکن اسلامی دنیا میں یہ چیز ان کو اس بات سے نہیں روکتی تھی کہ وہ مذہبی اور سائنسدان دونوں ایک ساتھ ہوں۔سائنس مذہب کے ساتھ توام تھی اور اس کی یہ حیثیت کبھی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔

عہد وسطیٰ، عیسائی دنیا کے لیے جمود اور مطلق تعمیل و تقلید کا زمانہ تھا۔اس بات پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ یہودی و عیسائیت کی الہامی کتابوں نے بذات خود سائنسی تحقیق کی رفتار کو سست نہیں کیا بلکہ یہ سستی ان لوگوں کی بدولت ہوئی جو خود کو اس عقیدہ کا خادم قرار دیتے تھے۔نشاۃ ثانیہ کے بعد سائنسدانوں کا قدرتی ردعمل یہ رہا کہ انہوں نے اپنے سابقہ دشمنوں سے پورا بدلہ لیا۔اس بدلہ کا سلسلہ آج بھی

جاری ہے اور یقیناً اس حد تک ہے کہ مغرب میں جو شخص سائنسی حلقوں میں رہتے ہوئے خدا کا نام لیتا ہے اس کو برادری سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ (۵) اسی طرز عمل سے مسلمانوں سمیت ان تمام نوجوانوں کی ذہنیت متاثر ہے جو یونیورسٹی میں تعلیم پاتے ہیں۔

اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ جب بے حد شہرت یافتہ سائنسدان اس طرح کا انتہا پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں، تو ان نوجوانوں کی جو ذہنیت اس وقت ہے اس سے مختلف بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ طب کے نوبل پرائز حاصل کرنے والے ایک سائنسدان نے گذشتہ چند سالوں میں ایک کتاب میں جو عام اشاعت کے لیے تھی۔ یہ لکھ کر لوگوں کو ورغلایا کہ جاندار مادہ میں ایک صلاحیت ہے کہ وہ کئی بنیادی عناصر کی مدد سے اتفاقیہ طور پر بھی تولید کا عمل کر سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس ابتدائی جاندار مادہ سے شروع کر کے اور مختلف بیرونی عوامل کے زیر اثر باقاعدہ ذی حیات اشیاء کی تشکیل ہوئی جس کے نتیجہ میں وہ مرعوب کن پیچیدہ وجود ظہور پذیر ہوا جو انسان کہلاتا ہے۔

یقیناً عصری سائنسی معلومات کے یہ عجوبے جو حیات کے میدان میں رونما ہوئے ہیں ایک غور و فکر کرنے والے انسان کو مخالف نتیجہ اخذ کرنے کی جانب بھی لے جا سکتے ہیں۔ جوں جوں انسان غور کرتا ہے وہ نظام جو تولید و بقائے حیات کے سلسلہ میں کارفرما ہے پیچ در پیچ دکھائی دینے لگتا ہے اور جیسے جیسے تفصیلات کا علم ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی حیرت بڑھتی جاتی ہے۔ اس نظام کے متعلق معلومات نے اس تصور کا امکان یقیناً کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے کہ زندگی کے

حادثہ میں بخت و اتفاق کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ انسان علم کی شاہراہ پر جیسے جیسے آگے قدم بڑھاتا ہے خصوصاً انتہائی چھوٹی اشیاء کے بارے میں اس کی معلومات میں جو اضافہ ہوتا ہے اس سے ایک خالق کے وجود کی تائید میں دلائل زیادہ قوت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ ان حقائق سے دوچار ہونے کے بعد بجائے اس کے کہ انسان میں عجز کی صفت پیدا ہو اس میں گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کے تصور کا استہزاء کرنے لگتا ہے اور اسی طرح سے وہ کسی بھی ایسی چیز کو جو اس کو عیش و نشاط سے علیحدہ کردے کچلتا ہوا آگے بڑھنے لگتا ہے۔ یہ اس مادہ پرست سماج کا وہ مثالی پیکر ہے جو اس وقت مغرب میں نشوونما پا رہا ہے۔

وہ کون سی روحانی قوتیں ہیں جو خیال کی اس آلودگی کے خلاف استعمال کی جا سکتی ہیں جو بہت سے معاصر سائنسدان پھیلا رہے ہیں؟

یہودیت اور عیسائیت اپنی اس نااہلی کو نہیں چھپاتیں کہ مادیت کی لہر اور انکار خدا کے اس حملہ سے جو مغرب سے ہو رہا ہے مقابلہ کرنے کا ان میں بوتا نہیں ہے۔ وہ دونوں مکمل طور پر غیر محفوظ ہیں۔ اور ایک دوسرے دہ سالہ میں یہ بات یقیناً محسوس کی جا سکتی ہے کہ اس لہر کے مقابلہ میں ان کی مدافعت کس قدر شدت سے کم ہو رہی ہے جو خطرہ بنی ہوئی ہے کہ ہر چیز کو بہالے جائے۔ مادیت پرست منکر خدا کو کلاسیکی عیسائیت میں اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ وہ ایک ایسا نظام ہے جس کو گذشتہ دو ہزار سالوں میں انسانوں نے اس یقین دہانی کے ساتھ وضع کیا ہے کہ ایک اقلیت کو اس کے ساتھی انسانوں پر اقتدار حاصل ہو جائے۔

وہ یہودوی عیسائی تحریروں میں کوئی ایسی عبارت نہیں پاتا جو خفیف طور پر بھی

اس کی اپنی عبارت سے ملتی جلتی ہو۔ ان تحریروں میں جدید سائنسی معلومات کے مقابلہ میں اتنے ناممکنات، تضادات اور تناقضات ہیں کہ وہ ان متون پر غور کرنے سے ہی انکار کر بیٹھتا ہے جن کے بارے میں مذہبی پیشواؤں کی اکثریت چاہتی ہے کہ پورے کے پورے تسلیم کر لیے جائیں۔

جب کسی مادہ پرست منکر خدا کے سامنے اسلام کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ ایک ایسی خوش طبعی کے ساتھ مسکرا دیتا ہے جو اس موضوع سے ناواقفیت کے مساوی ہوتی ہے۔ اکثر مغربی دانشوروں کی طرح جو خواہ کسی بھی جماعت کے ہوں اس کے پاس بھی اسلام کے متعلق غلط تصورات کا ایک مرعوب کن ذخیرہ ہوتا ہے۔

اس معاملہ میں اس کو دو ایک باتوں میں معافی دینی پڑے گی۔ اول یہ کہ اعلیٰ کیتھولک مذہب کے مقتدر حضرات کے نئے اختیار کردہ رویہ سے قطع نظر اسلام پر مغرب میں ہمیشہ سے نام نہاد ''بد دینی اور گمراہی'' کی تہمت لگائی جاتی رہی۔ مغرب میں جس شخص نے بھی اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کس طرح اور کس حد تک اس کی تاریخ، اس کے عقیدہ اور اس کے مقصد کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ اس موضوع پر یورپی زبانوں میں جو دستاویز شائع ہوئی ہیں (انتہائی مخصوص تحریروں کو چھوڑ کر) وہ کسی ایسے شخص کا کام نہیں ہے جس نے اس کا مطالعہ دلچسپی اور توجہ سے کیا ہو۔

حقیقت میں اسلامی وحی و تنزیل کے بارے میں واقفیت اس نقطہ نظر سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بد قسمتی سے قرآن کی عبارتوں بالخصوص ان عبارات کا جو سائنسی معاملات سے متعلق ہیں ترجمہ اور تشریح نہایت خراب اور ناقص کی گئی ہے

لہٰذا کسی بھی سائنسدان کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ خود کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اس کتاب پر ایسی تنقید کرے جس کی فی الحقیقت وہ ہرگز مستحق نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سے اس امر کی تفصیل قابل ملاحظہ ہے:۔ ترجمہ میں غلطیاں یا مغالطہ آمیز تشریحات (اور اکثر ان میں سے ایک دوسری سے وابستہ ہے) جن پر دو ایک صدی پہلے تک کسی کو حیرت نہیں تھی ان پر آج کل کے سائنسدان برہم ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی غلط ترجمہ کی ہوئی عبارت سامنے آتی ہے جس میں سائنسی اعتبار سے کوئی نا قابل قبول بیان شامل ہوتا ہے تو سائنسدان اس عبارت پر سنجیدگی سے غور کرنے سے اجتناب برتتا ہے۔ آدمی کی ولادت سے متعلق باب میں اس نوع کی غلطی کی ایک نہایت مخصوص مثال پیش کی جائے گی۔

ترجمہ میں اس قسم کی غلطیاں کیوں ہیں؟ اس کی صفائی اس واقعہ کی مدد سے پیش کی جاسکتی ہے کہ جدید دور کے مترجم اکثر قدیم مفسرین کی تفاسیر کو بغیر تنقیدی نظر ڈالے ہوئے قبول کر لیتے ہیں۔ موخر الذکر حضرات کے پاس ان کے اپنے زمانہ میں تو یہ عذر تھا کہ وہ کسی عربی لفظ کے کئی معنوں میں سے جو ممکن ہو سکتے تھے ایک ناموزوں مفہوم بیان کر دیتے تھے۔ وہ غالباً اس لفظ یا محاورہ کے اس حقیقی مفہوم کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ جو سائنسی معلومات کی بدولت موجودہ دور میں ہی واضح ہوا ہے۔ بالفاظ دیگر تراجم اور تفاسیر پر ضروری نظر ثانی کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ بات ماضی میں کسی بھی وقت ممکن نہیں تھی۔ لیکن آج کل ہمیں اس نوع کی معلومات حاصل ہیں جن سے ان کا صحیح مفہوم پیش کیا جا سکتا ہے۔ ترجمہ کے یہ مسائل یہودوی عیسائی وحی و تنزیل کے متن کے سلسلہ میں موجود نہیں ہیں، جو بات

یہاں بتائی گئی ہے وہ مطلقاً قرآن ہی کے لیے مخصوص ہے۔

ان سائنسی خیالات نے جو قرآن کے ساتھ زیادہ خصوصیت رکھتے ہیں شروع میں مجھے بے انتہا محو حیرت کر دیا۔ اس وقت تک میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسی تحریر میں جو تیرہ صدیوں سے زیادہ عرصہ پہلے مرتب ہوئی تھی اور جس میں انتہائی مختلف النوع مضامین بیان ہوئے ہیں، میرے لیے یہ ممکن ہو گا کہ میں اتنے بہت سے بیانات ڈھونڈ نکالوں گا۔ اور وہ سب جدید سائنسی معلومات سے کلی طور پر ہم آہنگ ہوں گے۔ شروع میں میرا اسلام پر کوئی عقیدہ نہیں تھا۔ میں نے ان متون کا کھلے دل و دماغ سے اور کلیتہً معروضی طریقہ پر جائزہ لینا شروع کیا۔ اگر میرے ذہن پر اس وقت کوئی چیز اثر انداز تھی بھی تو وہ باتیں تھیں جو نوعمری میں مجھے بتائی گئی تھیں۔ لوگ اس وقت مسلمانوں کے متعلق نہیں بلکہ محمڈنس (۶) (محمدیوں) کے بارے میں گفتگو کرتے تھے جو اس بات کی تصریح کرنے کے لیے ہوتا تھا کہ اس سے ایک ایسا مذہب مراد ہے جس کی بنیاد ایک انسان کے ہاتھوں رکھی گئی اور خدا کے اعتبار سے اس کی کوئی قدر نہیں ہے۔ مغرب کے بہت سے لوگوں کی طرح میں خود بھی اسلام کے بارے میں ویسے ہی تصورات قائم کر سکتا تھا۔ آج کل یہ خیالات اس قدر عام ہیں کہ میں درحقیقت بھونچکا رہ جاتا ہوں جب کسی ماہر خصوصی کے علاوہ میری کسی اور ایسے شخص سے ملاقات ہو جاتی ہے جو اس موضوع پر روشن خیالی کے ساتھ گفتگو کر لیتا ہے۔ لہذا میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس واقعہ سے پہلے کہ جب مجھے اسلام کے بارے میں اس سے مختلف نظریہ معلوم ہوا جو میں نے مغربی ذریعہ سے حاصل کیا تھا میں خود اس بارے

میں انتہائی درجہ میں ناواقف تھا۔

میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ اسلام کے متعلق مستثنیٰ حالتوں میں عام طور پر جو فیصلے کیے جاتے تھے میں ان کے باطل ہونے کا احساس کرسکتا تھا۔ خود سعودی عرب میں بھی مجھے ایک ہلکا سا اشارہ اس بات کا مل گیا تھا کہ اس موضوع پر مغرب میں جو رائیں قائم کی جاتی ہیں ان میں کس حد تک غلطی کا عنصر ہوتا ہے۔

درحقیقت اس سلسلہ میں مرحوم شاہ فیصل کا بے حد ممنون ہوں جن کے لیے میرے دل میں احترام کا شدید جذبہ موجود ہے۔ مجھے ان کو سلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سننے اور جدید سائنس کے سلسلہ میں ان کے سامنے بعض مسائل پیش کرنے کا جو شرف حاصل ہوا وہ میرے لیے ایک انتہائی یادگار واقعہ ہے۔ مجھ پر یہ ایک بے پایاں کرم ہے کہ میں ان سے اور ان کے حوارئین سے اس ایسی قیمتی معلومات حاصل کرسکا۔

چونکہ مجھے اب اس وسیع خلا کا علم ہو گیا ہے جو اسلام کی حقیقت کو اس موہوم تصور سے جدا کرتا ہے جو ہمیں مغرب میں دیا جاتا ہے لہٰذا میں نے اس بات کی بڑی ضرورت محسوس کی کہ عربی زبان (جس کو میں بول نہیں سکتا تھا سیکھوں تاکہ ایسے مذہب کے مزید مطالعہ کے لیے جس کو غلط سمجھا گیا ہے خود کو پوری طرح تیار کرسکوں۔ میرا مطمع نظر یہ تھا کہ قرآن کا مطالعہ کروں اور ان تمام تفسیروں سے مدد لے کر جو تنقیدی مطالعہ کے لیے لازمی ہیں، پہلے ایک ایک جملہ کا تجزیہ کر کے دیکھوں۔ میری خصوصی توجہ ان مختلف قدرتی حوادث کے ذکر پر مرکوز تھی جو قرآن میں دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ الکتاب میں ان کی جو بعض تفصیلات دی گئی ہیں ان کی

بے انتہا صحیح نوعیت نے جو ابتدائی متن ہی سے واضح ہوسکتی تھی، اس اعتبار سے مجھے متحیر کر دیا کہ وہ موجودہ زمانہ کے خیالات سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ اگر چہ کوئی ایسا شخص جو حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں بقید حیات تھا اس بات کا قطعاً شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ بعد میں میں نے کئی مسلمان مصنفین کی ایسی کتابوں کو پڑھا جو قرآنی متن کے سائنسی پہلوؤں پر لکھی گئی تھیں۔ وہ کتابیں ان امور کی تفہیم میں میرے لیے بے انتہا مفید ثابت ہوئیں لیکن ابھی تک مجھے اس موضوع کے کسی ایسے عمومی مطالعہ کا سراغ نہیں ملا ہے جو مغرب میں کیا گیا ہو۔

جو بات اس نوعیت کے متن میں پہلے پہل سامنے آتی اور قاری کو چونکا دیتی ہے، وہ ان موضوعات زیر بحث کی کثرت ہے۔ یہ موضوعات ہیں تخلیق، فلکیات، زمین سے متعلق بعض مادوں کی تشریح، عالم حیوانات و نباتات، انسان کی تولید۔ جبکہ بائبل میں فاحش غلطیاں دیکھنے میں آتی ہیں، قرآن میں میں ایک غلطی کا بھی پتہ نہیں چلا سکا ہوں۔ میں نے اس موقع پر توقف کر کے خود سے استفسار کیا: اگر کوئی بشر قرآن کا مصنف ہوتا تو وہ ساتویں صدی عیسوی میں ایسے حقائق کو کس طرح بیان کر دیتا جو آج جدید سائنسی معلومات سے پوری طرح مطابقت کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں؟ اس بارے میں قطعاً کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ قرآن کا جو متن آج ہمارے پاس ہے وہ اگر مجھے ان الفاظ میں گفتگو کرنے کی اجازت دی جائے تو قطعی طور پر اسی زمانہ کا متن ہے (اس کتاب کے موجودہ جز کے دوسرے باب میں میں اس مسئلہ پر بحث کروں گا) اس مشاہدے کے لیے انسان کے پاس کیا توجیہہ و تاویل ہوسکتی ہے۔ میری رائے میں اس کے لیے کوئی

تاویل ممکن نہیں۔ کوئی خاص دلیل اس سلسلہ میں نہیں ہو سکتی کہ جس زمانہ میں شاہ داگوبرت (۷) (۶۲۹۔۶۳۹ء) فرانس میں حکومت کر رہا تھا اس وقت جزیرۃ العرب کا ایک باشندہ بعض موضوعات پر ایسی سائنسی معلومات رکھتا ہو جو ہمارے زمانہ سے بھی دس صدی بعد کے دور سے تعلق رکھتی ہو۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت یعنی ایک ایسے دور میں جو ہجرت (۶۲۲ء) کے ادھر ادھر اندازاً بیس سال کی مدت پر محیط ہے، سائنسی معلومات میں صدیوں سے کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا اور اسلامی تمدن کی سرگرمیوں کا دور اپنی سائنسی ترقی کے ساتھ نزول قرآن کے اختتام کے بعد آیا۔ اس نوع کے دینی اور دنیوی واقعات سے ناواقفیت ہی مندرجہ ذیل قسم کی اوٹ پٹانگ رائے کی جانب لے جاتی ہے جو میں نے متعدد بار لوگوں کو پیش کرتے ہوئے سنی ہے: اگر سائنسی نوعیت کے حیران کن بیانات قرآن میں موجود ہیں تو اس کی تاویل اس طرح کی جا سکتی ہے کہ عرب سائنسدان اپنے زمانہ سے بہت آگے تھے اور حضرت محمد ﷺ ان کے کام سے متاثر ہوئے تھے۔ کوئی شخص جو تاریخ اسلام کے بارے میں کچھ بھی معلومات رکھتا ہے اس بات سے واقف ہے کہ قرون وسطیٰ کا وہ دور جس میں عربوں کی تمدنی اور سائنسی ترقیات کا ظہور رہا، حضرت محمد ﷺ کے بعد میں آیا اور اس لیے وہ اس قسم کی خیال آرائیوں میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی رائیں خصوصیت سے خارج از بحث ہیں کیونکہ بیشتر سائنسی حقائق جن کی یا تو قرآن میں نشان دہی کی گئی ہے یا جو صاف طور پر بیان ہوئے ہیں ان کو موجودہ دور میں ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

اس لیے یہ بات سمجھنا آسان ہے کہ کس لیے صدیوں تک مفسرین قرآن نے (بشمول ان تصانیف کے جو اسلامی تمدن کے انتہائی عروج کے زمانہ میں منصۂ شہود پر آئیں) ناگزیر طور پر بعض ان آیات کی توضیح وتشریح کے سلسلہ میں غلطیاں کی ہیں جن کے ٹھیک ٹھیک مفہوم کو امکانی طور پر نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ بہت عرصہ بعد جو ہم سے بہت دور کا زمانہ نہیں ہے ان کا صحیح طور پر ترجمہ اور تفسیر پیش کرنا ممکن ہوا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ زبان سے مکمل واقفیت ہی بذات خود قرآن کی ان آیات کی تفہیم کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ضروری ہے کہ سائنس کی بے انتہا گونا گوں معلومات بھی ہونی چاہیے۔ جس قسم کا مطالعہ موجودہ زمانہ میں کیا جا رہا ہے، اس میں علم کے بہت سے شعبے آ جاتے ہیں اور اس مفہوم کے اعتبار سے اس مطالعہ کو ''قاموسی'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جب ان سوالات پر جو اٹھائے جاتے ہیں بحث کی جاتی ہے تو قرآن کی بعض آیات کو سمجھنے کے لیے جتنی متنوع قسم کی سائنسی معلومات لازمی ہے وہ واضح ہو جائے گی۔

لیکن قرآن کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ ان قوانین کی جو کائنات میں کارفرما ہیں اور وضاحت کرے، بنیادی طور پر اس کا مقصد مطلقاً مذہبی معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے متعلق بیانات خاص طور پر انسان کو تخلیق کے کاموں پر غور کرنے کے لیے ابھارتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان واقعات اور حقائق کے حوالے بھی ہوتے ہیں جن تک انسانی مشاہدہ کی رسائی ہے۔ یا ان قوانین کا ذکر ہوتا ہے جو خداوند کریم نے جس کی علوم طبعی اور انسان دونوں کے اعتبار سے نظام عالم پر حکمرانی ہے، مرتب و منضبط کر دیئے ہیں۔ ان دعاوی کا ایک جز تو آسانی سے سمجھ

میں آجاتا ہے لیکن دوسرے جز کا مفہوم صرف اسی صورت میں فہم و ادراک میں آ سکتا ہے جب اس قدر لازمی سائنسی معلومات حاصل ہو جو اس کے لیے درکار ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے وقتوں میں انسان صرف ظاہری مفہوم کو ہی سمجھ سکتا تھا جو اس کو اس لیے غلط نتائج پر پہنچا دیتا تھا کہ مسئلہ زیر بحث سے متعلق اس کی معلومات ناکافی ہوتی تھی۔

ممکن ہے بعض ان مسلمان مصنفین کے نزدیک جنہوں نے مجھ سے پہلے قرآن کی ایسی آیات کی جانب توجہ مبذول کرائی جن میں سائنسی معلومات موجود ہیں،میری منتخب کی ہوئی آیات کی تعداد نہایت قلیل ہو۔لیکن عام طور پر مجھے یقین ہے کہ میں نے ان کے مقابلہ میں خفیف سی کمی کی ہے۔اس کے برخلاف میں نے کئی ایسی آیات کو الگ کر دیا ہے جو میری رائے میں ابھی تک وہ اہمیت حاصل نہیں کر سکی ہیں جن کے سائنسی نقطہ نظر سے وہ مستحق ہیں جہاں کہیں میں غلطی سے ان آیات کو اس مطالعہ کے سلسلہ میں غور کرنے سے چوک گیا ہوں جن کو ان مصنفین نے منتخب کیا تھا تو امید ہے کہ وہ مجھے اس پر مطعون نہیں کریں گے۔میں نے بعض مواقع پر یہ بھی دیکھا ہے کہ کچھ کتابوں میں ایسی سائنسی تشریحات دی گئی ہیں جو مجھے صحیح نہیں معلوم ہوئیں۔میں نے کھلے دل سے اور صاف ضمیر کے ساتھ ایسی آیتوں کی اپنے نقطہ نظر سے تشریح کر دی ہے۔

اسی طرح میں نے کوشش کی ہے کہ قرآن میں ان حوادث کا ذکر بھی تلاش کروں جن تک انسانی فہم و ادراک کی رسائی ہے لیکن جن کو جدید سائنس نے تسلیم نہیں کیا ہے۔میرا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں مجھے قرآن میں کائنات کے ایسے

سیارگان کا ذکر ملا ہے جو کرہ ارض کے مشابہ ہیں۔ یہاں یہ ایزاد کر دینا ضروری ہے کہ بہت سے سائنسدان اس کو مکمل طور پر قابل عمل سمجھتے ہیں حالانکہ جدید معلومات سے اس کے یقینی امر ہونے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا، تاہم تمام متعلقہ حقوق کا جو ممکن ہو سکتے ہیں تحفظ کرتے ہوئے میں نے اس کے ذکر کرنے کی ذمہ داری خود اٹھالی۔

اگر یہ مطالعہ تیس سال قبل کیا گیا ہوتا تو اس کے ساتھ ایک اور ایسے واقعہ کا ذکر اضافہ کرنا ضروری ہوتا جس کی پیشینگوئی قرآن میں کی گئی تھی اور جس کو فلکیات کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا۔ یہ واقعہ ہے خلاء کی تسخیر کا۔ اس وقت دھکیلنے والے میزائلوں کے ابتدائی تجربات کی بناء پر لوگ ایک ایسے دن کے منتظر تھے جب انسان غالباً اپنے ارضی مسکن کو چھوڑ کر خلا پیائی کے لیے مادی وسائل مہیا کر لے گا۔ اس وقت یہ بات معلوم تھی کہ قرآن میں ایک ایسی آیت موجود ہے جس میں یہ پیشینگوئی کی گئی ہے کہ اس اس طرح ایک دن انسان اس تسخیر کو مکمل کرے گا۔ چنانچہ اس بیان کی تصدیق ہو چکی ہے۔

مقدس صحیفوں اور سائنس کے مابین اس وقت جو مقابلہ ہے وہ بائبل اور قرآن دونوں کے لیے ان قیاسات کو کام میں لا رہا ہے جن کا تعلق سائنسی حقائق سے ہے۔ اس مقابلہ کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سائنسی دلائل جن پر بھروسہ کیا جائے پوری طرح تسلیم شدہ ہوں اور ان میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔ جو لوگ اس تصور کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں کہ سائنس صحف سماوی کو جانچنے کے سلسلہ میں جو مداخلت کرتی ہے اس کو مان لیا جائے، وہ دراصل اس

بات سے انکاری ہیں کہ سائنس کے لیے مقابلہ کی کوئی باضابطہ حد مقرر کرنا ممکن ہے (اب یہ صحیفہ خواہ بائبل ہو جو اس مقابلہ میں زک اٹھانے سے نہیں بچتی۔۔۔۔۔اور اس کا سبب ہم پہلے ہی جان چکے ہیں۔۔۔۔۔خواہ وہ قرآن ہو جس کو سائنس سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہے) ان کا کہنا ہے کہ سائنس میں زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ چنانچہ ایک واقعہ آج تسلیم کر لیا جاتا ہے اور بعد میں مسترد ہو جاتا ہے۔

اس آخری رائے زنی کے لیے مندرجہ ذیل وضاحت پیش کی جاتی ہے۔ایک سائنسی نظریہ اور باقاعدہ طور پر مشاہدہ شدہ واقعہ کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے۔نظریہ کا مقصد کسی ایسے حادثہ یا حوادث کے ایسے سلسلے کی تشریح ہوتا ہے جو فوری طور پر قابل فہم نہیں ہوتا۔ بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن میں نظریہ میں ردوبدل ہو جاتا ہے۔اس کی یا تو شکل ہی تبدیل ہو جاتی ہے یا اگر سائنسی ترقی کی وجہ سے یہ بات آسان ہو کہ واقعات کے تجزیہ سے ایک زیادہ قابل قبول تشریح سامنے آ جائے تو ایک دوسرا نظریہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔اس کے برخلاف مشاہدہ میں آیا ہوا ایک واقعہ جس کی تجرباتی طور پر جانچ بھی کر لی گئی ہو تغیر پذیر نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ بات پوری طرح تسلیم کر لی گئی ہے کہ زمین سورج کے گرد اور چاند زمین کے گرد گھومتا ہے۔اور یہ موضوع اب ایسا ہو گیا ہے کہ اس پر نظر ثانی نہیں ہوگی۔آئندہ صرف اتنا ہو گا کہ ان مداروں کا زیادہ وضاحت سے تعین کر لیا جائے۔

مثال کے طور پر نظریہ کی تبدیل ہونے والی نوعیت کے لیے ایک مخالف مادہ کا

تصور ہے (۸) جس نے مجھے قرآن کی ایک ایسی آیت کی تردید کرنے پر مائل کیا جس کے بارے میں ایک مسلمان ماہر طبیعات کا خیال تھا کہ وہ مادہ کے فنا ہونے کے تصور کی پیشینگوئی کرتی ہے۔ یہ وہ نظریہ ہے جو فی زمانہ بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔اس کے برخلاف قرآن کی ایک آیت کی جانب بالکل جائز طور پر زیادہ توجہ دی جاسکتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حیات کی ابتدا پانی سے ہوئی۔ جو ایک ایسا حادثہ ہے جس کی ہم کبھی بھی تصدیق وتوثیق نہیں کرسکیں گے لیکن جس کی تائید میں بہت سے دلائل موجود ہیں۔ مگر جہاں تک مشاہدہ میں آئے ہوئے واقعات کا تعلق ہے جیسے انسانی جنین کا ارتقا ہے تو یہ بالکل ممکن ہے کہ قرآن میں بیان کردہ مختلف رویوں کو جدید علم الجنین کے فراہم کیے ہوئے مواد کے بالمقابل لا کر دیکھیں۔ہم اس موضوع سے متعلق جدید سائنس اور آیات قرآنی میں مکمل طور پر مطابقت پائیں گے۔

قرآن اور سائنس کے درمیان اس تقابل کی تکمیل دو اور دوسرے موازنوں سے بھی ہوئی ہے۔ ایک ان ہی موضوعات سے متعلق جدید معلومات کا مقابلہ بائبل کے فراہم کردہ عدد سے ہے اور دوسرا اسی سائنسی نقطہ نظر سے قرآن میں (جو خدا کی جانب سے رسول ﷺ پر نازل کی ہوئی کتاب ہے) دیئے ہوئے مواد اور حدیثوں میں بیان کردہ امور کے درمیان ہے، جب کہ احادیث وہ کتابیں ہیں جو تحریر میں آئی ہوئی وحی کے علاوہ رسول ﷺ کے افعال واقوال کے تذکرہ پر مشتمل ہیں۔

اس کے اختتام پر، جو موجودہ کتاب کا تیسرا جزء ہے، ایک ہی واقعہ کے بائبل

اور قرآن کے بیان کے درمیان مقابلہ کے تفصیلی نتائج دیئے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ ذکر بھی ہے کہ جب ہر بیان کو سائنسی نقد وتبصرہ کی منزل سے گزارا جاتا ہے تو ہر عبارت کے ساتھ کیا پیش آتا ہے مثلاً تخلیق اور طوفان عالمگیر کے سلسلہ میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر مثال میں، بائبل کے بیانات میں سائنس کے ساتھ عدم مطابقت کو واضح کیا گیا ہے۔ نیز ان ہی واقعات سے متعلق قرآنی بیانات اور سائنس کے مابین مکمل مطابقت دکھائی دیتی ہے۔ ہم واضح طور پر ان اختلافات کا جائزہ لیں گے جو موجودہ زمانہ میں ایک بیان کو سائنسی نقطہ نظر سے قابل قبول اور دوسرے کو ناقابل قبول بنا دیتے ہیں۔

یہ مشاہدہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے اس لیے کہ مغرب میں یہودی، نصرانی اور دہریئے (منکرین خدا) اس بیان پر متفق ہیں (لیکن ذرا سی شہادت کے بغیر) کہ حضرت محمد ﷺ نے بائبل کی تقلید اور پیروی میں قرآن لکھایا لکھوایا تھا۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآن میں جو مذہبی تاریخ کے قصے دیئے ہوئے ہیں وہ بائبل کے قصوں کا خلاصہ ہیں۔ یہ رویہ ایسی ہی ناسمجھی اور بے عقلی کا ہے جیسے یہ کہا جائے کہ یسوع نے خود اپنے مواعظ کے دوران عہدنامہ قدیم سے تحریک پا کر اپنے ہمعصروں کو الو بنایا تھا۔ چنانچہ جیسا کہ ہم پہلے ہی حقیقی طور پر دیکھ چکے ہیں، متی کی پوری انجیل عہد نامہ قدیم کے اسی تسلسل پر مبنی ہے۔ کیا تفسیروں کا کوئی ماہر اس دلیل سے یسوع کو ان کے پیغمبر خدا ہونے کے مرتبہ سے محروم کرنے کا خواب بھی دیکھ سکتا تھا؟ اس کے باوجود یہی وہ طریقہ ہے جس سے مغرب میں اکثر و بیشتر حضرت محمد ﷺ کے مرتبہ کو جانچا جاتا ہے ''انہوں نے کل کام یہ کیا ہے کہ بائبل کی نقل کر ڈالی'' یہ ایک

رواروی کا فیصلہ ہے جس میں اس حقیقت کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ قرآن اور بائبل ایک ہی واقعہ کو مختلف شکلوں میں پیش کرتے ہیں۔ لوگ بیانات کے اختلافات کے بارے میں بحث نہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ایک ہی طرح سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے سائنسی معلومات کو اس میں دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ان مسائل کو تفصیل سے اس وقت بیان کریں گے جب تخلیق اور طوفان عالمگیر کے واقعات سے بحث ہوگی۔

احادیث کے مجموعوں کا حضرت محمد ﷺ کے ساتھ وہی تعلق ہے جو اناجیل کا یسوع سے ہے یعنی دونوں پیغمبروں کے افعال و اقوال کے بیانات ہیں۔ ان کے مصنفین چشم دید گواہ نہیں تھے۔ (یہ بات کم از کم حدیثوں کے مجموعوں کے مرتبین پر صادق آتی ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ مصدقہ ہیں اور جو حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کے زمانہ کے بہت بعد میں ترتیب دیئے گئے) وہ کسی ایسی کتابوں پر مشتمل نہیں ہیں۔ جن کی بنیاد وحی متلو پر ہو۔ وہ خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ رسول ﷺ کے ارشادات ہیں۔ ان کتابوں میں جو نہایت کثرت سے پڑھی جاتی ہیں ایسے بیانات ملتے ہیں جو سائنسی نقطہ نظر سے اغلاط پر مشتمل ہیں۔ حصوصاً طبی معالجات۔ ہم قدرتی طور پر کسی ایسی چیز کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس میں مذہبی نوعیت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں اس لیے کہ ان پر خود حدیث کے حوالے سے بحث نہیں کی جا رہی ہے۔ بہت سی حدیثوں کی صحت مشتبہ ہے۔ (۹) ان پر خود مسلمان علماء نے بحث کی ہے۔ جب کسی حدیث کی سائنسی نوعیت پر اس کتاب میں بحث کی جاتی ہے تو یہ لازمی طور پر اس تمام بات کو

نمایاں اور واضح کرنے کے لیے ہوتا ہے جو ان کو قرآن سے ممیز و ممتاز کرتی ہے جب اس کا بھی اسی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے۔ اس لیے کہ موخر الذکر میں ایک بھی سائنسی بیان ایسا نہیں جو نا قابل قبول ہو۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے۔ یہ فرق نہایت حیرت کن ہوتا ہے۔ مذکورہ الصدور جائزہ سے ان لوگوں کا نظریہ جو حضرت محمد ﷺ کو قرآن کا مصنف قرار دیتے ہیں، بالکل بودا اور کمزور ثابت ہوتا ہے۔ ناخواندہ لوگوں میں ایک شخص، ادبی محاسن کے لحاظ سے پورے عربی ادب میں کس طرح سب سے بڑا مصنف بن گیا؟ اس وقت وہ سائنسی نوعیت کے ایسے حقائق کیسے بیان کر سکتا تھا جو اس زمانہ میں کسی بھی فرد بشر کے لیے ظاہر کرنا ممکن نہیں تھا اور یہ سب بھی اس طرح کہ اس موضوع پر انکشاف کرنے میں ایک مرتبہ بھی خفیف سی غلطی کا ارتکاب نہ ہوا۔

اس مطالعہ میں پیش کردہ خیالات خالص سائنسی نقطہ نظر سے ظاہر کیے گئے ہیں۔ یہ خیالات اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ کسی بشر کے لیے جو ساتویں صدی عیسوی میں بقید حیات ہو، قرآن میں جو اتنے بہت سے موضوعات پر جو اس کے زمانہ سے تعلق نہ رکھتے ہوں اور جو باتیں صدیوں بعد منکشف ہونے والی ہوں بیانات دے سکے۔ میرے نزدیک قرآن کے لیے کوئی بشری توضیح و تشریح ممکن نہیں ہے۔

حواشی

۱۔ تاریخ کا ایک دور وہ بھی تھا جب اسلام سے عناد (خواہ کسی شکل وصورت میں بھی ہوتا اور کلیسا کے کسی مانے ہوئے دشمن کی جانب سے بھی ظاہر کیا جاتا کیتھولک چرچ کے سربراہان کے حلقوں میں قلبی استحسان کے ساتھ تسلیم کرلیا جاتا تھا۔ چنانچہ پوپ بینے ڈکٹ چہاردہم جو اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے دینی پیشوا مشہور ہیں انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے والٹیر کو اپنی جانب سے مبارکباد بھیجی تھی جو اس انتساب کے شکریہ کے طور پر تھی جو اس نے (والٹیر نے) اپنے تحریر کردہ المیہ ''محمد یا تعصب'' (ماحومیٹ اولوفانیزم) کے سلسلہ میں ۱۷۴۱ء میں کیا تھا۔ یہ ایک انتہائی مکروہ ہجو یہ تصنیف تھی جو کوئی بدعقیدہ مکار تک بندہی کسی ایسے موضوع پر لکھ سکتا تھا۔ ایک برے آغاز کے باوصف اس ڈرامہ نے اتنی زیادہ مقبولیت حاصل کی کہ وہ کومیدی۔ فرانسیسز کے تماشوں کے ذخیرہ میں شامل کرلیا گیا۔

۲۔ لومین گینٹیم ایک دستاویز کا عنوان ہے جس کو دوسری ویٹی کن کونسل (۱۹۶۲۔۱۹۶۵ء) نے جاری کیا تھا۔

۳۔ مصنف کا کہنا ہے کہ عیسائیوں میں جو یہ بات مشہور ہے کہ مسلمان وحی والہام کے مقابلہ میں سنت اور فقہ کو ترجیح دیتے ہیں یہ خیال غلط ہے بلکہ ان میں مقدم چیز وحی اور احکام خداوندی ہیں

(مترجم)

۴۔ قرآن کے ترجمہ کرنے والے حضرات نے جن میں مشہور لوگ بھی شامل ہیں انتہائی دنیا داری سے کام لیتے ہوئے اپنے تراجم میں وہ باتیں ٹھونس دی ہیں جو فی الحقیقت عربی متن میں قطعاً نہیں تھیں۔ متن کے ساتھ ایسے عنوانات کا تو بے شک اضافہ کیا جا سکتا ہے جو اصل میں نہیں ہیں اور اس سے خود متن میں کوئی تبدیلی بھی نہیں ہوتی لیکن یہ اضافہ اس قسم کا ہے کہ اس سے عام مفہوم بدل جاتا ہے مثال کے طور پر آربلیشیر اپنے نہایت معروف ترجمہ (مطبوعہ میسونیوالے ماروزپاری ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۱۵) میں ایک ایسا عنوان ٹھونس دیتا ہے جو قرآن میں دکھائی نہیں دیتا۔ فرائض جہاد (اوبلی کاسیوں رے لاگیر سنیت) یہ عنوان ایک عبارت کے شروع میں ہے جو بلا اختلاف جہاد کے لیے دعوت ہے لیکن اس کی وہ نوعیت نہیں ہے جو اس سے وابستہ کر دی گئی ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد کوئی قاری جس کی رسائی قرآن تک تراجم ہی کے ذریعہ سے ہے کیسے یہ خیال کرے گا کہ جہاد کرنا مسلمان کا فریضہ ہے۔

۵۔ اکبر الہ آبادی نے اسی حقیقت کو تو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

۶۔ اہل یورپ نے اس لفظ کو اتنی شہرت دی کہ خود مسلمان بھی محمڈنس اور مسلمانوں کے فرق کو نہ سمجھ سکے اور وہ بھی ناواقفیت کی بناء پر لفظ محمڈنس کو لفظ ''مسلمانوں'' کا مترادف سمجھ کر استعمال کرتے رہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو پہلے کالج کی شکل میں قائم ہوئی تھی۔ عرصہ دراز تک محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کے نام سے موسوم کی جاتی رہی (مترجم)

۷۔ فرانس میں میر دونژین خاندان کے تین بادشاہ اگوبرت یا ڈیگوبرٹ کے نام سے ہوئے ہیں۔ ڈیگوبرٹ اول جو تمام فرانس کا فرمانروا تھا ۶۲۹ء سے ۶۳۹ء تک رہا۔ ڈیگوبرٹ دوئم جس کی حکومت آسٹروسی تک محدود تھی اول ۶۵۶ء تا ۶۵۹ء پھر ۶۷۶ء تا ۶۷۹ء رہا۔ ڈیگوبرٹ سوم جو سوستریا کا بادشاہ تھا اس کا دور حکومت ۷۱۱ء تا ۷۱۵ء بیان کیا جاتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ہمعصر ڈیگوبرٹ یا داگوبرت اول تھا۔ (مترجم)

۸۔ ان نظریاتی ماورائے ارضی مادہ جس میں ایسے ہی ذرات ہوتے ہیں جیسے ارضی مادہ میں ہیں لیکن ان ذرات میں یا تو برقی چارج، ارضی مادہ کے ذرات کا چارج کا الٹ ہوتے ہیں یا نیوٹرون میں مقناطیسی قطبی میلان مختلف سمت میں ہوتا ہے۔ (مترجم)

۹۔ مصنف کی مراد موضوعات یا وضعی حدیثوں سے ہے اس قسم کی احادیث خلافت عباسیہ کے زمانہ میں خصوصیت سے کوفہ اور بصرہ

میں بڑی تعداد میں وضع کی گئیں، جس کی وجہ سے مسلمان علماء اور محدثین کو صحیح کو غلط سے علیحدہ کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کو جانچنے کے لیے اصول حدیث بنائے گئے۔ اسماء الرجال کا علم جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے ایجاد کیا گیا اور ایسی نام نہاد حدیثوں کے مجموعے مرتب کر دیئے جو لوگوں نے وضع کی تھیں۔ ان کو موضوعات کے نام سے موسوم کیا گیا جیسے موضوعات ملا علی قاری۔

باب دوم

قرآن کی صداقت

کس طرح یہ تحریری شکل میں آیا

قرآن کی ناقبل تردید صداقت کی بدولت ہی اس کا متن الہامی کتابوں میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے جس میں نہ عہد نامہ قدیم اور نہ عہد نامہ جدید اس کا سہیم و شریک ہے۔ اس کتاب کے پہلے دو اجزاء میں ان تبدیلیوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو عہد نامہ قدیم اور اناجیل میں ان کے موجودہ شکل میں ہم تک پہنچنے میں ہوئی ہیں۔ یہ بات قرآن کے بارے میں صحیح نہیں ہے۔ اس کی معمولی سی وجہ یہ ہے کہ ''رسول اکرم ﷺ کے زمانہ میں ہی ضبط تحریر میں آ گیا تھا۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ کس طرح لکھا گیا یعنی لکھنے میں کیا طریقہ کار اختیار کیا گیا۔

اس سلسلہ میں وہ اختلافات جو قرآن کو بائبل سے جدا کرتے ہیں کسی طرح بھی ان سوالات کی وجہ سے نہیں ہیں جو بنیادی طور پر ان کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اس قسم کے سوالات بعض لوگ ان حالات کا جو یہودوی عیسائی اور اسلامی صحیفوں کے معرض تحریر میں آنے کے وقت تھے، لحاظ کیے بغیر مسلسل پیش کرتے رہتے ہیں۔ وہ مساوی طور پر ان حالات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جو قرآن کے نبی

کریم ﷺ پر نازل ہوتے وقت محیط تھے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جو متن ساتویں صدی کی ہے اس کے لیے اس بات کے امکانات زیادہ قوی ہیں کہ وہ ان متون کے مقابلہ میں جو تقریباً پندرہ صدیوں کے بقدر قدیم ہیں ہم تک بغیر تبدیلی کے پہنچ جائے۔ یہ بات اگر چہ صحیح ہے۔ تاہم اس کو کافی وشافی دلیل اقرا نہیں دیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں یہ اقرار مزید اعتذار اور اس بات کے اعتراف کا موجب ہوتا ہے کہ کئی صدیوں کے دوران یہودی عیسائی متون میں تحریفات ہوتی رہیں اور قرآن کے متن کو جو زیادہ جدید ہے، انسانی تحریفات کا بہت کم خطرہ رہا۔

عہدنامہ قدیم کے سلسلہ میں ان مصنفین کی جو ایک ہی قصہ کو دہراتے رہے ہیں، صرف تعداد جمع وہ تمام تنقیحات جو سنہ عیسوی کے قبل بعض کتابوں کے متون پر ہوتی رہی ہیں۔ ان کے غیر صحیح اور متضاد ہونے کے کئی دلائل ہیں جہاں تک اناجیل کا تعلق ہے کہ کوئی شخص بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ان میں یسوع کے اقوال کی صحیح صحیح نقل یا ان کے افعال کا حقیقت کے مطابق تذکرہ ہمیشہ من وعن درج کیا جاتا رہا ہے، ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح متون کے یکے بعد دیگرے بیان ہونے والی روایات میں کلی طور پر صداقت کی کمی رہی ہے اور اس کے علاوہ یہ کہ ان کے مصنفین چشم دید گواہ نہیں تھے۔

نیز اس کو اس فرق سے اور بھی زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی جو وحی متلو پر مشتمل ایک کتاب یعنی قرآن اور حضرت محمد ﷺ کے افعال و اقوال کے بیانات سے متعلق مجموعوں یعنی احادیث کے درمیان ہے۔ رسول ﷺ کے بعض صحابہ نے ان کو آپ کی رحلت کے فوری بعد لکھنا شروع کر دیا تھا چونکہ بشری بھول چوک کا

امکان ان میں ہوسکتا تھا ان کی ترتیب وتدوین کا سلسلہ بعد میں جاری رکھنا پڑا اور مذہبی اعتبار سے ان کو نقد وتبصرہ کے معیار پر رکھا گیا چنانچہ سب سے اہمیت عملاً ان مجموعوں کو دی جو حضرت محمد ﷺ کے فوراً بعد معرض وجود میں آئے۔ احادیث کے ان مجموعوں کی صداقت کا معیار اناجیل کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ کوئی بھی انجیل ایسی نہیں ہے جو یسوع کے زمانہ میں لکھی گئی ہو (وہ سب کی سب آپ کے دنیوی مشن کے اختتام کو پہنچنے کے عرصۂ دراز کے بعد ضبط تحریر لائی گئیں، اور احادیث کا کوئی مجموعہ بھی ایسا نہیں ہے جو رسول ﷺ کی حیات میں مرتب ہوا ہو۔ (۱)

جہاں تک قرآن کا معاملہ ہے اس کی صورت جداگانہ ہے۔ جب وحی کا سلسلہ جاری ہوا رسول اللہ ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں نے اس کے متن کو حفظ کرلیا نیز آپ ﷺ کے کاتبین نے اس کو لکھنا بھی شروع کر دیا۔ لہٰذا اس کا آغاز صحت وصداقت کے ان دو عناصر سے ہوا جو اناجیل کو حاصل نہیں تھے۔ یہ سلسلہ حضور نبی کریم ﷺ کی رحلت تک جاری رہا۔ اس زمانہ میں جب کہ ہر شخص نہیں لکھ سکتا تھا لیکن زبانی ہر شخص دہرا سکتا تھا۔ حافظہ سے تلاوت کرنا اس اعتبار سے بے حد افادیت رکھتا تھا کہ جب فیصلہ کن متن مرتب کیا گیا اس وقت یہ ممکن تھا کہ فریقین کے حافظہ سے جانچ پڑتال کر لی جائے۔ وحی قرآنی کا نزول حضرت جبریلؑ کے ذریعہ حضرت محمد ﷺ پر ہوا۔ اس میں نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے بیس سال سے زیادہ کی مدت لگی۔ آغاز چھیانوی سورۃ کی ابتدائی آیات سے ہوا پھر تین سال کے وقفہ کے بعد (۲) جاری ہو کر ۶۳۲ء میں نبی کریم ﷺ کی رحلت تک چوبیس سال کی طویل مدت ہے، جاری رہا۔ یعنی دس سال ہجرت سے قبل اور

دس سال ہجرت کے بعد۔

سب سے پہلی وحی درج ذیل ہے۔(سورۃ ۹۶: آیات ۱تا ۵)(۳)

اقرا بسم ربک الذی خلق. خلق الانسان من علق. اقرا و ربک الاکرم . الذی علم بالقلم. علم الانسان مالم یعلم.

"پڑھو(اے نبی ﷺ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے انسان کو پیدا کیا جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے۔ پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ جس نے انسان کو وہ علم دیا ہے جسے وہ نہیں جانتا تھا۔"

پروفیسر حمید اللہ اپنے فرانسیسی ترجمہ قرآن مجید کے ابتدائیہ میں بیان کرتے ہیں کہ اس پہلی وحی کا لب لباب انسانی علم کا ایک ذریعہ ہونے کے سبب قلم کی تعریف کرنا ہے جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے نبی کریم ﷺ کا منصب قرآن کو تحریری شکل میں محفوظ رکھنا تھا۔

متون سے باقاعدہ طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے مکہ سے مدینہ کی جانب تشریف لے جانے سے کافی عرصہ قبل (یعنی واقعہ ہجرت سے کافی مدت پہلے) قرآنی متن جس کا نزول اس وقت تک ہو چکا تھا ضبط تحریر میں لایا جا چکا تھا۔ ہم دیکھیں گے کہ اس معاملہ میں کس طرح استناد کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت محمد ﷺ والذین آمنوا معہ (اور اہل ایمان جو آپ کے ساتھ تھے) نازل شدہ متن کو حافظہ سے تلاوت کرنے کے عادی تھے، لہٰذا قرآن کے لیے ان واقعات کا بیان کرنا ناقابل فہم ہے جو حقیقت سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ اس

لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے متبعین کاتبین سے دریافت کر کے موخر الذکر کی توثیق آسانی سے کر سکتے تھے۔

ہجرت سے پہلے کی چار سورتیں ایسی ہیں جن میں اس بات کا حوالہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ۶۲۲ء میں مکہ سے روانگی سے قبل قران کی کتابت ہوئی تھی

(سورۃ ۸۰: آیات ۱۱ تا ۱۶)

کلا انھا تذکرۃ۔ فمن شآء ذکرہ۔ فی صحف مکرمۃ۔ مرفوعۃ مطھرۃ۔

بایدی سفرۃ۔ کرام بررۃ۔

"ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔

یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہے۔ بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں۔

معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔"

عبداللہ یوسف علی نے اپنے ترجمہ (۱۹۳۴ء) کی تشریح و تفسیر میں لکھا ہے کہ جب یہ سورہ نازل ہوئی، پینتالیس سورتوں میں سے بیالیس لکھی جا چکی تھیں۔ اور مکہ کے مسلمانوں کے پاس محفوظ تھیں (یہ تعداد پوری تعداد ۱۱۴ میں سے تھی)۔

سورۃ ۸۵۔ آیات ۲۱ اور ۲۲:

بل ھو قران مجید. فی لوح محفوظ.

"بلکہ یہ قرآن (۴) بلند پایہ ہے۔ اس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے۔"

سورۃ ۵۶: آیات ۷۷ تا ۸۰:

انہ لقران کریم. فی کتب مکنون. لا یمسہ الا المطھرون.

تنزیل من رب العلمین.

''یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں ثبت ہے جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔''

سورة ۲۵: آیت ۵:

و قالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملی علیه بکرة و اصیلا.

''یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔''

یہاں ان اعتراضات کا بھی حوالہ ملتا ہے جو معاندین رسول اللہ ﷺ پر کرتے تھے اور آپ ﷺ کو (عیاذاً باللہ) جعل ساز قرار دیتے تھے۔ انہوں نے یہ افواہ پھیلا رکھی تھی کہ ماضی کے قصے آپ ﷺ کو املا کر دیئے جاتے ہیں اور آپ ﷺ ان کو لکھ لیتے ہیں یا دوسروں سے لکھوا لیتے ہیں (اس لفظ یعنی ''تملی'' کا مفہوم متنازعہ ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ حضرت محمد ﷺ امی تھے) مطلب خواہ کچھ بھی ہو آیت سے ضبط تحریر میں لائے جانے کے عمل کا حوالہ ملتا ہے جس کی جانب حضرت محمد ﷺ کے مخالفین نے بھی اشارہ کیا ہے۔

ایک سورت میں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی ان اوراق کا ایک آخری حوالہ ملتا ہے۔ جن پر یہ سماوی ہدایت لکھی جاتی تھیں۔

سورة ۹۸: آیات ۲ اور ۳:

رسول من اللہ یتلو اصحفا مطھر ۃ ۔فیھا کتب قیمۃ ۔

''اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔''

لہٰذا قرآن بذات خود اس حقیقت کے لیے اشارے بہم پہنچاتا ہے کہ اس کی کتابت عہد رسالت میں ہوگئی تھی۔ اس واقعہ کا بخوبی علم ہے کہ آپ ﷺ کے متبعین میں بہت سے کاتب تھے جن میں سب سے زیادہ مشہور زید بن ثابت تھے جن کا نام آئندہ نسل میں بھی باقی رہا۔

پروفیسر حمید اللہ نے اپنے فرانسیسی ترجمہ قرآن مجید (۱۹۷۱ء) کے دیباچہ میں ان حالات کا نہایت شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے جو اس وقت چل رہے تھے جب قرآن کا متن ضبط تحریر میں لایا گیا تھا۔ ان کا سلسلہ رسول ﷺ کی رحلت تک جاری رہا۔

تمام ذرائع اس بات پر متفق ہیں کہ جب قرآن کا کوئی جز نازل ہوتا تو نبی کریم ﷺ اپنے خواندہ صحابہ میں سے کسی ایک کو بلاتے اور اس وحی کا اس کو املا کرا دیتے۔ اسی وقت اس بات کی بھی نشاندہی فرما دیتے تھے کہ جو کچھ پہلے نازل ہو چکا ہے اس متن کے کس مقام پر اس نئے جز کو درج کیا جائے......روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کاتبوں سے ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ ان کا املا کرایا ہے اس کو آپ ﷺ کے سامنے پڑھ کر سنائیں تاکہ اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو آپ ﷺ اسے درست فرما دیں..... ایک مشہور روایت یہ بھی ہے کہ ہر سال ماہ رمضان المبارک میں نبی کریم ﷺ پورا قرآن مجید (جتنا نازل ہو چکا تھا) حضرت

جبرئیل کو پڑھ کر سنایا کرتے تھے....اور یہ کہ حضرت محمدﷺ کی رحلت سے پہلے کے مہینہ میں حضرت جبرئیلؑ نے آپﷺ سے دومرتبہ پڑھوا کرسنا تھا.........یہ بات معلوم ہے کہ کس طرح رسول اللہﷺ کے زمانہ سے مسلمان ماہ رمضان کے دوران شب بیداری کرنے اور عام نمازوں کے علاوہ تمام قرآن کی تلاوت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ کئی ذرائع سے مزید انکشاف ہوتا ہے کہ حضرت محمدﷺ کے کاتب حضرت زید رضی اللہ عنہ متون کے آخری مرتبہ جمع کرنے کے موقع پر موجود تھے۔ دوسری جگہ بہت سی دوسری شخصیتوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔"

اس پہلی کتابت کے لیے بے انتہا مختلف نوعیت کا سامان کام میں لایا جاتا تھا: جیسے جھلی، چمڑا، چوبی تختیاں، اونٹ کی ہڈیاں، نرم پتھر کندہ کرنے کے لیے وغیرہ۔

لیکن اس کے ساتھ ہی حضرت محمدﷺ نے مومنین کو یہ بھی ہدایت فرمائی تھی کہ وہ قرآن کریم کو حفظ یاد کریں۔ چنانچہ اگر پورا متن نہیں تو اس کا کچھ حصہ جس کی قرأت نمازوں میں کی جاتی تھی ضرور حفظ کر لیتے تھے۔ اس طرح ایسے حفاظ کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جن کو تمام قرآن یاد تھا اور اس کو وہ حضرات دور افتادہ مقامات پر بھی پھیلاتے تھے۔ متن کو دو طریقوں پر یعنی تحریر اور حفظ کے ذریعہ محفوظ کرنے کا یہ قاعدہ بے انتہا مفید ثابت ہوا۔

نبی کریمﷺ کی رحلت (۶۳۲ء) کے کچھ عرصہ بعد آپﷺ کے جانشین خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے حضرت محمدﷺ کے سابق کاتب اعلیٰ زید بن ثابتؓ سے قرآن کی ایک نقل تیار کرنے کے لیے کہا اور انہوں نے یہ کام انجام دیا حضرت عمرؓ (مستقبل کے خلیفہ ثانی) کی تحریک پر زیدؓ نے مدینہ میں جتنی بھی

معلومات فراہم ہوسکتی تھیں حاصل کیں۔ حفاظ کی شہادت مختلف چیزوں پر افراد کی نجی طور پر لکھی ہوئی الکتاب کی نقلیں، سب کچھ اس مقصد کے لیے تھا کہ نقل کرنے میں تمام ممکنہ غلطیوں سے بچا جا سکے اس طرح قرآن کی ایک بے انتہا قابل اعتماد نقل تیار ہوگئی۔

بعض ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفۃ المؤمنین حضرت عمرؓ نے جو حضرت ابوبکرؓ کے ۶۳۴ء میں جانشین ہوئے ایک جلد (مصحف) تیار کرائی اس کو انہوں نے محفوظ کیا اور اپنی وفات کے وقت اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ زوجۂ رسول اللہ ﷺ کو سپرد کی۔

اسلام کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ نے جن کے پاس منصب خلافت ۶۴۴ء سے ۶۵۵ء تک رہا ماہرین کی ایک خصوصی جماعت کو وہ نسخۂ صحیحہ تیار کرنے کا کام تفویض کیا جس پر ان کا نام درج ہے اس جماعت نے اس شہادت کی صداقت کی جانچ پڑتال کی جو حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش ہوئی تھی، اور جو اس وقت تک حضرت حفصہؓ کی تحویل میں تھی۔ اس جماعت نے ان مسلمانوں سے مشورہ کیا جو پورے متن کے حافظ تھے۔ متن کی صحت کا تنقیدی طور پر تجزیہ بہت سختی سے کیا گیا۔ پیشتر اس کے کہ کسی ایسی معمولی سی آیت کو بھی جس میں اختلافی مواد شامل ہوتا قبول کیا جاتا اور قائم رکھا جاتا شاہدوں کے اتفاق رائے کو ضروری سمجھا گیا۔ یہ بات معلوم ہے کہ اختلاف نسخ کی صورت میں قرآن کی بعض آیات کی بعض سے تصحیح ہو جاتی ہے۔ اس کی توضیح اس صورت میں آسانی سے کی جا سکتی ہے جب یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کے نزول کا سلسلہ بیس

سال (پورے اعداد میں) سے کچھ زیادہ مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا متن تیار ہو گیا جس میں سورتوں کی وہ ترتیب قائم رہی جو رمضان کے دوران جیسا کہ صدر میں بیان کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے پورے قرآن کی تلاوت مروی ہے۔

ممکن ہے کسی شخص کے ذہن میں یہ بات پیدا ہو کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے پہلے تین خلفاء خصوصاً حضرت عثمانؓ کو قرآن کریم کے جمع کرنے اور متن پر نظر ثانی کرنے کی جانب مائل کیا۔ وجوہات فی الحقیقت نہایت سادہ ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کی رحلت کے بعد ابتدائی دو سالوں (دہائیوں) میں اسلام کی اشاعت بہت تیزی سے ہوئی اور یہ ان قوموں میں پھیلا جن کی مادری زبان عربی نہیں تھی۔ اس صورت میں یہ بات ضروری ہوئی کہ ایک ایسا متن تیار کیا جائے۔ جس میں ابتدائی صحت برقرار رہے حضرت عثمانؓ کے نظر ثانی کرانے کا یہی مقصد تھا۔

حضرت عثمانؓ نے نظر ثانی شدہ متن کی نقلیں سلطنت اسلامیہ کے مختلف مراکز کو روانہ فرما دیں۔ یہی وجہ ہے کہ بقول پروفیسر حمید اللہ، حضرت عثمانؓ سے جن نسخوں کو منسوب کیا جاتا ہے وہ تاشقند اور استنبول میں موجود ہیں۔ نقل کرنے میں ایک آدھ ممکنہ سہو سے قطع نظر اس وقت جو قدیم ترین نسخے معلوم ہیں اور پوری اسلامی دنیا میں دریافت ہوئے ہیں وہ یکساں ہیں۔ یہی بات ان نسخوں پر بھی صادق آتی ہے جو یورپ میں محفوظ ہیں (پیرس کی نیشنل لائبریری میں ایسے پارے موجود ہیں جو ماہرین کی تحقیق کے بموجب آٹھویں اور نویں صدی عیسوی یعنی دوسری اور تیسری ہجری تک پرانے ہیں)

متعدد قدیم متون جن کی موجودگی کا علم ہے سوائے خفیف سی تبدیلیوں کے سب کے سب آپس میں متفق ہیں اور ان تبدیلیوں سے بھی متن کے عام مفہوم پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر کبھی سیاق عبادت سے ایک سے زیادہ توضیحات ہوسکتی ہیں تو اس وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا مناسب ہے کہ قدیم ترین، موجودہ زمانہ کی تحریر کی بہ نسبت زیادہ سادہ ہوتی تھی (۵)

۱۱۴ سورتوں کو ان کی بتدریج کم ہوتی ہوئی لمبائی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ تاہم اس میں مستثنیات بھی ہیں۔ وحی کے نزول کے تاریخی سلسلہ کا خیال نہیں رکھا گیا۔ لیکن بیشتر حالات میں اس سلسلہ کا بھی علم ہے متن میں بہت سے مقامات پر واقعات کثیر تعداد میں دیئے گئے ہیں۔ بعض اوقات ان کی تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ اکثر کسی ایک موقع پر ایسے واقعے کی تفصیل دے دی گئی ہے جو دوسری جگہ غیر مکمل حالت میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن میں مذکور بہت سے واقعات کی طرح جدید سائنس سے متعلق ہر بات الکتاب میں واقعات کی یکسانیت کا خیال کیے بغیر منتشر حالت میں موجود ہے۔

حواشی

۱۔ اگرچہ روایات صحیحہ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے بعض صحابہ نے حضور رسالت مآب ﷺ کے زمانہ میں ہی حدیثیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ کی شہادت موجود ہے کہ وہ حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن مصنف علام کا اشارہ ان احادیث کے مجموعوں کی طرف ہے جو اس وقت موجود اور مروج ہیں۔ ان کے بارے میں بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں نے اس قباحت سے بچنے کے لیے کہ کہیں صحیح کے ساتھ موضوع روایات بھی شامل نہ ہو جائیں حدیث کو جانچنے کے لیے کچھ اصول مرتب کیے۔ اور راویوں کی پوری طرح جانچ پرکھ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صحیح احادیث کا بھی ایک بڑا ذخیرہ محفوظ رہ گیا۔

۲۔ جس وقفہ کی جانب مصنف نے اشارہ کیا ہے اس کو ''فترۃ وحی'' کی اصطلاح دی گئی ہے اس کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ''مدارج النبوۃ'' میں تحریر کرتے ہیں۔ مفسرین و محققین کہتے ہیں کہ فترت وحی کی مدت تین سال ہے یعنی اقرا الخ کی پہلی وحی کے بعد تین سال کی مدت تک وحی کا نزول نہیں ہوا۔ ابن اسحاق نے ''مواجب لدنیہ'' میں کہا ہے کہ امام احمدؒ نے تاریخ شعبی میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی عمر شریف اکتالیس سال کی تھی کہ وحی کا

سلسلہ رک گیا اور تین سال تک آپ کی نبوت کو حضرت اسرافیلؑ سے قریب کر دیا گیا۔ وہ آپ ﷺ کو نبوت تعلیم فرماتے رہے اور اس مدت میں قرآن سے کوئی آیت نازل نہیں ہوئی جس کو حضرت اسرافیلؑ اپنی زبان سے ادا کرتے، جب آپ ﷺ کی عمر چوالیس سال کی ہوئی (یعنی تین سال کی فترت کے بعد) تو آپ ﷺ کی نبوت کی تعلیم حضرت جبریلؑ کے سپرد کر دی گئی۔ پس آپ ﷺ پر قرآن نازل ہونا شروع ہوا اور یہ سلسلہ بیس سال تک جاری رہا۔''

حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت امام زہریؒ سے روایت ہے کہ پہلی وحی کے بعد نزول وحی کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے موقوف ہو گیا۔ اس کے بعد سورہ مدثر نازل ہوئی اور پھر نزول وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

اس سلسلہ میں متضاد روایات ملتی ہیں لیکن صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف کچھ عرصہ کے لیے وحی کا التواء ہوا تھا۔ (مترجم)

۳۔ حضرت محمد ﷺ ان الفاظ کو سن کر پوری طرح حیران و ششدر رہ گئے، ہم ان کی تشریح کی جانب پھر مراجعت کریں گے۔ بالخصوص اس حقیقت کی روشنی میں کہ حضرت محمد ﷺ نہ پڑھ سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے۔

۴۔ متن میں لفظ قرآن ہے جس کے معنی قرأت اور پڑھنا بھی ہیں۔

۵۔ مثال کے طور پر امتیازی نشانات کا فقدان ایک ایسے فعل

کو وجود میں لا سکتا تھا۔ جو فعل متعدی ہوتا یا فعل لازم اور بعض صورتوں میں یا مذکر ہوتا یا مونث۔ لیکن اکثر و بیشتر یہ بات زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہوتی اس لیے کہ سیاق عبارت بہت سی صورتوں میں مفہوم کو واضح کر دیتا ہے۔

باب سوم

ارض وسماوات کی تخلیق

بائبل کے بیانات سے اختلافات واتفاقات

عہد نامہ قدیم کے برعکس قرآن میں تخلیق کا کوئی مربوط بیان نہیں ملتا۔ایک مسلسل تذکرہ کے بجائے تمام کتاب میں ایسی عبارتیں منتشر حالت میں دکھائی دیتی ہیں جن میں تخلیق کے بعض پہلو بیان ہوئے ہیں اور جو اس کے ارتقاء کی نشاندہی کرنے والے سلسلے وار واقعات کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ معلومات تفصیل کے اعتبار سے مختلف درجے کی ہیں۔اس بات کا واضح تصور حاصل کرنے کے لیے کہ یہ واقعات کس طرح پیش کیے گئے ہیں، متعدد سورتوں میں پھیلے ہوئے ان اجزاء کو یکجا کرنا پڑتا ہے۔

تمام کتاب میں ایک ہی مضمون کے حوالوں کا یہ انتشار تخلیق کے موضوع کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے قرآن میں بہت سے اہم موضوعات کو اسی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔خواہ وہ ارضی حوادث ہوں یا سماوی یا انسان سے متعلق ایسے مسائل ہوں جو سائنسدانوں کی دلچسپی کے ہیں۔ان موضوعات میں سے ہر ایک

کے سلسلہ میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ تمام آیات کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔

یورپ کے بہت سے شارحین کے نزدیک قرآن میں تخلیق کا بیان بہت کچھ بائبل سے ملتا جلتا ہے۔لہذا وہ دونوں کے بیانات کو نہایت اطمینان کے ساتھ پہلو بہ پہلو پیش کر دیتے ہیں مجھے یقین ہے کہ یہ تصور غلط ہے اس لیے کہ ان میں نہایت نمایاں اختلافات ہیں۔ان موضوعات پر جو سائنسی نقطہ نظر سے کسی طرح بھی غیر اہم نہیں ہیں ہمیں قرآن میں ایسے بیانات ملتے ہیں جن کے مثل بائبل میں تلاش کرنا بے سود ہے۔موخر الذکر میں کچھ ایسے بیانات ہیں جن کے ہم معنی قرآن میں نہیں ہیں۔

دونوں متنوں میں واضح یکسانیتیں بخوبی معلوم ہیں۔ان میں سے پہلی نظر میں جو واقعہ سامنے آتا ہے وہ ہے تخلیق کے سلسلہ وار مدارج کا بیان۔یہ یکساں ہے بائبل کے چھ دن،قرآن کے ستہ ایام سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن حقیقت میں مسئلہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے اور یہ اس قابل ہے کہ اس کا جائزہ لینے کے لیے تھوڑا سا توقف کیا جائے۔

تخلیق کے چھ ادوار

بائبل میں تخلیق کائنات چھ دن میں ہونے کے سلسلہ میں جو بیان دیا گیا ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے۔ (۱) اس کے بعد ایک دن آرام یعنی یوم سبت ہے اور یہ سب ہفتے کے دنوں کے ساتھ منطبق ہوئے ہیں۔ یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح کے پادریوں کے اختیار کردہ اس طرز بیان سے کس طرح لوگوں میں یوم سبت کو منانے کا رجحان پیدا ہوا۔تمام یہودیوں سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ سبت کے دن اسی طرح آرام کریں گے۔ (۲) جس طرح کہ خداوند نے ہفتہ کے چھ دنوں کے دوران محنت کرنے کے بعد آرام کیا تھا۔

جس طرح سے بائبل میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔لفظ دن سے مراد وہ وقفہ ہے جو کرہ ارض کے کسی باشندہ کے لیے دو متواتر طلوع آفتاب یا غروب آفتاب کے درمیان پڑتا ہے۔ جب اس کی یہ تعریف کی جائے تو دن کا انحصار زمین کے اپنے محور کے گرد ایک چکر کاٹنے پر ہوا۔ یہ بات واضح ہے کہ منطقی طور پر جس طرح ابھی تعریف کی گئی ''دنوں'' کا کوئی سوال نہیں ہوسکتا اگر اس سے وہ ترکیب مراد لی جائے جو ان کے ظہور کا سبب ہوتی ہے۔۔۔یعنی زمین کی موجودگی اور سورج کے گرد اس کی گردش۔۔۔اس لیے کہ تخلیق کے ابتدائی مدراج میں جیسا کہ خود بائبل کے بیان سے ظاہر ہے۔اس کا تعین نہیں ہوا تھا۔اس عدم امکان پر اس جزو اولی میں پہلے ہی زور دیا جا چکا ہے۔

جب ہم قرآن کے متعدد ترجموں سے رجوع کرتے ہیں تو ہمارے مطالعہ میں

آتا ہے کہ، بائبل کے بیان سے ملتا جلتا، اسلامی تنزیل میں بھی تخلیق کا سلسلہ وہی چھ دنوں میں انجام کو پہنچا۔ مترجمین کی اس حقیقت پر گرفت نہیں کی جاسکتی کہ انہوں نے عربی کے لفظ کا اس کے نہایت عام مفہوم کے اعتبار سے ترجمہ کیا ہے۔ یہی وہ انداز ہے کہ جس میں ترجموں میں عام طور پر اس کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیت ۵۴، سورۃ ۷ اس طرح پر ہے۔

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِی خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّا مٍ

''درحقیقت تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔''

قرآن کے بہت کم تراجم اور تفاسیر ایسے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ لفظ ''ایام'' کو حقیقی طور پر کس طرح ''ادوار'' کے معنوں میں لیا جائے۔ علاوہ ازیں یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ اگر تخلیق کے موضوع پر قرآنی متون نے اس کے مدارج کو ایام میں تقسیم کیا تھا تو اس کا شعوری مقصد ان عقائد کو اختیار کرنا تھا جو آغاز اسلام کے وقت تمام یہود و نصاریٰ مانتے تھے۔ اور ایسے ہمہ گیر عقیدہ سے شدید مقابلہ سے بچنا تھا۔

اس نقطہ نظر کو اس طرح مسترد کئے بغیر غالباً اس مسئلہ کو ذرا زیادہ غور سے دیکھا جائے اور خود قرآن میں اس کا حل تلاش کیا جائے نیز زیادہ عمومی انداز میں اس وقت کی زبان کو سامنے رکھ کر اس لفظ کے اس امکانی مفہوم کو معلوم کیا جائے جو کو بہت سے مترجمین اس وقت بھی ''دن'' کے لفظ سے ظاہر کر رہے ہیں: عربی لفظ یوم ہے جس کی جمع ایام ہے۔

اس کا نہایت عام مفہوم ''دن'' ہے لیکن زیادہ زور اس بات پر دینا پڑے گا کہ

یہ لفظ اس وقت کی لمبائی کے مقابلہ میں جو ایک دن کے غروب آفتاب سے دوسرے دن کے غروب آفتاب تک ممتد ہے دن کی روشنی کے معنوں پر زیادہ صادق آتا ہے اس لفظ کے جمع ایام سے مراد بعینہ دن نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم وقت کا طویل وقفہ بھی ہو سکتا ہے جو وقت کی ایک غیر میعنہ مدت ہے (لیکن ہمیشہ ایک طویل مدت) یہ مفہوم یعنی وقت کی مدت، جو اس لفظ میں شامل ہے قرآن میں اور جگہ بھی ملتا ہے۔ چنانچہ حسب ذیل ملاحظہ ہو۔

سورۃ ۳۲، آیت ۵

فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون.

''ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔''

(یہ بات قابل توجہ ہے کہ چھ ادوار میں تخلیق قطعاً وہی بات ہے جس کا حوالہ آیت ۵ سے پہلے کی آیات میں دیا گیا ہے)

سورۃ ۷۰، آیت ۴

فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ.

''ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔''

یہ حقیقت کہ لفظ یوم سے مراد وقت کا ایک ایسا وقفہ بھی ہو سکتا ہے جو اس مدت سے قطعاً مختلف ہو جو ہمارے نزدیک لفظ دن سے عبارت ہے نہایت ابتدائی دور کے مفسرین کے لیے موجب حیرت تھی جو کو فی الحقیقت کائنات کی تشکیل کے مدارج کی لمبائی سے متعلق وہ معلومات نہیں تھی جو آج ہمیں ہے۔ مثلاً سولھویں صدی عیسوی میں ''ابو السعود'' نے جس کو دن کا وہ تصور نہیں تھا جو علم ہیئت کے

اعتبار سے زمین کی گردش محوری کی اصطلاح میں واضح کیا جاتا ہے۔ یہ سمجھا تھا کہ تخلیق کے لیے ایک ایسی تقسیم کا تصور کرنا پڑے گا جو دنوں کی شکل میں نہیں تھی جیسا کہ اس لفظ سے عموماً سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ واقعات و حوادث کی صورت میں تھی (عربی میں نبا ہے)

موجودہ دور کے شارحین و مفسرین اس تاویل کی جانب گئے ہیں۔ یوسف علی (۱۹۳۴ء) ہر اس آیت کی تفسیر میں جو تخلیق کے مختلف مدارج سے بحث کرتی ہے اس لفظ کو حقیقتاً نہایت طویل وقفوں یا ادوار یا جگ (قرن) کے معنوں میں لینے پر مصر ہیں حالانکہ دوسرے موقع یا محل پر اس کے معنی ''دن'' ہی کے لیے ہیں۔ لہذا یہ بات ممکن ہے دنیا کی تخلیق کی حالت میں قرآن وقت کے ایسے طویل وقفوں کو قائم رکھتا ہو جن کی تعداد چھ ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ جدید سائنس نے انسان کو اس واقعہ کے تعین کی اجازت نہیں دی ہے کہ کائنات کے تشکیل تک پہنچانے والے عمل میں جو پیچیدہ مدارج رونما ہوئے ہیں ان کی تعداد چھ ہے۔ بلکہ اس نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ وقت کے ایسے طویل وقفے پیش آئے جن کے مقابلہ میں ''دنوں'' کی اکائیاں جن کا ہم تصور کرتے ہیں مضحکہ خیز معلوم ہوں گی۔

قرآن کی ایک طویل ترین عبارت جو تخلیق سے بحث کرتی ہے۔ موخر الذکر کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ ایک ارضی واقعات اور ایک سماوی واقعات کے تذکرہ کو پہلو بہ پہلو رکھ دیتی ہے۔ زیر غور آیات سورہ ۴۱ کی آیات ۹ تا ۱۲ ہیں۔

(اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ سے مخاطب ہے)

قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین و تجعلون

لہ اندادا ط ذلک رب العلمین و جعل فیھا رواسی من فوقھا و برک فیھا و تدر فیھا فواتھا فی اربعۃ ایام سو آء للسائلین ثم استوی الی السماء و ھی دخان فقال لھا و للارض ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین فقضھن سبع سموت فی یومین و اوحی فی کل سماء امرھا و زینا السماء الدنیا بمصابیح و حفظا ذالک تقدیر العزیز العلیم ۔

''اے نبی ﷺ، ان سے کہو، کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے اس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا یہ سب کام چار دن میں ہو گئے پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا (۳) جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا ''وجود میں آ جاؤ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو'' دونوں نے کہا ''ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح'' تب اس نے دو دن کے اندر آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔''

سورہ ۴۱ کی ان چار آیات میں وہ کئی نکات بیان ہوئے ہیں جن کی جانب ہم مراجعت کریں گے وہ ہیں ساوی مادہ کی ابتدائی گیسی حالت اور آسمانوں کی تعداد

سات کی انتہائی ایمائی تعین۔ اس تعداد میں مضمر جو مفہوم ہے وہ ہم تلاش کریں گے نیز ایسا ہی ایمائی نوعیت کا وہ مکالمہ ہے جو ایک طرف خدا کے اور دوسری جانب ابتدائی آسمان اور زمین کے مابین ہوا۔ بہر کیف یہاں ''سموت'' اور ''ارض'' کے وجود میں آنے کے بعد امر الٰہی کے آگے صرف ان کی اطاعت کا اظہار مقصود ہے۔

ناقدین کو اس عبات میں تخلیق کے چھ ادوار والے بیان کے ساتھ ایک نوع کا تضاد دکھائی دیتا ہے۔ زمین کی تشکیل کے دو ادوار کو اس کے باشندوں کے لیے اشیاء کے پھیلانے کی چار ادوار کی مدت میں جمع کر کے آسمانوں کی تشکیل کے ادوار کا اضافہ کیا جائے تو آٹھ ادوار بنتے ہیں۔ اس صورت میں مذکور بالا چھ ادوار سے اس کا تضاد و تناقض ہو جائے گا۔

لیکن فی الحقیقت یہ متن جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر سوچنے کی جانب مائل کرتا ہے جس میں ابتداء زمین کی تخلیق سے اور انتہا سموات کی تشکیل پر ہوتی ہے اس میں دو اجزاء فراہم کیے گئے ہیں جن کا اظہار لفظ ''ثم'' سے ہوتا ہے اور جس کا ترجمہ ''علاوہ ازیں'' سے کیا جاتا ہے۔ لیکن جس کا مفہوم مزید براں اور پھر بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایک تسلسل کا مطلب بھی اس سے نکالا جا سکتا ہے جو واقعات کے تسلسل سے یا ان واقعات پر جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ انسان کے غور و فکر کے ایک سلسلہ کی جانب اشارہ کرتا ہے یہ ایک سادہ سا حوالہ بھی ان واقعات کی جانب ہو سکتا ہے جو اس قصد کے بغیر آگے پیچھے رکھ دیئے گئے ہیں کہ ان سے یہ تصور دیا جائے کہ ایک واقعہ دوسرے کے بعد ہوا ہے بات خواہ کچھ ہو

سماوات کی تخلیق کی مدت زمین کی تخلیق کے دو ادوار کے ساتھ بھی بہ آسانی منطبق ہوسکتی ہے۔ ہم کچھ ہی بعد میں دیکھیں گے کہ کائنات کی تشکیل کا بنیادی عمل قرآن میں کس طرح بیان کیا گیا ہے اور ہمیں یہ بھی پتہ چلے گا کہ یہ بات جدید تصورات کے مطابق مشترکہ طور پر سموات اور ارض پر کس طرح منطبق کی جاسکتی ہے۔ اس وقت ہم محسوس کریں گے کہ یہ طریقہ واقعات کے ہم وقتی تصور کے سلسلے میں جس کا یہاں تصور کیا گیا ہے کس حد تک مکمل طور پر معقول ہے۔

یہاں جو اقتباس پیش کیا گیا ہے اس میں اور دنیا کے چھ مدارج میں تشکیل پانے کے اس تصور کے لحاظ سے کوئی تضاد دکھائی نہیں دیتا جو قرآن کے متن میں کسی دوسری جگہ دیا گیا ہے۔

ارض وسمٰوات کی تخلیق کے لیے قرآن کوئی تطابق زمانی قائم نہیں کرتا

قرآن کے ان دو اقتباسات میں جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے ایک آیت میں سموات اور ارض کی تخلیق کا حوالہ دیا گیا ہے۔(سورۃ ۷ آیت ۵۴) اور ایک دوسری جگہ ارض اور سمٰوات کی تخلیق کا (سورۃ ۴۱ آیات ۹ تا ۱۲) لہٰذا قرآن سمٰوات اور ارض کی تخلیق کے لیے کوئی تطابق زمانی قائم کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔

جن آیات میں ارض (زمین) کا ذکر پہلے ہے ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے یعنی سورۃ ۲ آیت ۲۹ اور سورہ ۲۰ آیت ۴ جہاں یہ حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔ تنزیلا ممن خلق الارض والسمٰوت العلیٰ۔ ''اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو''۔

اس کے برعکس ان آیات کی تعداد کہیں زیادہ ہے جن میں سمٰوات (آسمانوں) کا ذکر ارض (زمین) سے پہلے کیا گیا ہے (سورۃ ۷، آیت ۵۴: سورۃ ۱۰ آیات ۲: سورۃ ۱۱، آیت ۷: سورۃ ۲۵، آیت ۵۹: سورۃ ۳۲، آیت ۴: سورۃ ۵۰، آیت ۳۸: سورۃ ۷۹، آیات ۲۷ تا ۳۲: سورۃ ۹۱ آیات ۵ تا ۱۰۔

حقیقت یہ ہے کہ سورۃ ۷۹ کے علاوہ قرآن میں کوئی بھی عبارت ایسی نہیں ہے جس میں واضح طور پر تطابق زمانی قائم کیا گیا ہو ورنہ ایک معمولی سے حرف عطف (و) کے ساتھ جس کا مفہوم ''اور'' ہے دو الفاظ کو مربوط کیا گیا ہے۔ یا لفظ ''ثم'' (پھر) ہے جو جیسا کہ محولہ بالا عبارت میں دیکھا جا چکا ہے یا تو ایک سادہ

سے مرکب امتزاجی کو ظاہر کرتا ہے یا تطابق زمانی کو۔

مجھے قرآن میں صرف ایک عبارت ایسی دکھائی دیتی ہے جس میں تخلیق کے مختلف واقعات کے درمیان صاف طور پر ایک واضح تطابق زمانی قائم کیا گیا ہے یہ مضمون سورۃ ۷۹ کی آیت ۲۷ تا ۳۳ میں بیان ہوا ہے۔

ء انتم اشد خلقا ام السمآء بنها . رفع سمکها فسوها . و اغطس لیلها و اخرج ضحها . و الارض بعد ذلک دحها . اخرج سبء ماء ها و مرعها . والجبال ارسها . متاعالکم و لا لعمکم.

"کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی۔ اللہ نے اس کو بنایا۔ اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی۔ پھر اس کا توازن قائم کیا اور اس کی رات ڈھالی اور اس کا دن نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے۔ سامان زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے۔"

اللہ جل شانہ کی جانب سے انسان کے لیے ارضی انعامات کی یہ فہرست، جو ایسی زبان میں بیان ہوئی ہے جو جزیرہ نمائے عرب کے کاشتکاروں اور بدوؤں کے لیے موزوں ہے، دینے سے پہلے آسمانوں کی تخلیق پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے اس میں اس مرحلہ کا حوالہ جب خدا زمین کو بچھاتا اور اس کو قابل کاشت بناتا ہے۔ وقت کے لحاظ سے نہایت واضح طور پر اس جگہ دیا گیا ہے جب رات اور دن کا سلسلہ قائم ہو چکا ہوتا ہے لہذا یہاں دو گروپوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ ایک سماوی حوادث کا دوسرا ارضی حوادث کا جن کو وقت کے اعتبار سے الگ الگ کر دیا گیا ہے یہاں جو حوالہ دیا گیا ہے اس کا اطلاق اس بات پر ہوتا ہے کہ لازمی طور

پر زمین کا وجود اس کے پھیلائے جانے سے پہلے سے تھا اور یہ کہ نتیجتہً یہ اس وقت موجود تھی، جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو تخلیق کیا۔ اس لیے سماوی و ارضی ارتقاء کے دونوں حوادث کے ساتھ باہم منسلک ہونے سے جو بات نکلتی ہے اس سے ان دونوں کے لازم وملزوم ہونے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآنی متن میں جو حوالہ ملتا ہے۔ اس میں ارض کی تخلیق سمٰوات سے پہلے یا سموات کی ارض سے پہلے کے تصور کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔ الفاظ کا محل استعمال اس وقت تک اس ترتیب پر اثر انداز نہیں ہوتا جس میں تخلیق کا عمل رونما ہوا جب تک کہ مخصوص طور پر اس کا ذکر نہ کیا جائے۔

قرآن کریم میں اس حادثہ کی مختصر ترکیب دو آیات میں پیش کی گئی ہے۔ جن سے کائنات کی تشکیل کا بنیادی طریق عمل ظہور پذیر ہوا۔

سورۃ ۲۱، آیات ۳۰۔

الم یر الذین کفروا ان السموت والارض کانتا رتقا نفتقنھما و جعلنا من المآء کل شی ءٍ حی افلا یوء منون.

''کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ کو پیدا کیا؟ کیا وہ ہماری اس خلاقی کو نہیں مانتے؟''

سورۃ ۴۱۔ آیت ۱۱۔

اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو زمین کی تخلیق کے موضوع پر غور و خوض کی دعوت دینے کے بعد یہ بتانے کا حکم دیتا ہے۔

ثم استوی الی السمآء و ھی دخان فقال لھا و للارض.

''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا۔اس نے آسمان اور زمین سے کہا......''

اس کے بعد اطاعت کے احکام ہیں جن کا حوالہ صفحہ ۱۳۸ پر دیا گیا ہے ہم ''حیات کی ابتداء پانی سے'' کے موضوع کی جانب بعد میں مراجعت کریں گے اور دیگر حیاتیاتی مسائل کے ساتھ جو قرآن میں اٹھائے گئے ہیں ان کا جائزہ لیں گے۔فی الحال یاد کرنے کے قابل سے اہم امور حسب ذیل ہیں۔

(ا) نہایت چھوٹے ذرات پر مشتمل ایک گیسی مرغولہ کے وجود کا ذکر، اس لیے کہ یہی وہ بات ہے جس کے ذریعہ لفظ دھوئیں (عربی میں دخان) کی توضیح و تشریح کی جاسکتی ہے۔دھواں عموماً ایک گیسی تہہ جمع کم و بیش مستحکم تعلیق کی حالت میں مہین ذرات سے مرکب ہوتا ہے، یہ ذرات ایسے مادہ کی ٹھوس اور رقیق حالتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن کا درجہ حرارت زیادہ یا کم ہوتا ہے۔(۴)

(ب) ایک بنیادی سادہ سا مادہ میں جس کے عناصر ابتدا میں باہم گتھے ہوئے تھے (رتق) ایک دوسرے سے جدائی (فتق) کا حوالہ۔یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عربی میں ''فتق'' ٹوٹنے،منتشر ہونے اور جدا ہونے کا عمل ہے اور ''رتق'' آمیزش ہونے یا عناصر کے اس طرح باہم مربوط ہونے کا نام ہے کہ ان سے مل کر ایک متجانس کل بن جائے۔(۵)

ایک کل میں افتراق کے اس عمل کو الکتاب کی دوسری عبارتوں میں بھی بیان کیا گیا ہے اور اسی میں متعدد عالموں کا حوالہ دیا گیا ہے۔قرآن کی پہلی سورۃ کی پہلی

ہی آیات میں ابتدا ہی اس طور پر ہوئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العلمین.

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے، سب اچھی تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام عالموں کا رب ہے۔"

لفظ "عالمین" قرآن میں متعدد بار استعمال ہوا ہے آسمانوں کا ذکر بھی کثرت تعداد کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بات محض ان کی جمع کی شکل کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کی علامتی تعداد سات کی وجہ سے بھی ہے۔

یہ عدد پورے قرآن میں مختلف عددوں کو ظاہر کرنے کے لیے ۲۴ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مفہوم اکثر "بہت" ہوتا ہے۔ اگر چہ ہم صحیح طور پر نہیں جانتے کہ اس عدد کا یہ مفہوم کس لیے لیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یونانی اور رومی بھی سات کے عدد کو ایک غیر معینہ کثرت تعداد کا تصور دلانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ قرآن میں سات کا عدد خود آسمانوں (سموات) کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے صرف آسمان مراد لیے جاتے ہیں۔ ایک جگہ آسمانوں کے سات راستوں کی جانب بھی اشارہ ہے۔۔۔۔۔۔سورۃ ۲۔آیت ۲۹۔

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا ثم استوی الی السمآء فسوھن سبع سموت و ھو بکل شیء علیم.

"وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔ پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کیے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔"

سورۃ ۲۳، آیت ۱۷۔

ولقد خلقنا فوقکم سبع طرآئق وما کنا عن الخلق غفلین.

''اور تمہارے اوپر ہم نے سات راستے بنائے تخلیق کے کام سے ہم کچھ نابلد نہ تھے۔''

سورۃ ۶۷۔ آیت ۳۔

الذی خلق سبع سموت طباقا ما تری فی خلق الرحمن من تفوت فارجع البصر هل تری من فطور.

''(خدا ہی وہ ذات ہے) جس نے تہ بر تہ سات آسمان بنائے۔ تم رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو کہیں تمہیں کوئی خلل نظر نہیں آتا ہے۔''

سورۃ ۷۱۔ آیات ۱۵، ۱۶۔

الم تروا کیف خلق الله سبع سموت طباقا. وجعل القمر فیهن نورا و جعل الشمس سراجا.

''کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بر تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا۔''(۶)

سورۃ ۷۸۔ آیات ۱۲، ۱۳۔

و بنینا فوقکم سبعا شدادا. و جعلنا سراجا و هاجا.

''اور تمہارے اوپر ہم نے سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا۔''

یہاں گرم چراغ سے مراد سورج ہے۔

قرآن شریف کے مفسرین ان سب کی سب آیتوں پر متفق ہیں کہ سات کا عدد کثرت کے اظہار کے سوا کچھ نہیں۔ (۷)

لہذا بہت سے آسمان ہیں اور بہت سی زمینیں ہیں۔ اور قرآن کے قاری کو یہ جان کر کچھ کم حیرت نہیں ہوتی کہ ہماری زمین کی طرح کائنات میں اور بھی زمینیں ہوسکتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق ہمارے زمانہ میں بھی ابھی انسان نہیں کرسکا ہے۔

تاہم سورۃ ۶۵ کی آیت ۲ سے مندرجہ ذیل پیشین گوئی ہوتی ہے۔

الله الذی خلق سبع سموت و من الارض مثلهن. یتنزل الامر بلینهن لتعلموا ان الله علی کل شی ء قدیر لا و ان الله قد احاط بکل شی ء علما.

"اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی ان ہی کی مانند ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے (یہ بات تمہیں اس لیے بتائی جارہی ہے) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔"

چونکہ ۷ کا عدد ایک غیر معین کثرت کو ظاہر کرتا ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکالنا ممکن ہے کہ قرآنی متن میں صاف طور پر ہماری اپنی زمین کے علاوہ ایک سے زیادہ زمینوں کے وجود کا اظہار ہو رہا ہے۔ یعنی کائنات میں اس کی مانند اور زمینیں بھی ہیں۔

ایک اور مشاہدہ جو قرآن کے بیسویں صدی کے کسی قاری کو محو حیرت کر دیتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ آیات قرآن میں مخلوقات کی تین جماعتوں کا حوالہ ملتا ہے یعنی

۱۔ وہ اشیاء جو آسمانوں میں ہیں۔

۲۔ وہ اشیاء جو زمین پر ہیں۔

۳۔ وہ اشیاء جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں۔

ذیل میں ان آیات میں سے کئی درج ہیں۔

سورۃ ۲۰۔آیت ۶:

لہ ما فی السموت وما فی الارض وما بینهما وما تحت الثری.

''وہ مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو زمین وآسمان کے درمیان ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں۔''

سورۃ ۲۵ آیت ۵۹:

الذی خلق السموت والارض وما بینهما فی ستة ایام.

''وہ ذات جس نے چھ دنوں (ادوار) میں زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں۔''

سورۃ ۳۲، آیت ۴:

اللہ الذی خلق السموت والارض وما بینهما فی ستة ایام۔

''وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو

جو ان کے درمیان ہیں چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیا۔''

سورۃ ۵۰۔آیت ۳۸:

ولقد خلقنا السموت والارض وما بینھما فی ستة ایام و ما مسنا من لغوب . (۸)

''ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا اور ہمیں کوئی تھکان لاحق نہیں ہوئی۔''

قرآن میں اس بات کا ذکر کہ ''آسمانوں اور زمین کے درمیان کیا ہے۔'' مندرجہ ذیل آیات میں پھر ملتا ہے: سورۃ ۲۱، آیت ۱۶: سورۃ ۴۴، آیت ۷ اور آیت ۳۸: سورۃ ۷۸، آیت ۳۷: سورۃ ۱۵، آیت ۸۵: سورۃ ۴۶، آیت ۳: سورۃ ۴۸، آیت ۸۵۔

آسمانوں کے ماورا اور زمین سے باہر یہ تخلیق جس کا ذکر کئی مرتبہ کیا گیا ہے وہ چیز ہے جس کا تصور مشکل ہے۔ان آیات کو سمجھنے کے لیے کائنات کے ماورائے کہکشانی مادہ کے بارے میں انسان کے جدید ترین مشاہدات و تجربات کا حوالہ دینا پڑے گا۔اور کائنات کی تشکیل کے سلسلہ میں عصری سائنس نے جو تصورات قائم کیے ہیں ان کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔سادہ ترین سے شروع کرکے انتہائی پیچیدہ باتوں تک جانا پڑے گا۔درج ذیل پارہ کے موضوعات یہی ہیں۔

لیکن ان خالص سائنسی مواد تک پہنچنے سے قبل یہ بات قرین مصلحت ہے کہ ان مخصوص نکات کا اعادہ کر دیا جائے جن پر قرآن ہمیں تخلیق کے بارے میں آگاہ کرتا ہے۔سابقہ اقتباسات کے مطابق یہ نکات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ عام تخلیق کے لیے چھ ادوار کا ہونا۔

۲۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے مدارج کا آپس میں جڑا ہونا۔

۳۔ کائنات کی تخلیق ایک ابتدائی نوعیت کے ایسے مادہ سے جو ایک بڑے تودے کی شکل میں تھا اور جو بالآخر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

۴۔ آسمانوں اور زمینوں کی کثرت۔

۵۔ آسمانوں اور زمین کے درمیان ایک متوسط تخلیق کا وجود۔

کائنات کی تشکیل سے متعلق بعض جدید سائنسی معلومات

نظام شمسی

زمین اور سیارے جو سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں، ان سے ابعاد ثلاثہ کا ایک منظم جہان تیار ہوا ہے جو ہمارے دنیوی پیمانہ سے نہایت وسیع و عریض اور قوی الجثہ معلوم ہوتا ہے۔ زمین سورج سے تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہے۔ یہ ایک انسان کے لیے بہت بڑا فاصلہ ہے۔ لیکن اس فاصلہ کے مقابلہ میں یہ بہت ہی کم ہے جو سورج کا نظام شمسی میں واقع بعید ترین سیارے (پلوٹو) سے ہے۔ پورے پورے اعداد میں دیکھا جائے تو یہ فاصلہ زمین سے سورج کے فاصلہ کا چالیس گنا ہے یعنی تقریباً تین ارب سر سٹھ کروڑ بیس لاکھ میل ہے۔ اس فاصلہ کو دگنا کر دیا جائے تو ہمارے نظام شمسی کی سب سے بڑی وسعت معلوم ہو جاتی ہے۔ سورج کی روشنی کو پلوٹو تک پہنچنے میں تقریباً ۶ گھنٹے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ فاصلہ ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کی ہیبت ناک رفتار سے طے ہوتا ہے۔ لہذا روشنی کو ان ستاروں سے جو معلوم ساوی جہان کے اس سرے پر واقع ہیں ہم تک پہنچنے میں اربوں سال لگ جاتے ہیں۔

کہکشائیں

سورج جس کے اردگرد کے دیگر سیاروں کی طرح ہم بھی ایک طفیلی ہیں بذات خود اک کل کے جس کو کہکشاں کہا جاتا ہیہ۔ ایک کھرب انتہائی چھوٹے چھوٹے ارکان میں سے ایک ہے موسم گرما کی کسی خوشگوار رات میں تمام فضا ان ستاروں سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے جس سے وہ چیز بنتی ہے جس کو آکاش گنگا کہا جاتا ہے۔ اس مجموعہ کی وسعتیں بے پناہ ہیں جبکہ روشنی نظام شمسی کو گھنٹوں کی اکائیوں میں طے کرتی ہے اس کو ہماری کہکشاں کے ستاروں کے بے انتہا گتھے ہوئے مجموعہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے میں تخمیناً ۹۰۰۰۰ سال کی مدت درکار ہوگی۔

تاہم وہ کہکشاں جس سے ہمارا تعلق ہے، باوجودیکہ اس قدر حیرت خیز طور پر وسیع ہے۔ ایک سموٰت کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ آکاش گنگا کی طرح ستاروں کے اور دیو پیکر ذخیرے یا مجموعے ہیں جو ہماری کہکشاں کے باہر واقع ہیں۔ (۹) ان کو دریافت ہوئے پچاس سال سے کچھ زیادہ کی مدت ہوئی ہے جب علم ہیئت کو ایک ایسے بصری آلہ کے استعمال کا موقع ملا جو ایسا ہی پر فریب تھا جیسا کہ وہ آلہ جس کی بناء پر ریاست ہائے متحدہ میں ماؤنٹ ولسن کی دوربین بنانے میں مدد ملی۔ (۱۰) اس طرح ایسے الگ الگ کہکشانی جہان اور کہکشانوں کے مادوں کی ایک نہایت کثیر تعداد دریافت ہو چکی ہے۔ جو اتنی دور واقع ہیں کہ ان کے لیے خاص قسم کی اکائیاں وضع کرنا ضروری ہوا جو نوری یا روشنائی سال اور پارسک کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں (پارسک وہ فاصلہ ہے جس کو ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے طے کرنے میں روشنی کو ۳۰۲۶ سال یعنی

تقریباً سوا تین سال لگ جاتے ہیں)۔(۱۱)

کہکشاؤں، ستاروں اور نظامہائے سیارگان کی تشکیل اور ان کا ارتقاء

جس بے پناہ وسیع مکان کو اس وقت کہکشاں گھیرے ہوئے ہیں وہاں ابتداء میں کیا تھا؟ جدید سائنس اس سوال کا جواب کائنات کے ارتقاء میں ایک خاص وقفہ کی شکل میں دے سکتی ہے۔ یہ اس وقت کے طول کو اعداد میں بیان نہیں کر سکتی جو اس وقفہ اور ہمارے درمیان پھیلا ہوا ہے۔

اس ابتدائی زمانہ میں جس کا سائنس ہمیں پتہ دے سکتی ہے اس کے پاس اس بات کی قوی دلیل موجود ہے کہ کائنات کی تشکیل ایک ایسے گیسی مادے سے ہوئی تھی جو ہائیڈ روجن اور ہیلیم کی کچھ مقدار سے مرکب تھا اور آہستہ آہستہ گردش کر رہا تھا۔ یہ سدیم انجام کار متعدد ٹکڑوں میں بٹ گیا جن کی لمبائی چوڑائی اور جن کا مقدار مادہ بہت زیادہ تھا جو فی الحقیقت اتنا زیادہ تھا کہ نجمی طبیعات کے ماہرین اس کے مقدار مادہ کا اندازہ سورج کے موجودہ مادہ کے ایک ارب سے لگا کر ایک کھرب گنے تک لگاتے ہیں۔ (موخر الذکر اس قدر مقدار مادہ کو ظاہر کرتا ہے جو زمین کے مقدار مادہ سے تین لاکھ گنے سے بھی زیادہ ہے) ان اعداد سے ابتدائی گیسی مقدار مادہ کے ان ٹکڑوں کے عظیم جثوں کا کچھ تصور ملتا ہے جن سے کہکشائیں پیدا ہوئیں۔

ایک جدید انشقاق سے ستاروں کی تشکیل ہونے والی تھی۔ درمیان میں انجماد کا عمل حائل ہو گیا جس میں کششی قوتیں روبہ عمل آئیں (اس لیے کہ یہ اجسام زیادہ سے زیادہ سرعت سے حرکت اور گردش کر رہے تھے) ان ہی کے ساتھ دباؤ اور مقناطیسی میدانوں اور اشعاع کا اثر ظہور پذیر ہوا۔

ستارے جیسے جیسے سکڑتے گئے اور ان کی کششی قوتیں، حرارتی توانائی میں تبدیل ہوتی گئیں ان میں چمک پیدا ہوتی گئی۔ مرکزی حرارت کے در عمل روبکار آئے اور انشقاق کے عمل سے ہلکے جوہروں کی جگہ بھاری جوہر بنے۔ اس طرح ہائیڈروجن سے ہیلیم میں، پھر کاربن اور آکسیجن میں تبدیلی ہوئی جو دھاتوں اور فلزات پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوئی۔ اس طرح ستاروں کی اپنی ایک زندگی ہے اور جدید علم ہیئت ان کو ان کے موجودہ ارتقائی درجہ کے مطابق اقسام میں بانٹتے ہیں۔

ستاروں کا ایک مرحلہ ممات بھی ہے۔ اپنے ارتقاء کے آخری دور میں اکثر ستاروں کو شدت کے ساتھ پھٹتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ جس سے وہ سچ مچ کی لاشیں بن جاتے ہیں۔

سیارات اور خصوصیت سے زمین کی ابتداء علیحدگی کے عمل سے ہوئی جو ایک ایسے بنیادی نوعیت کے ٹکڑے سے شروع ہوئے جو ابتدا میں ایک سحابیہ تھا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر پچیس سال سے زیادہ کی مدت سے کوئی تنازعہ اور اختلاف نہیں ہے کہ سورج اسی ایک سحابیہ کے اندر کی جانب منجمد ہوا اور سیاروں نے یہی عمل گردوپیش کی سحابیہ قرص کے اندر دہرایا۔ (۱۲)

زور اس بات پر ہونا چاہیے۔۔۔اور مضمون زیر غور کے لیے یہی چیز بنیادی

اہمیت کی ہے کہ نہ اجرام سماوی مثلاً سورج کی تشکیل میں اور نہ ارضی عناصر کی تشکیل میں کوئی تسلسل ہے، بلکہ اس میں معادی کی مماثلت کے ساتھ ایک ارتقائی متوازیت ہے۔

اس موقع پر سائنس ہمیں اس مدت سے آگاہ کرتی ہے جس کے دوران یہ واقعات جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے ظہور پذیر ہوئے۔ اس نظریے کے مطابق ہماری کہکشاں کی عمر کا اندازہ کم و بیش دس ارب سال لگایا جائے تو نظام شمسی کی تشکیل کچھ اوپر پانچ ارب سال بعد ہوئی۔ قدرتی تابکاری کے عمل سے زمین کی عمر اور اس وقت کا تعین ساڑھے چار ارب سال کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ جب سورج کی تشکیل عمل میں آئی اور بعض سائنسدانوں کے حسابات کے مطابق موجودہ زمانہ میں یہ عدد دس کروڑ سال کی بقدر کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ صحت قابل تحسین ہے، اس لیے کہ دس کروڑ سال کی مدت ہمارے نزدیک کافی طویل ہے لیکن جو نسبت بیٹھتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ غلطی تفقیم زیر غور پوری مدت ۵ء۴/۱ یعنی ۲ء۲ فیصد ہے۔

بنابریں نجمی طبیعات کے ماہرین نے نظام شمسی کی تشکیل سے متعلق عام عمل کے بارے میں بڑی حد تک صحیح معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل طریقہ پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ گردش کرتے ہوئے گیسی مادہ کا انجماد اور اس کا

ہوئے، حاصل ہوئی، وہ عالمین کی تعداد کے تصور کے حق ہونے میں قطعاً کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتی تاہم اس سے کائنات کے اندر کسی ایسی چیز کے وجود کے یقینی ہونے کی شہادت فراہم نہیں ہوتی جو قریب یا غیر واضح طور پر زمین سے مشابہ ہو۔

عالمین کے تعدد کا تصور

مذکورہ بالا بیان کے باوجود، موجودہ دور کے نجمی طبیعات کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس بات کا بے حد امکان ہے کہ کائنات میں زمین کی مانند اور بھی سیارے موجود ہوں۔ جہاں تک نظام شمسی کا تعلق ہے کوئی شخص بھی اس امکان کا سنجیدگی سے قائل نہیں ہے کہ اس نظام میں کسی دوسرے سیارے پر عام حالات وہی ہوں گے جو زمین پر ہیں۔ لہذا ہمیں ایسے حالات نظام شمسی کے باہر کہیں تلاش کرنے پڑیں گے اس نظام کے باہر ان کے وجود کے امکان کو حسب ذیل دلائل کی بناء پر اغلب سمجھا جاتا ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ہمارے کہکشانی جہان میں ہی ایک کھرب کے نصف ستارے ایسے ہونے چاہئیں جن کے سورج کی طرح نظام سیارگان ہوں۔ پچاس ارب ستارے یقیناً ایسے ہیں جو سورج کی مانند نہایت آہستہ آہستہ گردش کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایسے سیاروں سے گرے ہوئے ہیں جو ان کے طفیلی ہیں۔ یہ ستارے اتنے بعید فاصلہ پر ہیں کہ ان کے امکانی سیارے نا قابل مشاہدہ ہیں۔ لیکن بعض حرکتی خاصیتوں کے سبب ان کی موجودگی کے امکان کو نہایت قوی سمجھا گیا ہے۔ ستارہ کے خط حرکت میں خفیف سا ارتعاش ایک ساتھی طفیلی سیارے کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ ستارہ برنارڈ کا غالباً کم از کم ایک رفیق سیارہ ضرور ہے جس کا مقدار مادہ، مشتری کے مقدار مادہ سے بھی زیادہ ہے اور جس کے دو طفیلیوں کے وجود کا بھی امکان ہے

جیسا کہ پی۔ کیرین لکھتا ہے۔

''اس شہادت سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ نظام ہائے سیارگان تمام کائنات میں کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں۔ نظام شمسی اور کرہ ارض ہی اس معاملہ میں منفرد نہیں ہیں۔''

اور ایک منطقی نتیجہ کے طور پر

''ان سیاروں کی طرح جو اس میں گھر کیے ہوئے ہیں پوری کائنات میں حیات بھی پھیلی ہوئی ہے۔ بالخصوص ان جگہوں میں جہاں وہ طبعی کیمیاوی حالات پائے جاتے ہیں جو اس کے نشوونما پانے اور ترقی کرنے کے لیے ضروری ہیں۔''

بین کوکبی مادہ

بنابریں کائنات کی تشکیل کا بنیادی عمل ابتدائی سدیم کا مادہ کے انجماد سے ہوا جس کے بعد اس کی تقسیم ٹکڑوں میں ہوگئی جنھوں نے ابتداء میں کہکشانی مرغولوں کی شکل اختیار کی۔ موخر الذکر اپنی باری سے ٹوٹ کر ستارے بنے جنھوں نے اس عمل کو دہراتے ہوئے ثانوی اجرام یعنی سیاروں کو جنم دیا۔ ان متواتر علیحدگیوں سے مخصوص ارکان کے مجموعوں کے درمیان کچھ ایسا مادہ رہ گیا جس کو غالباً باقیات کا نام دیا جاسکے۔ ان باقیات کا زیادہ سائنسی نام ''بین کوکبی کہکشانی مادہ'' ہے۔ اس کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ کچھ روشن سدیم ایسے ہیں جو دوسرے ستاروں سے حاصل شدہ روشنی کو منعکس کرتے ہیں۔ اور اگر نجمی طبیعات کے ماہرین کی اصطلاح استعمال کی جائے تو یہ سدیم شاید گردوغبار اور دھوئیں (دخان) سے مرکب ہیں۔ اس کے بعد کچھ تاریک سدیم ہیں جن کی دبازت کم ہے اور جن میں وہ بین کوکبی مادہ شامل ہے جو اور بھی زیادہ رقیق ہے اور جن کی خاصیت یہ ہے کہ فلکیات میں نور یا آلہ کی پیمائشوں میں مزاحمت کا موجب ہوتا ہے۔ خود کہکشاؤں کے مابین مادہ کے قناطر کی موجودگی کے بارے میں تو کوئی شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا اگرچہ یہ گیس بہت ہی رقیق ہوسکتی ہے۔ تاہم یہ حقیقت کہ وہ اتنے لمبے چوڑے مکان کو گھیرے ہوئے ہیں اس وسیع فاصلہ کو دیکھتے ہوئے جو کہکشاؤں کے درمیان پھیلا ہوا ہے ایک ایسے مقدار مادہ سے مطابقت رکھتی ہیں جو اول الذکر کی کثافت کم ہونے کے باوجود کہکشاؤں کی مجموعی مقدار مادہ سے غالباً

زیادہ ہے۔اے بوا کوان بین کہکشانی مادوں کی موجودگی کو بنیادہ اہمیت کا حامل سمجھتا ہے جو کائنات کے ارتقاء کے تصورات کو بڑی حد تک تبدیل کر سکتے ہیں۔

اب ہم کو کائنات کی تخلیق کے ان بنیادی تصورات کی جانب مراجعت کرنا چاہیے۔جو قرآن سے لیے گئے تھے اور جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں ان پر غور کرنا چاہیے۔

تخلیق سے متعلق قرآن میں دی ہوئی معلومات کے ساتھ مقابلہ

ہم ان پانچ مخصوص نکات کا جائزہ لیں گے جن پر تخلیق سے متعلق قرآن میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

۱۔ آسمانوں اور زمین کے چھ ادوار، قرآن کے بموجب اجرام ساوی اور زمین کی تشکیل اور موخرالذکر کی ترقی پر محیط ہیں یہاں تک کہ وہ (مع اپنے سامان زیست کے) انسان کا مسکن بنی۔ جہاں تک کہ زمین کا تعلق ہے اس کے جن حوادث کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے وہ چار ادوار میں رونما ہوئے۔ غالباً ان سے وہ چار ارضیاتی (۱۴) ادوار مراد لیے جائیں گے جن کا جدید سائنس میں ذکر ہے اور جن میں سے دور رابع میں جیسا کہ ہمیں معلوم ہے انسان کا ظہور رہوا۔ یہ بالکلیہ ایک مفروضہ ہے کیونکہ اس سوال کا کسی متنفس کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اجرام ساوی اور زمین کی تشکیل جیسا کہ سورۃ ۴۱ کی آیات ۹ تا ۱۲ میں بیان کیا گیا ہے، دو کیفیات کی طالب ہے۔ اگر ہم سورج اور اس کی ذیلی تخلیق زمین کو بطور مثال سامنے رکھیں (کیونکہ صرف یہی وہ شے ہے جس تک ہماری رسائی ہے) تو اس کے بارے میں سائنس ہمیں یہ اطلاع بہم پہنچاتی ہے کہ ان کی تشکیل ابتدائی قسم کے سدیم کے انجماد اور بعد میں ان کی ایک دوسرے سے علیحدگی کے عمل سے ہوئی ہے۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو قرآن نہایت صاف طور پر بتاتا ہے کہ جب وہ ایک ساوی دخان سے شروع کر دے اس عمل کا حوالہ دیتا ہے جس سے مختلف مادوں کی آمیزش (رتق) ہوئی اور نتیجتاً وہ

ایک دوسرے سے جدا ہو گئے (فتق) لہذا قرآن کریم کے بیان کردہ حقائق اور سائنس کے حقائق کے مابین مکمل طور پر مطابقت ہے۔

۲۔ سائنس ایک ستارہ (جیسے سورج) اور اس کے طفیلی (جیسے زمین) کی تشکیل کے دو مدارج کے باہم ملے ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ آپس کا یہ تعلق قرآن کے متن میں یقیناً نہایت نمایاں ہے۔

۳۔ کائنات کے ابتدائی مرحلہ میں دخان کی موجودگی جس کا حوالہ قرآن میں موجود ہے اور جس سے مراد مادہ کے زیادہ تر گیسی حالت ہے صریحاً اس ابتدائی سدیم کے تصور سے مطابقت رکھتا ہے جو جدید سائنس نے پیش کیا ہے۔

۴۔ سموات کا تعدد جس کی تعداد قرآن میں ۷ بیان کی جاتی ہے اور جس کے مفہوم پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ جدید سائنس سے اس کی تصدیق ان مشاہدات کی بناء پر ہوتی ہے، جو نجمی طبیعات کے ماہرین نے کہکشانی جہانوں اور ان کی بڑی کثیر تعداد پر کیے ہیں۔ اس کے برخلاف ایسی زمینوں کی کثرت جس طرح کی ہماری زمین ہے۔ (خواہ یہ مماثلت محض چند ہی نکات میں ہو) یہ ایک ایسا تصور ہے جو قرآن میں ابھرتا ہے لیکن ابھی تک سائنس نے اس کو حقیقت وصداقت بنا کر پیش نہیں کیا ہے۔ تاہم ماہرین اس چیز کو قطعاً ممکن العمل قرار دیتے ہیں۔

۵۔ سموات اور ارض کے بیچ میں ایک درمیانی تخلیق کے وجود کو جس کا ذکر قرآن میں ہوا ہے مادہ کے ان قناطر (پلوں) کی دریافت سے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے، جو باقاعدہ فلکیاتی نظاموں کے ماورا موجود ہے۔

اگر چہ ان تمام سوالات کی جو قرآن کے بیانات میں پیش ہوئے ہیں سائنسی

معلومات سے مکمل طور پر تائید نہیں ہوئی ہے، تاہم کسی حالت میں بھی تخلیق کے متعلق قرآن کی فراہم کردہ معلومات اور کائنات کی تشکیل کے بارے میں جدید واقفیت میں قطعاً کوئی تباین نہیں ہے۔ یہ حقیقت اس قابل ہے کہ اس سے قرآن کی منزل من اللہ ہونے پر خاص طور پر زور دیا جاسکتا ہے۔ جب کہ عہد نامہ قدیم کا رائج الوقت متن ان ہی حوادث کے بارے میں ایسی معلومات بہم پہنچاتا ہے جو سائنسی نقطہ نظر سے ناقابل قبول ہیں۔ یہ بات مشکل سے حیرت خیز ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل کے مرشدانہ متن میں (۱۵) تخلیق کا بیان اسیری بابل کے زمانہ میں ان قسیسین نے تحریر کیا تھا جن کے وہ شرعی مقاصد تھے جن کا ذکر پیشتر کیا جاچکا ہے۔ لہٰذا انہوں نے ایک ایسا بیان ترتیب دیا جو ان کے دینی نظریات سے ہم آہنگ ہوتا تھا۔ بائبل کے بیان اور قرآن کی فراہم کردہ معلومات کے درمیان اتنا زبردست فرق جو تخلیق سے متعلق ہے ایک بار پھر اس لیے قابل غور ہے کہ آغاز اسلام سے ہی حضرت محمد ﷺ پر خواہ مخواہ کا یہ الزام عائد کیا جارہا ہے کہ آپ نے بائبل کے بیانات کی ہو بہو نقل کر ڈالی ہے۔ جہاں تک تخلیق کا تعلق ہے، یہ الزام قطعاً بے بنیاد ہے کہ کوئی شخص چودہ سو سال قبل رہ رہا ہو، کیسے اس وقت کے موجود بیان میں اس حد تک تصحیح کرسکتا تھا کہ وہ سائنسی اعتبار سے غیر صحیح مواد کو خارج کردیتا اور اپنی ذاتی اختراع پر ایسے بیانات پیش کردیتا جن کی سائنس نے بھی دور جدید میں ہی تائید کی ہے۔ یہ مفروضہ کلیتہً ناقابل قبول ہے۔ تخلیق سے تعلق بیان جو قرآن میں دیا گیا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو بائبل میں ہے۔

بعض اعتراضات کے جوابات

یقینی طور پر بعض دوسرے موضوعات سے متعلق بالخصوص مذہبی تاریخ کے بارے میں بائبل اور قرآن میں یکسانیتیں ضرور موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اس نقطہ نظر سے یہ بات خاصی دلچسپ ہے کہ یسوع کے خلاف کوئی شخص بھی اس حقیقت کا اظہار نہیں کرتا کہ وہ بھی بائبل کی تعلیمات سے اسی نوع کے حقائق لیتے ہیں۔ یہ بات دراصل مغرب میں بسنے والے حضرات کو اس امر سے باز نہیں رکھتی کہ وہ حضرت محمد ﷺ کو ان کی اپنی تعلیم میں اس قسم کے واقعات کو پیش کرنے پر الزام دیں وہ بھی اس فتویٰ کے ساتھ کہ وہ ایک فریبی (نعوذ باللہ من ذلک) شخص تھے اس لیے کہ انہوں نے ان باتوں کو وحی و تنزیل کر کے پیش کیا۔ جہاں تک ثبوت کا تعلق ہے کہ محمد ﷺ نے قرآن میں وہ باتیں دہرا دیں جو آپ ﷺ کو راہبوں نے بتائی تھیں یا املا کی تھیں تو اس کے لیے اس بیان کے علاوہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک عیسائی راہب نے آپ ﷺ کو اعلیٰ قسم کی مذہبی تعلیم دی تھی۔ بہتر ہوگا کہ کوئی شخص دوبارہ اس بیان کو پڑھے جو آر بلیشر اپنی کتاب ''محمد کا مسئلہ'' (یعنی پرو بیلم دماحومت) (۱۶) میں اس افسانہ کے بارے میں بتانے کے لیے دیا ہے۔

یکسانیت کا ایک اور نکتہ بھی قرآن میں دیگر بیانات اور عقائد کے دوران پیش کیا جاتا ہے جو نہایت ہی دور لے جاتا ہے غالباً وقت کے اعتبار سے بائبل سے بھی کہیں بعید زمانہ میں۔

کچھ زیادہ عمومیت سے گفتگو کی جائے تو پتہ چلے گا کہ آفرینش سے متعلق بعض

اساطیر صحف مقدسہ میں تلاش کر لیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ عقیدہ جو پالنیشیا کے باشندے دور اولین کے ان سمندروں کے وجود کے بارے میں رکھتے ہیں، جو تاریکی میں لپٹے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ روشنی ہوئی تو وہ الگ الگ ہوئے اور اس طرح آسمان اور زمین بنے۔ یہ اسطورہ تخلیق سے متعلق اس بیان کے مانند ہے جو بائبل میں دیا گیا ہے۔ جس میں بلاشبہ ایک نوع کی مماثلت ہے۔ لیکن یہ ایک سطحی سی بات ہوگی اگر بائبل کو یہ الزام دیا جائے کہ اس نے آفرینش کے بارے میں اس اسطورہ کو نقل کر دیا ہے۔

یہ کہنا بھی اس طرح کی ایک سطحی بات ہے کہ دور اولین کا وہ مادہ جس سے ابتدائی مرحلہ میں کائنات کا ہیولی تیار ہوا۔۔۔۔۔ ایک ایسا تصور جو جدید سائنس نے قائم کیا ہے۔۔۔۔۔ اس کی تقسیم کے بارے میں قرآن کا تصور وہی ہے جو آفرینش سے متعلق کسی نہ کسی شکل میں مختلف اساطیر میں موجود تھا اور قرآن نے اس کو وہیں سے اخذ کیا ہے۔

ان اساطیری عقائد اور بیانات کا زیادہ وضاحت سے تجزیہ کرنا مناسب ہے۔ ان میں بھی ایک ابتدائی تصور ایسا دکھائی دیتا ہے جو بذات خود معقول ہے اور بعض حالتوں میں اس معلومات سے جس کو آج ہم صحیح سمجھتے ہیں (یا ہمارا خیال ہے کہ ہم اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ سوائے ان تصورات و توہمات کے جو اسطورہ میں اس سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں اس کی تائید بھی ہو جاتی ہے۔ یہی حالت اس تصور کی ہے کہ آسمان اور زمین پہلے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے بعد میں الگ الگ ہو گئے۔ یہ ایک عام تصور رہا ہے جیسا کہ جاپان میں ہے لیکن وہاں جب بیضے کی شبیہ

جمع ہیولی قبل تکوین کی ایک داستان بیضے کے اندرونی جانب کے ایک تخم (جیسا کہ تمام بیضوں میں ہوتا ہے) سے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے وابستہ کردی جاتی ہے تو یہ تخیلی اضافہ اس تصور کو سنجیدگی کے عنصر سے عاری کر دیتا ہے۔ دوسرے ممالک میں ایک پودے کا تصور اس سے وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ اس تصور کے بموجب پودا بڑھتا ہے تو اس عمل کے دوران آسمان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے اور اس طرح سمٰوٰت کو ارض سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ یہاں پھر مستزاد تفصیل کی تصوری نوعیت اس اسطورہ کی ایک امتیازی خصوصیت بن جاتی ہے اس کے باوجود مشترک خصوصیت باقی رہتی ہے۔ یعنی ارتقائی عمل کے شروع میں مادہ کے ایک ڈھیر کا تصور جس سے کائنات کی تشکیل ہوئی۔ جو تقسیم ہو کر مختلف دنیائیں بنیں جو آج ہمارے علم میں ہیں۔

جس دلیل کی وجہ سے ان آفرینشی اساطیر کو اس جگہ بیان کیا گیا ہے اس سے وہ طریقہ بتانا مقصود ہے جس کے ذریعہ انسانی تخیل نے ان اساطیر کے گرد حاشیہ آرائی کی۔ نیز وہ بنیادی فرق بتاتا ہے جو اسی موضوع پر ان کے اور قرآن میں دیئے گئے بیانات کے درمیان ہے موخر الذکر تمام تر ان فرضی تفصیلات سے آزاد ہے جو ان عقائد کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہیں اس کے برخلاف قرآن کے بیانات اپنے ان الفاظ کی سنجیدگی و متانت کے لحاظ سے ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں جن کے ذریعے وہ بیانات پیش کیے گئے ہیں اور ان کو اس لحاظ سے بھی ایک گونہ امتیاز حاصل ہے کہ سائنسی معلومات سے بھی ان کی مطابقت ہوتی ہے۔

تخلیق سے متعلق قرآن کے اس نوع کے بیانات جو تقریباً چودہ صدی پیشتر

ظہور میں آئے تھے، صاف طور پر کسی انسانی توضیح وتشریح پر محمول نہیں کیے جا سکتے۔

حواشی

۱۔ بائبل کے جس بیان کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ نام نہاد مرشدانہ متن سے ماخوذ ہے جس پر اس کتاب کے جزو اول میں بحث کی گئی ہے۔ نام نہاد یہودی متن میں جو بیان دیا گیا ہے وہ آج کل کے بائبل کے متن میں صرف چند سطور میں سمیٹ دیا گیا ہے اور اس لیے اس پر یہاں گفتگو کرنا بے کار اور غیر وقیع ہے۔

۲۔ ''سبت'' کا عبرانی میں مفہوم ہے ''آرام کرنا''

۳۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ زمین بنانے کے بعد اور اس میں آبادی کا انتظام کرنے کے بعد اس نے آسمان بنائے یہاں پھر کا لفظ زمانی ترتیب کے لیے نہیں استعمال ہوا ہے۔ بعد کے فقرے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی)

۴۔ کائنات کے وجود میں آنے کا جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ ابتدا میں صرف توانائی تھی۔ اسی نے بعد میں مادہ کی شکل اختیار کر لی۔ یہ مادہ ابتدا میں گیس یا دخان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بعدہ اس میں سے بادلوں کی طرح کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر سدیم وجود میں آئے جن سے کہکشائیں بنیں۔ اس عمل کے لیے بھی دو طریقے بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک کائناتی جوہر کا اور دوسرا حالت قائمہ کا۔ پہلے نظریہ کے مطابق شروع میں ایک بہت بڑا جوہر تھا جس میں الیکٹرون اور

پروٹون منتشر حالت میں ٹھنسے ہوئے تھے۔ پھر ایک دھماکہ کے ساتھ جوہر پھٹا اور مادہ پھیل گیا۔ الیکٹرون اور پروٹون کی ترتیب قائم ہوئی جس سے گیسی مادہ تیار ہوا۔ دوسرے نظریہ کے بموجب توانائی نے رفتہ رفتہ مادہ کی شکل اختیار کی اور سدیم وجود میں آئے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور کائنات میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ (مترجم)

۵۔ سدیمی مادہ عمل انجماد سے ستاروں کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر ان ستاروں میں افتراق کا عمل ہر کر سیارے بنے جن میں سے ایک سیارہ زمین ہے جو نظام شمسی سے مربوط ہے۔ (مترجم)

۶۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ جہاں بائبل میں سورج اور چند دونوں کو روشنیاں کہا گیا ہے۔ یہاں جیسا کہ قرآن میں ہمیشہ ہی ہوا ہے۔ ان کو مختلف نام دیئے گئے ہیں۔ پہلے کو روشنی (نور) کہا گیا ہے اور دوسرے کو اس آیت میں ایک ایسے چراغ (سراج) سے مشابہ قرار دیا گیا ہے جس سے روشنی پیدا ہو رہی ہے۔ ہم بعد میں دیکھیں گے کہ کس طرح اور دوسری صفتیں بھی سورج کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

۷۔ قرآن سے ہٹ کر بھی ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے زمانے سے کتابوں میں سات کا عدد کثرت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یا حضور اکرم ﷺ کے بعد ابتدائی صدیوں سے ہی ان متون میں یہ کام میں لایا گیا ہے جن میں آپ کے قول بیان ہوئے ہیں۔ (یعنی احادیث)

۸۔ یہ بیان کے تخلیق کے کام سے خداوند قدوس کو کوئی تکان لاحق نہیں ہوئی، صریحی طور پر بائبل کے اس بیان کے جواب میں ہے جس کا حوالہ موجودہ کتاب کے پہلے حصہ میں دیا گیا ہے جہاں یہ بات بتائی گئی ہے کہ گذشتہ چھ دنوں کی محنت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ساتویں دن آرام کیا۔

۹۔ ان کو ماورائے کہکشانی جہان یا ماورائے کہکشانی سدیم کہا جاتا ہے۔ بعض ان میں سے ستاروں کے ایسے ہی مجموعے بن گئے ہیں جیسا ہمارا کہکشانی جہان ہے اور بعض ہنوز گرد و غبار اور گیس کے مرغولے ہیں۔ جو بڑی تیزی سے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں اور کائنات میں وسعت پیدا کر رہے ہیں۔ ابھی تک جن سدیموں کو دوربینوں کی مدد سے دیکھ لیا گیا ہے ان کی تعداد ہی دس کروڑ ہے۔ ان کے علاوہ اور کتنے ہیں ان کے بارے میں سوائے خدا کے اور کسی کو علم نہیں۔ جو سدیم یا کہکشانی جہان ہم سے قریب ترین ہے اس کا فاصلہ ہی اتنا ہے کہ وہاں سے روشنی کو ہم تک پہنچنے میں تقریباً نو لاکھ سال لگ جاتے ہیں۔ یہ سدیم مراۃ السلسلہ (اینڈرومیڈا) نامی مجمع النجوم میں واقع ہے اور خالی آنکھ سے دکھائی دے جاتا ہے۔ (مترجم)

۱۰۔ ماؤنٹ ولسن کی دوربین کے شیشہ کا قطر ۱۰۰ انچ اور ماؤنٹ پالومر کا ۲۰۰ انچ ہے۔ دونوں کیلیفورنیا میں ہیں۔ (مترجم)

۱۱۔ روشنائی سال یا نوری سال اس فاصلہ کو کہا جاتا ہے جو روشنی

۱۸۶۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک سال میں طے کرتی ہے۔ زمین پر استعمال ہونے والے پیمانوں کے مطابق یہ فاصلہ اٹھاون کھرب، ستر ارب میل کے برابر ہوتا ہے۔ پارسک اس فاصلہ کو کہا جاتا ہے جہاں زمین سے سورج کا فاصلہ (یعنی ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل) ایک سیکنڈ کا زاویہ بناتا ہے، پارسک ۳ء۲۶ نوری سال یا ایک نیل ۹۲ کھرب میل کے لگ بھگ ہوتا ہے (مترجم)

۱۲۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ ایک نظریہ ہے جس کو حقیقت نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس سے پہلے بھی کئی نظریے قائم ہوئے اور مسترد کیے گئے مثلاً کافی عرصہ تک لیپلیس کا نظریہ مقبول رہا پھر مدی نظریہ کو حقیقت سمجھا جاتا رہا۔ اس کے بعد اس میں ردوبدل ہوتی رہی اور اب اس نظریہ پر اکثر سائنسدانوں کا اتفاق ہے لیکن معلوم نہیں کب اس کا بھی قلع قمع ہو جائے۔ حقیقت کا حال سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ تمام عمارت قیاسات پر قائم ہے۔ (مترجم)

۱۳۔ جہاں تک چاند کا تعلق ہے، زمین کی اپنی گردش محوری کے نتیجہ میں بالآخر اس کا جدا ہو کر وجود میں آنا ایک تسلیم شدہ امکان ہے۔

۱۴۔ ان چار ادوار کی تقسیم ماہر ارضیات اس طرح کرتے ہیں (۱) ابتدائی دور آ کیوزوئیک جس کا زمانہ ۶۰۰ ملین سال (۶۰ کروڑ سال) سے قبل (۲) قدیم دور (پلیوزوئیک) جس کا زمانہ ۲۲۵ تا ۶۰۰ ملین سال (۲۲ کروڑ پچاس لاکھ تا ۶۰ کروڑ سال) کا (۳) وسطی دور (میسو

زوئیک) جس کا زمانہ ۷۰ تا ۲۲۵ ملین (۷ کروڑ تا ۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ سال) کا اور (۴) جدید دور (کینوزوئیک) جس کا زمانہ ۷۰ ملین (۷ کروڑ سال) سے بعد کا بتایا گیا ہے۔

ان بڑے بڑے ادوار پھر چھوٹے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے ان ہی چھوٹے ادوار میں دور رابع ہے جو جدید دور کا آخری حصہ ہے ۔(مترجم)

۱۵۔ یہ متن کلی طور پر ان چند سطور کو پس منظر میں ڈال دیتا ہے جو یہودی اشاعت میں شامل ہیں موخر الذکر اس قدر مختصر اور اتنا مبہم ہے کہ سائنسدان اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔

۱۶۔ شائع کردہ پریسیز یونیورسٹی ٹیریز دے فرانس ۔ پیرس ۱۹۵۲ء

باب چہارم

قرآن میں علم ہیئت

قرآن سمٰوات کے بارے میں اقوال و آراء سے بھرا ہوا ہے۔تخلیق سے متعلق پچھلے بات میں ہم نے دیکھا تھا کہ کس طرح آسمانوں اور زمینوں کا ذکر کیا ہے۔نیز اس شے کا ذکر ہے جس کو قرآن ایک درمیانی تخلیق ''بین السماء والارض'' قرار دیتا ہے۔جدید سائنس نے موخرالذکر کی تائید کی ہے۔تخلیق سے متعلق جو آیات ہیں ان میں ایک وسیع تصوران اشیاء کا بھی ہے جو آسمانوں میں ملتی ہیں یعنی ہر وہ شے جو زمین سے ماورا ہے۔

ان آیات سے ہٹ کر جن میں خصوصیت سے تخلیق کا ذکر ہے۔قرآن میں ایک موٹے سے اندازے کے مطابق تقریباً چالیس اور آیتیں ایسی ہیں جو علم ہیئت پر وہ معلومات بہم پہنچاتی ہیں جو اس معلومات کا جو پہلے ہی دی جا چکی ہے، تکملہ کرتی ہیں۔ان میں سے کچھ کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ان سے خالق کی شان وعظمت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔وہ خالق جو ناظم ہے تمام ستاروں اور سیاروں کے نظاموں کا۔ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ اجرام ایسی توازن کی حالت میں ہیں جس کے استحکام کی وضاحت نیوٹن نے اجرام کی کشش باہمی کے اصول سے کی تھی۔

پہلی آیات جو یہاں پیش کی جاتی ہیں سائنسی تجزیہ کے لیے مشکل سے کچھ

زیادہ مواد فراہم کرتی ہیں۔ ان کا تو مقصد ہی خداوند کریم کی قدرت کاملہ کی جانب توجہ مبذول کرانا ہے۔ تاہم ان کا ذکر یہاں اس غرض سے کرنا پڑے گا کہ اس سے اس طریقہ کا حقیقت پسندانہ تصور دلایا جائے جس طریقہ سے قرآنی متن میں اب سے چودہ صدی قبل نظام کائنات کو بیان کیا گیا ہے۔

یہ حوالے وحی الٰہی کی ایک نئی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ نظام دنیا کا ذکر نہ تو اناجیل میں کیا گیا اور نہ عہد نامہ قدیم میں (سوائے چند تصورات کے جن کی عمومی عدم صحت کو ہم تخلیق کے بارے میں بائبل کے بیان میں پہلے ہی دیکھ چکے ہیں) لیکن قرآن اس موضوع کو گہرائی میں اتر کر بیان کرتا ہے۔ جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے وہ اہم ہے لیکن جو کچھ اس میں نہیں ہے اس کی حیثیت بھی یہی ہے دراصل یہ ان نظریات کا کوئی بیان پیش نہیں کرتا جو نزول کے وقت رائج تھے اور جو آسمانی دنیا کے نظام سے بحث کرتے ہیں۔ یہ وہ نظریات ہیں جن کو آگے چل کر سائنس نے غیر صحیح قرار دیا ہے اس کی ایک مثال بعد میں دی جائے گی۔ تاہم اس منفی تصور کی نشاندہی کرنی پڑے گی۔ (۱)

(الف) آسمان سے متعلق عام تصورات

سورۃ ۵۰، آیت ۶: عام طور پر اس کا موضوع انسان ہے۔

افلم ینظروا الی السمآء فوقهم کیف بنینها و زینها وما لها من فروج.

”کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔“

سورۃ ۳۱، آیت ۹۔

خلق السموت بغیر عمد ترونها.....

”اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں...“

سورۃ ۱۳، آیت ۲:

الله الذی رفع السموت بغیر عمد ترونها ثم استوی علی العرش و سخر الشمس و القمر......

”وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں (۲) پھر وہ اپنے تخت پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند کیا...“

یہ دو آیات اس عقیدہ کی تردید کرتی ہیں کہ گنبد سماوی، ستونوں پر ٹھہرا ہوا ہے کہ وہی ایسے چیزیں ہیں جو اول الذکر کو اس بات سے روکے ہوئے ہیں کہ وہ زمین کو کچل کر رکھ دے۔

سورۃ ۵۵، آیت ۷:

والسمآء رفعھا

''اور آسمان کو (خدا نے) بلند کیا۔''

سورۃ ۲۲، آیت ۶۵:

و یمسک السمآء ان تقع علی الارض الا باذنہ

''اور وہی (اللہ تعالیٰ) آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر گر نہیں سکتا۔''

یہ بات معلوم ہے کہ نہایت عظیم فاصلوں پر فضائی مادوں کی دوری اور خود ان کے مادہ کی مناسبت سے ان کی عظمت ان کے توازن کو قائم رکھنے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مادے جتنے زیادہ بعید ہوں گے اتنی ہی کمزور وہ قوت ہوگی جو ان کو ایک دوسرے کی جانب کھینچتی ہے۔ وہ جتنے قریب ہوں گے اتنی ہی شدید وہ قوت کشش ہوگی جو ایک کی دوسرے کے ساتھ رہتی ہے۔ یہی بات چاند پر صادق آتی ہے جو کرۂ ارض کے متصل ہے (فلکیات کی زبان میں) اور کشش کے اصولوں کے تحت اس حصہ پر اثر انداز ہوتا ہے جس کو سمندر کا پانی گھیرے ہوئے ہے۔ اسی سے مدوجزر کا حادثہ رونما ہوتا ہے اور دو فضائی مادے ایک دوسرے کے بہت قریب آ جائیں تو ان کے مابین تصادم ناگزیر ہوگا۔ یہ حقیقت کہ وہ ایک نظام کے تحت قائم ہیں کسی گڑبڑ کی عدم موجودگی کے لیے ایک ناگزیر حالت ہے آسمانوں کا حکم ربی کا تابع ہونا ایک ایسی چیز ہے جس کا اکثر حوالہ دیا گیا ہے۔

سورۃ ۲۳، آیت ۸۶۔ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرماتا

ہے:

قل من رب السموت السبع و رب العرش العظیم.

''ان سے کہو، ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟''

ہم پہلے ہی اس بات کا جائزہ لے چکے ہیں کہ ''سبع سموات'' (سات آسمان) کا مفہوم سات کا عدد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد لاتعداد آسمان ہیں۔

سورۃ ۴۵، آیت ۱۳:

''و سخر لکم ما فی السموت وما فی الارض جمیعا منھہ ان فی ذلک لایت لقوم یتفکرون.

''اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے سب کچھ اپنے پاس سے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔''

سورۃ ۵۵، آیت ۵:

الشمس و القمر بحسبان.

''سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں۔''

سورۃ ۶، آیت ۹۷:

و جعل الیل سکنا والشمس و القمر حسبانا.

''اور اسی (خدا) نے رات کو سکون کا وقت بنایا اور چاند اور سورج کے طلوع اور غروب کا حساب مقرر کیا۔''

سورۃ ۱۴، آیت ۳۳:

و سخر لکم الشمس و القمر دآئبین و سخر لکم الیل و النهار.

''جس نے سورج اور چاند کوتمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کوتمہارے لیے مسخر کیا ہے۔''

یہاں ایک آیت دوسری کا تکملہ کرتی ہے۔ جس حساب کا جو اس راستہ کی باقاعدگی پر منتج ہوتی ہے، حوالہ دیا گیا ہے جو زیر نظر اجرام سماوی اختیار کرتے ہیں اس کو لفظ ''دائب'' سے ظاہر کیا گیا ہے جو ایک ایسے فعل کی استمراری شکل ہے جس کا ابتدائی مفہوم ہے ''کسی کام کو لگن اور تندہی سے انجام دینا'' یہاں اس کا اطلاق ان معنوں میں ہو رہا ہے۔ ''خود کو کسی کام میں ایک مقررہ عادت کے مطابق مستقل مزاجی سے اور غیر متغیر طریقہ پر لگا دینا۔''

سورۃ ۳۶، آیت ۳۹ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والقمر قدرنه منازل حتی عاد کالعرجون القدیم.

''اور چاند، اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گذرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے۔''

یہ حوالہ ہے کھجور کی شاخ میں شکل خمیدہ کا جو سوکھ جانے کے بعد ہلال قمر کی شکل اختیار کر لیتی ہے اس کی تشریح بعد میں مکمل کی جائے گی۔

سورۃ ۱۶، آیت ۱۲:

و سخر لکم الیل و النهار و الشمس و القمر و النجوم مسخرات م بامره ان فی ذلک لایت لقوم یعقلون.

''اس نے تمہاری بھلائی کے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کرر کھا ہے اور سب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

وہ عملی زاویہ نظر جس سے اس مکمل نظام سماوی کا جائزہ لیا گیا ہے اس کی وہ افادیت ہے جو انسان کے بری و بحری سفر میں بطور امداد اس کو حاصل ہوتی ہے اور اس سے وہ اپنے وقت کا حساب لگا لیتا ہے۔ یہ تشریح اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جو ذہن میں اس حقیقت کو رکھا جائے کہ قرآن شروع میں ان لوگوں کے لیے ایک پند و نصیحت تھی جو محض اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والی زبان ہی کو سمجھتے تھے۔ اس سے مندرجہ ذیل خیالات کی بھی توضیح وتشریح ہو جاتی ہے۔

سورۃ ۶، آیت ۹۸:

و ھو الذی جعل لکم النجوم لتھتدوا بھا فی ظلمت البر و البحر قد فصلنا الایت لقوم یعلمون.

''اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔''

سورۃ ۱۶، آیت ۱۶:

و علمت وبالنجم ھم یھتدون.

''اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں اور تاروں سے

بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں۔"

سورۃ ۱۹، آیت ۵:

هو الذی جعل الشمس ضیآء والقمر نورا و قدره منازل لتعلموا عدد السنین و الحساب ط ما خلق الله ذلک الا بالحق ج یفصل الایت لقوم یعلمون.

"وہی ہے جس نے سورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں، تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ برحق ہی پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔"

قرآن مجید کے اس بیان کی کچھ تشریح درکار ہے، جہاں بائبل سورج اور چاند کو روشنیوں کے نام سے موسوم کرتی ہے اور ایک کے ساتھ "محض عظیم تر" اور دوسرے کے ساتھ "کمتر" کی صفات کا اضافہ کرتی ہے۔ قرآن مجید ایک دوسرے کے ساتھ لمبائی چوڑائی کے علاوہ دوسرے اختلاف کا ذکر کرتا ہے۔ مان لیا کہ یہ ایک لفظی اختلاف کے سوا اور کچھ نہیں ہے تاہم یہ امر ممکن کیسے ہوا کہ اس وقت کوئی شخص انسانوں کو مغالطہ میں مبتلا کیے بغیر یہ بات بتا سکا۔ اور اسی وقت ان کو یہ تصور بھی دے دیا کہ سورج اور چاند کلیتہً یکساں روشنیاں نہیں ہیں۔

اجرام سماوی کی نوعیت

سورج اور چاند:

سورج ایک جلال فروزاں (ضیاء) ہے اور چاند ایک روشنی (نور) ہے۔ یہ ترجمہ دیگر حضرات کے بتائے ترجموں سے زیادہ صحیح معلوم ہوگا، دوسروں نے دونوں اصطلاحوں کو الٹ دیا ہے۔ حقیقت میں معنوں کے اعتبار سے دونوں میں تھوڑا سا ہی فرق ہے، اس لیے کہ ضیاء کی اصل ضوء ہے جس کے مفہوم کازیمی رسکی کی مستند عربی ہفرانسیسی لغت کے بموجب ''روشن ہونا یا چمکنا'' ہے (مثال کے طور پر آگ کی طرح) وہی مصنف زیر بحث شے کو روشنی کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔

سورج اور چاند کے درمیان جو فرق ہے وہ قرآن کے مزید حوالوں سے زیادہ واضح ہو جائے گا۔

سورۃ ۲۵، آیت ۶۱:

تبرک الذی جعل فی السمآء بروجا و جعل فیھا سراجا و قمرا منیرا.

''بڑی متبرک ہے ذات اس کی جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

سورۃ ۷۱، آیت ۱۵، ۱۶:

الم تروا کیف خلق اللہ سبع سموت طباقا. وجعل القمر فیھن نورا و جعل الشمس سراجا.

”کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بر تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا۔“

سورۃ ۷۸، آیت ۱۲، ۱۳:

و بنینا فوقکم سبعا شدادا. و فعلنا سراجا و ھاجا.

”اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا۔“

روشن اور گرم چراغ سے مراد واضح طور پر سورج ہے۔

یہاں چاند کو ایک ایسا جرم قرار دیا گیا ہے جس سے روشنی منعکس ہوتی ہے (منیر) جس کا مادہ وہی ہے جو نور کا (وہ روشنی جس کا اطلاق چاند پر ہوتا ہے) لیکن سورج کو ایک مشعل (سراج) سے یا ایک گرم چراغ (وہاج) سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

حضرت محمد ﷺ کے زمانہ کا کوئی شخص بھی سورج کے، جو صحرا کے باشندوں کے لیے ایک بخوبی جانا پہچانا دہکتا ہوا جرم سماوی ہے اور چاند کے، جو رات کی خنکی کا ایک جرم ہے، درمیان آسانی سے امتیاز کر سکتا تھا، لہذا قرآن میں اس موضوع پر جو موازنہ دیا گیا ہے وہ قطعاً ایک عام سی بات ہے۔ جو بات یہاں قابل غور ہے وہ ہے موازنہ کا ایک سنجیدہ انداز جو ممکن ہے اس زمانہ میں رہا اور جو ہمارے زمانہ میں

فریب نظر کی نمائش معلوم ہو۔

یہ بات معلوم ہے کہ سورج ایک ستارہ ہے جو اپنے اندرونی دھماکوں سے شدید گرمی اور روشنی پیدا کرتا رہتا ہے اور یہ کہ چاند جو بذات خود روشنی نہیں دیتا ایک جامد و مجہول جرم ہے۔ (کم از کم اپنے بیرونی پرتوں کے اعتبار سے) محض اس روشنی کو منعکس کرتا ہے جو اس کو سورج سے حاصل ہوتی ہے۔

قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو اس معلومات کی تردید کرتی ہو جو ہمیں آج ان اجرام سماوی کے بارے میں حاصل ہے۔

ستارے :۔

جیسا کہ ہمیں علم ہے، ستارے سورج کی طرح کے اجرام سماوی ہیں۔ وہ مختلف قدرتی حوادث کے مناظر ہیں جن میں سے آسان ترین جو مشاہدہ میں آتا ہے وہ ان کی روشنی کی تخلیق کا منظر ہے۔ وہ ایسے اجرام سماوی ہیں جو اپنی روشنی خود تخلیق کرتے ہیں۔

لفظ ''ستارہ'' (نجم جس کی جمع نجوم ہے) قرآن مجید میں تیرہ مرتبہ استعمال ہوا ہے اس کا مادہ ایک ایسا لفظ ہے جس کا مفہوم ہے ظاہر ہونا یا دکھائی دینا، یہ لفظ اس کی نوعیت کی وضاحت کیے بغیر یعنی یہ بتائے بغیر کہ یہ روشنی کا تخلیق کرنے والا یا حاصل شدہ روشنی کا منعکس کرنے والا ہے اس کو ایک قابل مشاہدہ جرم سماوی قرار دیتا ہے، اس بات کی وضاحت کے لیے کہ وہ معروض جس کو اس نام سے موسوم کیا

گیا ہے ایک ستارہ ہے یہ ایک توضیحی محاورہ ہے جو حسب ذیل سورت میں ایزاد کیا گیا ہے۔

سورۃ ۸۶، آیات ۱تا۳:

والسمآء والطارق. ومآ ادرک ما الطارق. النجم الثاقب.

''قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟ چمکتا ہوا تارہ۔''

قرآن میں، شام کے ستارہ کو لفظ ''ثاقب'' کے صفتی نام سے موسوم کیا گیا ہے اس کا مفہوم ہے وہ شے جو کسی چیز کو چیرتی ہوئی جائے (یہاں وہ ظلمت شب ہے) اس کے علاوہ یہی لفظ ٹوٹنے والے ستاروں کو موسوم کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے (سورۃ ۳۷، آیت ۱۰) (۴) موخر الذکر (ٹوٹنے والے ستارے) دھماکے کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔

سیارے:

یہ بتانا مشکل ہے کہ آیا قرآن میں ان کا حوالہ بالکل اسی مفہوم کے ساتھ دیا گیا ہے جو موجودہ زمانہ میں ان اجرام سماوی کے متعلق سمجھا جاتا ہے۔

سیاروں کی اپنی روشنی نہیں ہوتی، وہ سورج کے گرد گردش کرتے ہیں، زمین بھی ان میں سے ایک ہے۔ اگرچہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دیگر سیارے کہیں اور بھی ہوں گے لیکن جن کا علم ہے وہ نظام شمسی ہی میں ہیں۔

زمین کے علاوہ پانچ سیاروں سے قدماء بھی واقف تھے۔ یہ پانچ عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل ہیں۔ تین جدید زمانہ میں دریافت ہوئے ہیں۔ یورینس، نیپچون اور پلوٹو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے ان کو لفظ کوکب سے منسوب کیا ہے۔ (جس کی جمع کواکب ہے) لیکن ان کی تعداد نہیں بتائی۔ حضرت یوسفؑ کے خواب (سورۃ ۱۲) میں گیارہ (۵) کا حوالہ ہے لیکن باعتبار تعین یہ بیان تخیلی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں لفظ کوکب کے معنوں کی اچھی توضیح ایک بہت مشہور آیت میں کی گئی ہے۔ اس کے گہرے مفہوم کی امتیازی دینی نوعیت اپنی جگہ پر ہے۔ علاوہ ازیں یہ ماہر مفسرین کے مابین کافی بحث و تمحیص کا موضوع ہے۔

زیر بحث عبارت یہ ہے (سورۃ ۲۴، آیت ۳۵)۔

اللہ نور السموت والارض ط مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح ط المصباح فی زجاجۃ ط الزجاجہ کانھا کوکب دری.

”اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو۔ فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارہ۔“

یہاں موضوع کسی ایسے جسم پر روشنی کا ایک ظل ہے جو اسے منعکس کرتا ہے

(زجاج) اور اس کو ایک موتی کی چمک عطا کرتا ہے مثل ایک سیارے کے جو سورج کی وجہ سے منور ہے۔ یہی وہ تشریحی تفصیل ہے جو اس لفظ کے ذکر کے ساتھ قرآن میں پائی جاتی ہے۔

یہ لفظ دوسری آیتوں میں بھی مذکور ہے، ان میں سے بعض ایسے ہیں جن میں یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ ان سے مراد کون سے اجرام سماوی ہیں (سورۃ ۶، آیت ۷۷(۵)۔ سورۃ ۸۲، آیات ۱تا۲(۷))

تاہم جب جدید سائنس کی روشنی میں دیکھا جائے تو ایک آیت میں یہ بات بہت زیادہ دکھائی دے گی کہ یہ وہی اجرام سماوی ہیں جن کو آج ہم سیاروں کے نام سے جانتے ہیں۔ سورۃ ۳۷، آیت ۶ میں ہمیں حسب ذیل مضمون دکھائی دیتا ہے۔

انازينا السمآء الدنيا بزينة ن الكواكب.

”تحقیق ہم نے آسمان دنیا کو کواکب سے زینت دی ہے (سجایا ہے)“۔

کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن کی عبارت میں آسمان دنیا سے مراد ”نظام شمسی“ لی جائے؟ (۸) یہ بات معلوم ہے کہ ہم سے قریب ترین سماوی معروضات میں سوائے سیاروں کے کوئی دوسرے مستقل معروضات نہیں ہیں۔ اس نظام میں سورج ہی وہ واحد ستارہ ہے جس کا اپنا نام دیا جاتا ہے۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اگر اس سے سیارے نہیں تو کون سے اجرام مراد ہیں، لہٰذا جو ترجمہ دیا گیا ہے وہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور قرآن مجید ان ہی سیاروں کے وجود کا ذکر کرتا ہے جن کا دور جدید میں تعین کیا جاتا ہے۔

آسمان دنیا:

قرآن کریم آسمان دنیا کا ان اجرام سماوی کے ساتھ کئی بار حوالہ دیتا ہے جن پر یہ مشتمل ہے۔ ان میں اولین سیارے معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں لیکن جب قرآن خالص روحانی باتوں کے ساتھ وہ مادی تصورات وابستہ کرتا ہے جو آج جدید سائنس سے روشنی پا کر ہمارے لیے قابل فہم ہو گئے ہیں تو ان کا مفہوم مبہم سا ہو جاتا ہے۔

اس طرح جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ سوائے بعد کی آیت نمبر ۷ جو اسی سورۃ ۳۷ میں ہے اور جس میں شیطان سرکش کے خلاف ایک حفاظت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی حفاظت کا پھر سورۃ ۲۱، آیت ۳۲ میں (۹) اور سورۃ ۴۱، آیت ۱۲ میں (۱۰) حوالہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم بالکل ہی مختلف قسم کے بیانات سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں "رجوم شیاطین" کا جو سورۃ ۶۷ ف، آیت ۵ کے (۱۱) بموجب آسمان دنیا میں ہیں کیا مطلب لیا جائے گا؟ کیا ان روشن اجرام کا جن کا حوالہ اسی آیت میں دیا گیا ہے محولہ بالا ٹوٹنے والے ستاروں سے تو کچھ تعلق نہیں ہے؟

یہ تمام باتیں اس جائزہ کی حدود سے ماوراء ہیں۔ اس کا ذکر یہاں تکمیل کی غرض سے کر دیا گیا ہے۔ تاہم موجودہ مرحلہ میں یہ معلوم ہوگا کہ سائنسی معلومات کسی ایسے موضوع پر جو فہم انسانی سے ماوراء ہے کوئی روشنی نہیں ڈالتی ہیں۔

(ج) نظام سماوی:

اس موضوع سے متعلق قرآن جو معلومات فراہم کرتا ہے ان کا تعلق بنیادی طور پر نظام شمسی سے ہے۔ تاہم بذات خود نظام شمسی سے ماوراء جو حادثات رونما ہوتے ہیں ان کے حوالے بھی اس میں موجود ہیں۔ ان کا انکشاف دورِ جدید میں ہوا ہے۔

سورج اور چاند کے مداروں سے متعلق دو نہایت اہم آیات موجود ہیں۔

سورۃ ۲۱، آیت ۳۳:

و ھو الذی خلق الیل والنھار والشمس والقمر ط کل فی فلک یسبحون.

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا، یہ سب اپنے اپنے مداروں میں چل رہے ہیں۔''

سورۃ ۳۶، آیت ۴۰:

لا الشمس ینبغی لھآ ان تدرک القمر ولا الیل سابق النھار ط و کل فی فلک یسبحون.

''نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار پر تیر رہا ہے۔''

اس جگہ ایک اہم حقیقت کا واضح طور پر اظہار کیا گیا ہے۔ وہ ہے سورج اور

چاند کے مداروں کا وجود، اس پر مستزاد وہ حوالہ ہے جو ان اجرام کے اپنی حرکت سے خلاء میں سفر کرنے کے سلسلہ میں دیا گیا ہے۔ (۱۲)

ان آیات کے مطالعہ سے ایک منفی حقیقت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ سورج ایک مدار پر حرکت کر رہا ہے۔ لیکن اس بات کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ زمین کے لحاظ سے یہ مدار کونسا ہوسکتا ہے۔ نزول قرآن کے وقت خیال کیا جاتا تھا کہ سورج متحرک ہے اور زمین ساکن۔ یہ زمین کی مرکزیت کا نظام تھا جو بطلیموس کے زمانہ سے مقبول چلا آ رہا تھا جو دوسری صدی قبل مسیح کا سائنسدان ہے (۱۳) اور اس کا سلسلہ کوپرنیکس (نکولاس کوپرنیکس م ۱۵۴۳ء) تک چلا۔ جس کا دور سولہویں صدی عیسوی ہے اگرچہ حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں لوگ اس نظریہ کے حامی تھے لیکن قرآن کریم میں کہیں بھی اس کا اظہار نہیں ہوا نہ یہاں نہ کہیں اور۔

چانداور سورج کے مداروں کا وجود:

عربی کے لفظ **فلک** کا ترجمہ مدار کیا گیا ہے قرآن کے کئی فرانسیسی مترجم اس کا مفہوم ''کرہ'' بیان کرتے ہیں، یہی درحقیقت اس کا ابتدائی مفہوم ہے۔ حمیداللہ اس کا ترجمہ لفظ ''مدار'' کرتے ہیں۔

قرآن کے قدیم مترجمین کو اس لفظ نے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا جو چاند اور سورج کے مدور (راستوں) کا تصور قائم نہیں کر سکے تھے اور اس لیے انہوں نے

خلاء میں ان کے راستہ کی کچھ ایسی شکلیں محفوظ کر لی تھیں جو یا تو کسی حد تک درست تھیں یا بالکل ہی غلط تھیں۔ حمزہ بوبکر اپنے ترجمہ قرآن مجید میں اس لفظ کی وہ مختلف النوع تشریحات پیش کرتے ہیں۔ جو دوسروں نے کی ہیں "ایک قسم کا دھرا جو ایک آہنی سلاخ کے مثل ہوتا ہے جس کے گرد کوئی کل گھومتی ہے، ایک ساوی کرہ، مدار، بروج کی علامتیں، رفتار، لہر...." لیکن پھر وہ حسب ذیل بیان جو دسویں صدی کے مشہور مفسر طبری نے دیا ہے پیش کرتے ہیں۔ "جب ہمیں کسی بات کا علم نہ ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم خاموشی اختیار کریں۔" (۱۵×۱۱ے) اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ سورج اور چاند کے مدار کا یہ تصور حاصل کرنے میں کس قدر ناکام رہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر یہ لفظ اس فلکیاتی تصور کو واضح کرتا جو حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں عام تھا تو ان آیات کی توضیح وتشریح کرنا انتہائی مشکل ہوتا۔ لہٰذا قرآن میں ایک بالکل ہی جدید تصور موجود تھا جس کی وضاحت صدیوں بعد تک نہیں کی جا سکی تھی۔

چاند کا مدار:

آج کل یہ تصور نہایت وسعت سے پھیلا ہوا ہے کہ چاند زمین کا ایک طفیلی جرم ہے جو اس کے گرد ۲۹ دن کی مدت میں گردش کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے مدار کی مطلقاً مدور شکل میں تھوڑی سی صحت کرنی پڑے گی اس لیے کہ جدید فلکیات اس کے لیے ایک مخصوص مختلف المرکزیت تجویز کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے زمین اور چاند

کے درمیان کا فاصلہ (۲۴۰۰۰۰ میل) اس کا محض اوسط فاصلہ ہو جاتا ہے۔

ہم نے صدر میں اس بات کو دیکھا ہے کہ کس طرح قرآن، چاند کی حرکتوں کے مشاہدہ کرنے کی افادیت کو وقت کا حساب لگانے کے لیے بیان کرتا ہے (سورۃ ۱۰، آیت ۸ جس کا حوالہ اس باب کے شروع میں دیا گیا ہے)

یہ نظام اکثر ہمارے اس نظام کے مقابلہ میں دقیانوسی، نا قابل عمل اور غیر سائنٹفک قرار دے کر تنقید کا ہدف بنایا گیا ہے جس کی بنیاد سورج کے گرد زمین کی گردش پر ہے اور جو فی الوقت یولیانی تقویم میں بیان کیا جاتا ہے۔

یہ تنقید حسب ذیل دو آراء کو ہمارے سامنے لاتی ہے:۔

الف۔ تقریباً چودہ صدیاں گذریں کہ قرآن جزیرہ نما عرب کے ان باشندوں کی طرف بھیجا گیا جو وقت کے لیے چاند سے حساب لگانے کے عادی تھے۔ ان کو محض اسی زبان میں مخاطب کرنا مناسب تھا جو وہ سمجھ سکتے تھے اور مکانی اور زمانی حوالے کے نشانات کا تعین جس کے وہ عادی تھے اور جو چیزیں ان کے لیے بالکل موزوں بھی تھیں ان کو الٹ دینا مناسب نہیں تھا، یہ معلوم ہے کہ صحرا میں رہنے والے لوگ مشاہدات فلکی میں کتنے ماہر ہوتے ہیں، وہ ستاروں کی مدد سے جہاز رانی کرتے تھے اور چاند کی شکلوں سے وقت بتا دیتے تھے۔ ان کے لیے وہی ذرائع سب سے زیادہ سہل اور بھروسہ کے قابل تھے۔

ب۔ اس میدان میں ماہرین کو چھوڑ کر اکثر لوگ یولیانی اور قمری تقویم کے مابین تعلق کے بارے میں ناواقف ہیں۔ ۲۳۵ قمری مہینے ۳۲۵

۴ /۱ دن کے ۱۹ یولیانی سالوں سے پوری مطابقت رکھتے ہیں۔ پھر ہمارے ۳۶۵ دن والے سال کا طول بھی کامل نہیں ہے کیونکہ اس کی ہر چار سال کے بعد تصحیح کرنی پڑتی ہے۔ قمری تقویم میں یہی واقعہ ہر ۱۹ سال (یولیانی) کے بعد رونما ہوتا ہے۔ اس کو مٹانی دور کہا جاتا ہے جو یونانی ہیئت دان مُیان (۱۴) کے نام پر ہے جس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں شمسی اور قمری وقت کے درمیان اس صحیح تعلق کو دریافت کیا تھا۔

۲۔ سورج:

سورج کے مدار (۱۵) کا تصور کرنا مشکل ہے اس لیے کہ ہم اپنے نظام شمسی پر جو ہمارے گرد قائم ہے۔ غور کرنے کے عادی ہیں۔ قرآن کی آیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنی کہکشاں میں سورج کی جائے وقوع کو سمجھنا پڑے گا اور اس کے لیے ہمیں جدید سائنسی نظریات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ہماری کہکشاں میں ستاروں کی نہایت کثیر تعداد ہے۔ یہ ستارے اس طرح خلاء میں بکھرے ہوئے ہیں کہ ان سے ایک ایسی طشتری بن گئی ہے جس کی دبازت کنارے کے مقابلہ میں مرکز پر زیادہ ہے اس میں سورج کی جائے وقوع کچھ ایسی ہے کہ یہ اس طشتری کے مرکز سے کافی ہٹا ہوا ہے۔ کہکشاں اپنے محور کے جو خود اس کا مرکز ہے، گرد گھوم رہی ہے۔ نتیجتاً سورج بھی اس مرکز کے گرد ایک

مدور مدار پر گردش کر رہا ہے۔ جدید فلکیات نے اس کی تفصیلات معلوم کی ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں شیلے نے سورج اور ہماری کہکشاں کے مرکز کے درمیان کے فاصلہ کا اندازہ ۱۰ کلو پارسک (۱۶) لگایا ہے۔ جس کو اگر میلوں میں ظاہر کیا جائے تو ۲ کا ہندسہ لکھ کر ۱۷ صفر لگانے ہوں گے، اپنے محور پر ایک چکر مکمل کرنے کے لیے کہکشاں اور سورج کو اندازاً ۲۵۰ ملین سال (۲۵ کروڑ سال) لگیں گے، سورج اس کی تکمیل میں ۱۵۰ میل فی سیکنڈ کے حساب سے مسافت طے کرتا ہے۔

مذکور بالا سورج کی مداری حرکت ہے جس کا حوالہ قرآن مجید نے پیشتر دیا ہے۔ اس گردش کے وجود اور تفصیلات کی دریافت جدید علم ہیئت کی کامرانیوں میں سے ایک ہے۔

خلا میں چاند اور سورج کی حرکتوں کا ان کی اپنی گردشوں کے لحاظ سے حوالہ

یہ تصور قرآن کے ان تراجم میں دکھائی نہیں دیتا جو علماء نے کیے ہیں، چونکہ موخر الذکر حضرات کو فلکیات کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھیں، لہٰذا انہوں نے عربی کے اس لفظ کا جو اس حرکت کو بیان کرتا ہے ترجمہ ایک ایسے لفظ سے کیا ہے جس کا مفہوم ہے تیرنا۔ یہ بات انہوں نے دونوں ترجموں یعنی فرانسیسی اور قابل ذکر عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمہ میں کی ہے۔(۱۷)

عربی کے اس لفظ کے لیے جو ایسی حرکت کو ظاہر کرے جو کسی جسم کی ذاتی تحریک سے پیدا ہو فعل ''سبح'' استعمال ہوتا ہے (دونوں آیتوں میں لفظ یسبحون استعمال ہوا ہے) اس فعل کے تمام مفاہیم ایسی حرکت پر دلالت کرتے ہیں جو ایک جنبش کے ساتھ وابستہ ہے جس کا صدور جسم زیر بحث سے ہوتا ہے۔ اگر حرکت پانی کے اندر ہو تو اس کو ''تیرنا'' کہتے ہیں، اگر یہ حرکت زمین پر ہو تو یہ کسی شخص کی اپنی ٹانگوں کے عمل سے ہوتی ہے۔ جو حرکت خلاء میں ہوتی ہے تو یہ بات سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جو معنی اس لفظ پر دلالت کرتے ہیں، ان ابتدائی معنوں کو چھوڑ کر کیسے کوئی اور مفہوم اس کا لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حسب ذیل وجوہ کی بناء پر غلط ترجمہ کرنے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

چاند اپنی محور کے گرد اپنی یومیہ گردش کو اتنے ہی وقت میں پورا کر لیتا ہے جتنے وقت میں وہ زمین کے گرد چکر لگاتا ہے یعنی ۲۹ ۲/۱ دن (تقریباً) خط استواء اور

قطبین پر اس کی گردش میں بعض اختلافات ہیں (یہاں ہم ان اختلافات کی گہرائی میں نہیں جائیں گے) لیکن مجموعی طور پر سورج میں گردش محوری کے سبب ایک تحریک پیدا ہوتی ہے۔

لہذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں ایک باریک سا لفظی فرق سورج اور چاند کی اپنی گردشوں میں بتایا گیا ہے دونوں اجرام سماوی کی ان گردشوں کی توثیق جدید سائنس کی تحقیقات سے ہوگئی ہے اور یہ بات نا قابل فہم ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا کوئی شخص جو اپنے زمانہ میں کتنا بھی ذی علم رہا ہو (اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بات یقیناً صادق نہیں آتی) ان باتوں کو سمجھ سکے۔

اس نظریہ پر قدیم زمانہ کے ان عظیم مفکرین کی مثالیں پیش کر کے بعض اوقات بحث کی جاتی ہے جنہوں نے مسلمہ طور پر بعض ان باتوں کی پیشگوئی کر دی تھی جن کی تصدیق جدید سائنس سے ہوگئی ہے۔ پھر یہ کہ وہ سائنس کے استنباط و استخراج پر بھی انحصار نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا طریقہ عمل زیادہ تر فلسفیانہ استدلال پر مبنی تھا چنانچہ فیثا غورث کے مسلک کے ماننے والوں کے معاملہ کو اکثر پیش کیا جاتا ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں انہوں نے زمین کے اپنے محور پر گردش اور سیاروں کے سورج کے گرد چکر لگانے کے نظریہ کی حمایت کی تھی۔ اس نظریہ کی جدید سائنس نے تصدیق کر دی ہے۔ اس کا مقابلہ فیثا غورثی مسلک رکھنے والوں کے نظریہ سے کرنے کے بعد حضرت محمد ﷺ کے بارے میں اس نظریہ کو پیش کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ آپ ایک ایسے روشن خیال مفکر تھے جنہوں نے ان باتوں کو، جن کا انکشاف جدید سائنس صدیوں بعد کرنے والی تھی، خود سوچ لیا ہوگا۔ (۱۸)

لیکن یہ قیاس آرائیاں کرتے وقت لوگ اس واقعہ کے دوسرے پہلو کو قطعاً فراموش کر دیتے ہیں کہ جو ان فلسفیانہ دلائل کو پیش کرنے کے لیے حکماء نے پیدا کیا تھا، یعنی وہ فاحش غلطیاں جو ان کے کام کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات یاد رکھنی پڑے گی کہ فیثا غورثی مسلک رکھنے والے اس نظریہ کی بھی حمایت کرتے تھے۔ جس کی رو سے سورج خلاء میں ایک جگہ جما ہوا ہے وہ اس کو کائنات کا مرکز قرار دیتے تھے اور ایک ایسے نظام سماوی کا تصور پیش کرتے تھے جس کا مرکز سورج ہے۔ زمانۂ قدیم کے عظیم مفکرین کی تحریروں میں یہ بات بہت عام ہے کہ وہ کائنات کے بارے میں معقول اور نامعقول خیالات کو ملا دیتے ہیں۔ ان انسانی تحریروں کی عظمت اسی بات میں ہے کہ ان میں ایسے ترقی یافتہ تصورات شامل ہیں لیکن ان کی بناء پر ہمیں ان غلط تصورات کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔ جو انہوں نے ہمارے لیے چھوڑے ہیں۔ ایک کلیتہً سائنسی نقطہ نظر سے یہی وہ بات ہے جو ان کی تحریروں کو قرآن سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ موخر الذکر میں کئی ایسے موضوعات کا حوالہ ہے جن کا جدید معلومات سے گہرا ربط ہے اور ان میں سے کیسی میں بھی ایسا کوئی بیان نہیں ہے جو دور جدید کی سائنس کے قائم کردہ کسی نظریہ کی تردید کرتا ہو۔

دن اور رات کا تواتر

جس زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور سورج اس

کے لحاظ سے حرکت کر رہا ہے تو کوئی شخص رات اور دن کے تواتر پر گفتگو کرتے وقت سورج کی گردش کا حوالہ دینے سے کیسے چوک سکتا تھا؟ لیکن اس بات کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اور اس مضمون کو حسب ذیل طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ ۷، آیت ۵۴:۔

یغشی الیل النھار یطلبه حثیثا لا

''جو اللہ تعالیٰ رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے۔''

سورۃ ۳۶، آیت ۳۷:۔

و ایة لھم الیل صلے نسلخ منه النھار فاذا ھم مظلمون.

''ان کے لیے (بنی نوع انسان کے لیے) ایک اور نشانی رات ہے۔ ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔''

سورۃ ۳۱، آیت ۲۹:۔

الم تر ان اللہ یولج الیل فی النھار و یولج النھار فی الیل.

''کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں ضم کر دیتا ہے۔''

سورۃ ۳۹، آیت ۵:۔

یکور الیل علی النھار و یکور النھار علی الیل.

''وہی (اللہ تعالیٰ) رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔''

پہلی آیت جو نقل کی گئی ہے اس کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں ہے، دوسری محض ایک مثال اور نشانی پیش کرتی ہے۔

خاص طور پر تیسری اور چوتھی آیات جو یہاں نقل کی گئی ہیں تشریح کے اس عمل کے لیے بالخصوص رات کے دن پر لپٹنے اور دن کے رات پر لپٹنے کے لیے دلچسپ مواد فراہم کرتی ہیں سورۃ ۳۹، آیت ۵

لفظ ''لپٹنا'' جیسا کہ فرانسیسی ترجمہ از آر بلاشیر میں ہے۔ عربی لفظ ''کور'' کا بہترین ترجمہ ہے۔ اس فعل کے ابتدائی معنی پگڑی کا سر کے گرد لپٹنا نہیں، لپٹنے کا تصور اس لفظ سے دوسرے دیگر مفاہیم میں قائم رکھا گیا ہے۔

لیکن حقیقتاً خلا میں کیا واقعہ رونما ہوتا ہے؟ امریکی ہوابازوں نے اپنے خلائی جہازوں سے دیکھا ہے اور فوٹو بھی اس چیز کے زمین سے بہت فاصلہ پر یعنی چاند سے کھینچے ہیں اور اس نے دیکھا کہ سورج کس طرح مستقل طور پر زمین کی سطح کے نصف کو جو اس کی طرف ہوتا روشن کر دیتا ہے اور کرہ کا دوسری نصف تاریکی میں ہوتا ہے۔ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور روشنی وہی رہتی ہے۔ چنانچہ نصف کرہ کی شکل کا کچھ رقبہ چوبیس گھنٹے میں زمین کے چاروں طرف ایک چکر لگا لیتا ہے جب کہ دوسرا نصف کرہ جو تاریکی میں رہ چکا ہے وہ بھی وہی چکر اتنے ہی وقت میں پورا کر لیتا ہے۔ رات اور دن کے اس مستقل دور کو قرآن میں نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس تصور کو گرفت میں لے لینا آج کل فہم انسانی کے لیے آسان ہے اس لیے کہ سورج کے اضافی طور پر غیر متحرک ہونے اور زمین کے گردش کرنے کا ہمیں اس وقت تصور ہے۔ متواتر لپٹنے کا یہ عمل بشمول ایک علاقہ

کے دوسرے میں پروئے جانے کا سلسلہ قرآن میں بالکل اس طرح بیان ہوا ہے گویا اس وقت زمین کی گولائی کا نظریہ پہلے سے مان لیا گیا تھا۔ حالانکہ حقیقتاً یہ بات نہیں تھی۔

دن اور رات کے تواتر پر جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں اس کے بارے میں قرآن کریم کی بعض آیات کے حوالے سے مزید یہ خیال بھی پیش کرنا پڑے گا کہ ایک سے زیادہ مشرق ہیں اور ایک سے زیادہ مغرب۔ یہ خالص بیان کی دلچسپی کے لیے ایک چیز ہے، اس لیے کہ یہ حوادث انتہائی درجہ کے عام مشاہدات پر مبنی ہیں۔ یہاں اس خیال کو محض اس مقصد سے پیش کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر قرآن جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہے اس کو امکانی حد تک دیانتداری سے دہرا دیا جائے۔

ذیل میں مثالیں دی جاتی ہیں:

سورۃ ۷۰، آیت ۴۰ میں عبارت ہے۔

فلا اقسم برب المشرق و المغرب انا لقدرون. علی ان نبدل خیرا منهم.

"میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں۔"

سورۃ ۵۵، آیت ۱۷ میں یہ مضمون اس طرح ہے۔

رب المشرقین ورب المغربین

"دو مشرقوں کے مالک اور دو مغربوں کے مالک"

سورۃ ۴۳، آیت ۳۸ میں دونوں طرفوں کے درمیان فاصلہ کا حوالہ دیا گیا

ہے:۔

حتی اذا جآء ناقال یلیت بینی و بینک بعد المشرقین فبئس القرین.

''یہاں تک کہ جب یہ شخص ہمارے یہاں پہنچے گا تو کہے گا 'کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بعد ہوتا، تو بدترین ساتھی نکلا۔''

کوئی شخص جو طلوع شمس اور غروب شمس کا بغور مشاہدہ کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ موسم کے مطابق سورج مشرق کے مختلف نقطوں سے نکلتا ہے اور مغرب کے مختلف نقطوں پر ڈوبتا ہے ہر دو افق پر اس کے میلانات ان انتہائی حدود کا تعین کرتے ہیں جو دو مشرقوں اور دو مغربوں کی نشاندہی کرتی ہیں اور ان کے درمیان وہ نقطے ہیں جن کا تعین پورے سال کے دوران کیا جاتا ہے ''واقعہ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ نہایت عام ہے۔ لیکن اس باب میں جو باتیں زیادہ توجہ کی مستحق ہیں۔ وہ دیگر عنوانات ہیں جو بیان کیے جاتے ہیں اور جن میں قرآن میں بیان کردہ فلکی واقعات کا بیان جدید تحقیقات سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔

(د) آسمانوں کا ارتقاء:

کائنات کی تشکیل کے جدید نظریہ کو ذہن نشین کرانے کے بعد اس ارتقاء کا حوالہ دیا گیا تھا جو ابتدائی سدیم سے شروع ہو کر رونما ہوا، پھر کہکشاؤں اور ستاروں

کی تشکیل اور (نظام شمسی کے لیے) اس کے ارتقاء کے کسی مرحلہ میں سورج سے شروع ہوکر سیاروں کا ظہور ہوا۔ جدید تحقیقات سے ہماری رہنمائی اس یقین تک ہوتی ہے کہ نظام شمسی اور زیادہ عمومیت کے ساتھ خود کائنات میں یہ ارتقاء ہنوز جاری ہے۔

کوئی شخص جو ان خیالات ونظریات سے باخبر ہے، قرآن میں پائے جانے والے ان بیانات سے ان چیزوں کا موازنہ کرنے میں کیسے ناکام رہ سکتا ہے جن میں اللہ تعالی کی قدرت کاملہ کا اظہار ہوتا ہے۔

قرآن ہمیں بار بار اس بات کی یاد دہانی کراتا ہے کہ کل یجری لاجل مسمی ''اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے۔''

یہ فقرہ سورۃ ۱۳، آیت ۲: سورۃ ۳۱، آیت ۲۹: سورۃ ۳۵، آیت ۱۳: سورۃ ۳۹، آیت ۵ میں دکھائی دیتا ہے۔

اس کے علاوہ ''ٹھکانے'' کا ایک تصور ایک منزل کے نظریہ کے ساتھ وابستہ کر کے سورۃ ۳۶، آیت ۳۸ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

والشمس تجری لمستقر لها ذلک تقدیر العزیز العلیم

''اور سورج اپنے ٹھکانے کی سمت دوڑا چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔''

ٹھکانا لفظ ''مستقر'' کا ترجمہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ٹھیک ٹھیک جگہ کا تصور اس سے وابستہ ہے۔

جب ان بیانات کا مقابلہ جدید سائنس کی مصدقہ معلومات سے کیا جاتا ہے۔

تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بیانات اس معلومات کی کیسی ترجمانی کرتے ہیں۔

قرآن مجید سورج کے ارتقاء کے لیے ایک انجام کا تعین کرتا ہے اور ساتھ ہی ایک ٹھکانے کا پتہ دیتا ہے اس میں چاند کے لیے بھی ایک ٹھکانے کا تعین کیا گیا ہے۔ان بیانات کے ممکنہ مفاہیم کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ بات یاد رکھنی پڑے گی کہ جدید معلومات ستاروں کے ارتقاء کے بارے میں بالعموم اور سورج کے بارے میں بالخصوص کیا ہے اور (اگر اس کو توسیع دی جائے تو) اجرام سماوی کے متعلق جو خود بخود اس کی معیت میں خلاء کے اندر سفر کر رہے ہیں جن میں چاند بھی شامل ہے، اس سے ہمیں کیا اطلاع ملتی ہے۔

سورج ایک ستارہ ہے جو تقریباً ۲/۱ء۴ ارب سال پرانا ہے جیسا کہ ماہرین نجمی طبیعات کا خیال ہے۔ دیگر تمام ستاروں کی طرح اس کے ارتقاء میں بھی ایک مرحلہ کا تعین کرنا ممکن ہے، فی الوقت سورج اپنے ابتدائی مرحلہ میں ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہائیڈروجن کے جوہر ٹوٹ پھوٹ کر ہیلیم کے جوہروں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔نظری طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ان حسابات کے بموجب جن کے مطابق اس قسم کے ستاروں کے ابتدائی مرحلہ کے لیے مدت مجموعی دس ارب سال قرار دی جاتی ہے۔ اس کے موجودہ مرحلہ کو اختتام تک پہنچنے کے لیے مزید ۲/۱ء۵ سال لگنے چاہئیں، یہ بات دوسرے ستاروں کے سلسلہ میں پہلے ہی ظاہر کی جا چکی ہے کہ اس مرحلہ سے ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہائیڈروجن کی ہیلیم میں تبدیلی کا عمل مکمل ہو چکتا ہے جس کے نتیجہ میں سورج کے بیرونی پرتوں کا پھیلاؤ اور اس کے ٹھنڈے ہونے کا عمل ظہور پذیر

ہوتا ہے، آخری مرحلہ وہ ہے جب اس کی روشنی بہت گھٹ جاتی اور کثافت بے حد بڑھ جاتی ہے، یہ بات اس نوع کے ایک ستارے میں دکھائی دیتی ہے جس کو سفید بونا کہتے ہیں۔(۱۹)

مذکورہ بالا تاریخیں صرف اس لیے دلچسپی کی چیز ہیں کہ ان سے اس زمان کا کچھ موٹا سا اندازہ ہو جاتا ہے جس کا اس مسئلہ سے تعلق ہے لیکن اس سلسلہ میں خاص بات جو یاد رکھنے کی ہے وہ ہے ارتقاء کا تصور۔ جدید معلومات سے ہمیں یہ پیشگوئی کرنے میں مدد ملتی ہے کہ چند ارب سالوں میں نظام شمسی کی وہ حالت قائم نہیں رہے گی جو آج ہے۔ دوسرے ستاروں کی طرح جن کی تبدیلیوں کا ان کے آخری مرحلہ تک پہنچنے کا حساب لگایا جا چکا ہے۔ سورج کے اختتام کی بھی پیشگوئی کرنا ممکن ہو گیا ہے۔

دوسری آیت جو اوپر درج کی گئی ہے (سورۃ ۳۶، آیت ۳۸) سورج کے اپنے مستقر (ٹھکانے) کی جانب رواں دواں ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جدید فلکیات نے اس کا ٹھیک ٹھیک تعین بھی کر لیا ہے اور اس کو راس الشمس (سولر اپیکس) کا نام بھی دے دیا گیا ہے۔ فی الحقیقت نظام شمسی خلا میں ایک ایسے نقطہ کی جانب رواں ہے۔ جو مجمع النجوم الجاث (الف ثلیاق) میں واقع ہے اور جس کی صحیح جگہ کا پوری طرح تعین کر لیا گیا ہے۔ اس بات کا پتہ چلا لیا گیا ہے کہ یہ ۱۲ میل فی سیکنڈ (۴۳۲۰۰ میل فی گھنٹہ) کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔

یہ تمام فلکیاتی معلومات اس بات کی مستحق ہیں کہ ان کو قرآن کی ان دونوں آیتوں کے سلسلہ میں پیش کیا جائے۔ اس لیے کہ یہ بیان کرنا ممکن ہے کہ یہ آیات

جدید سائنسی معلومات کے ساتھ پوری طرح مطابقت رکھتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

کائنات کا پھیلاؤ:

کائنات کا پھیلاؤ جدید سائنس کی سب سے مرعوب کن دریافت ہے۔اس وقت یہ ایک نہایت مستحکم تصور ہے اور بحث صرف اس بات پر مرکوز ہے کہ یہ امر کس طرح انجام پارہا ہے۔

اس بات کی جانب پہلے پہل اضافیت کے عام نظریہ نے ذہن کو منتقل کیا تھا اوراب کہکشانی طیف کے جائزے کے بعد علم طبیعات سے اس کی تائید ہورہی ہے،ان کی طیف کے سرخ حصہ کی جانب باقاعدہ حرکت کی تشریح اس نظریہ کی مدد سے کی جا سکتی ہے کہ ایک کہکشاں دوسری سے دور ہٹتی جا رہی ہے اس طرح کائنات کی جسامت بھی غالباًبڑھتی جارہی ہےاور کہکشائیں ہم سے جتنی دور ہیں اتنا ہی یہ اضافہ بھی زیادہ ہوتا جائے گا۔جن رفتاروں سے یہ اجسام سماوی حرکت کر رہے ہیں،اس مسلسل پھیلاؤ کے دوران وہ روشنی کی رفتار کی کسروں سے گذر کر اس سے بھی زیادہ رفتاروں میں منتقل ہوجائیں گی۔(۲۰)

قرآن کی مندرجہ ذیل آیت کا (سورۃ ۵۱،آیت ۴۷) جس میں باری تعالیٰ ہم کلام ہے،شاید جدید خیالات سے موازنہ کیا جاسکے۔

والسمآء بنینھا باید وانا لموسعون.

''آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس میں توسیع کر رہے ہیں۔''

''آسمان''لفظ''سما'' کا ترجمہ ہے اور یہ قطعی طور پر ماورائے ارضی عالم ہے جو یہاں مقصود ہے۔

''ہم اس میں توسیع کر رہے ہیں''ترجمہ ہے''موسعون'' کا جو فعل''اوسع'' کا حال استمراری کا جمع کا صیغہ ہے۔اوسع کے معنی وسیع کرنا ہیں،یعنی زیادہ کشادہ اور وسعت دیا ہوا،پھیلا ہوا۔

بعض مترجمین جو موخر الذکر مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھے،ایسے ترجمے کرتے ہیں جو میرے نزدیک غلط ہیں۔ مثلاً ہم فیاضی کے ساتھ عطا کرتے ہیں'' (آر بلیشیر) دوسرے اس مفہوم کی طرف اشارہ تو کرتے ہیں لیکن صاف صاف کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔حمید اللہ اپنے ترجمہ قرآن میں آسمانوں اور خلاء کی توسیع کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ایک سوالیہ نشان کا اضافہ کر دیتے ہیں۔آخر میں وہ لوگ ہیں جو مصدقہ سائنسی رائے سے اپنی تفسیروں کو تصویریں پہنچاتے اور وہ مفہوم بیان کرتے ہیں۔جو اوپر دیا گیا ہے۔یہ بات''منتخب'' کے معاملہ میں صحیح ہے جو اسلامی امور کی اعلیٰ کونسل قاہرہ نے مرتب کی ہے اس میں کلیتہً غیر مبہم الفاظ میں کائنات کے پھیلاؤ کا ذکر کیا گیا ہے۔

(ی) خلا کی تسخیر: (۲۱)

اس نقطہ نظر سے قرآن کی تین

آیتوں پر ہماری پوری توجہ مرکوز ہونی چاہیے، ان میں سے ایک بغیر کسی ابہام کے اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ انسانوں کو اس میدان میں کیا چیز حاصل کرنی چاہیے اور کیا وہ حاصل کرے گا۔ باقی دو میں اللہ تعالیٰ منکرین ملکہ کی خاطر فرماتا ہے کہ انہیں کس قدر حیرت ہوگی اگر وہ خود کو آسمانوں کی بلندیوں تک پہنچا سکے وہ ایک تمثیل دیتا ہے جس کو موخر الذکر محسوس نہیں کرے گا۔

(۱) ان آیات میں سے سب سے پہلی سورت ۵۵ کی آیت ۳۳ ہے:۔

یـمعشـر الـجـن و الانـس ان اسـتـطـعتم ان تنفذوا من اقطار السموت و الارض فانفذوا ط لا تنفذون الا بسلطن.

''اے گروہ جن وانس، اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو، نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لیے بڑی قوت کی ضرورت ہے۔'' (۲۲)

جو ترجمہ یہاں دیا گیا ہے اس کے لیے کچھ تشریحی رائے زنی درکار ہے۔

(۱) لفظ ''اف'' انگریزی میں اور لفظ ''اگر'' اردو میں ایک ایسی شرط ہے جس کا انحصار ایک امکان پر اور قابل حصول یا نا قابل حصول مفروضہ پر ہے۔ عربی ایک ایسی زبان ہے جو اس شرط کے جو بے انتہا واضح ہے، نہایت نازک فرق کو پیش کر سکتی ہے وہاں ایک لفظ (اذا) امکان کو ظاہر کرنے کے لیے ہے، ایک دوسرا لفظ (ان) قابل حصول مفروضہ کو اور ایک تیسرا لفظ (او) نا قابل حصول مفروضہ کو۔ زیر غور آیت میں ایک قابل حصول مفروضہ ہے جس کو لفظ (ان) سے ظاہر کیا گیا

ہے۔لہذا قرآن ایک مرئی عمل پذیری کے مادی امکان کو سمجھاتا ہے۔ یہ دقیق لسانی فرق اس خالص صوفیانہ توضیح وتشریح کو قواعد کے ذریعہ مسترد کردیتا ہے۔جو کچھ لوگوں نے (بالکل غلط طریقہ سے) اس آیت کی، کی ہے۔(۲۴)

(ب) خدا جن وانس کو مخاطب کررہا ہے اور بنیادی طور پر یہ تمثیلی صورتیں نہیں ہیں۔

(ج) گھسنا یا آر پار جانا۔ فعل ''نفذ'' کا ترجمہ ہے جس کے بعد حرف جار ''من'' آیا ہے۔ ''قاضی مرسکی'' کی لغت کے بموجب اس محاورہ کا مطلب ہے ''آر پار جانا اور کسی جسم کے دوسری طرف نکل جانا'' (مثلاً کوئی تیر جو دوسری طرف نکل آئے) لہذا یہ لفظ اقطار زیرغور میں نہایت گہرے نفوذ اور ظہور پر دلالت کرتا ہے۔

(د) قوت (سلطان) ان لوگوں کو حاصل کرنا ہوگی اور یہ کارعظیم بظاہر قادر مطلق کی قدرت سے انجام پائے گا۔(ی ۲)

اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہ آیت اس امکان کو ظاہر کرتی ہے کہ ایک دن انسان وہ مقصد حاصل کرلے گا جس کو آج ہم (غالباً غیر موزوں طریقہ پر) (۲۵) ''خلا کی تسخیر'' کا نام دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ قرآن کا متن نہ صرف اقطار السموات کے بیچ سے نفوذ کی پیشینگوئی کرتا ہے بلکہ ''ارض'' کے بیچ سے بھی نکل جانے یعنی اس کی گہرائیوں کی دریافت کا بھی پتہ دیتا ہے۔

(۲) دوسری دو آیتیں سورۃ ۱۵ سے لی گئی ہیں (آیت ۱۴ اور آیت ۱۵) اللہ

تعالیٰ مشرکین مکہ سے ارشاد فرما رہا ہے جیسا کہ محولا بالا سورۃ میں اس عبارت کے سیاق سے پتہ چلتا ہے۔

ولو فتحنا علیهم بابا من السمآء فظلوا فیه یعرجون. لقالوا انما سکرت ابصارنا بل نحن قوم مسحورون.

"(ترجمہ) اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دہاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

مذکورہ بالا بیان سے ایک عجیب و غریب نظارہ پر تحیر کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ نظارہ اس سے مختلف ہے جو کوئی بشر تصور میں لا سکتا ہے۔

شرطیہ جملہ یہاں لفظ "لو" سے شروع کیا گیا ہے جس میں ایک ایسے مفروضہ کا اظہار ہے جو ان لوگوں کے لیے کبھی حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکتا تھا جن کا ان آیات میں ذکر ہے۔

لہٰذا جب خلاء کی تسخیر پر گفتگو کی جاتی ہے تو ہمیں قرآن کے متن میں دو عبارتیں ملتی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو اس بات کی اطلاع دیتی ہے جو فہم و ذکا کی ان قوتوں کی بدولت جو اللہ تعالیٰ انسان کو عطا کرے گا، حقیقت بن کر سامنے آ جائے گی۔ دوسری اس واقعہ کا ذکر کرتی ہے جو منکرین مکہ کے مشاہدہ میں کبھی نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہ شرط کی وہ نوعیت ہے جو کبھی حقیقت کے لباس میں جلوہ گر نہیں ہو گی تاہم اس واقعہ کو دوسرے لوگ دیکھیں گے جیسا کہ مذکورہ بالا پہلی آیت میں بتایا گیا ہے۔ اس میں ان غیر متوقع مناظر پر انسانی ردعمل کا ذکر کیا گیا ہے جو خلا کے

مسافروں کے مشاہدہ میں آئیں گے، ان کی مبہوت ومسحور بینائی جیسی کہ خمار بادہ کی حالت میں ہوتی ہے اور سحر زدگی کا احساس......

یہ ٹھیک وہی چیز ہے جس کا تجربہ ۱۹۶۱ء میں دنیا کے گرد پہلی انسانی خلائی پرواز کے وقت سے خلابازوں کو ہوا ہے۔ یہ بات بطور حقیقت نفس الامری معلوم ہوتی ہے کہ کس طرح جب کوئی شخص کرۂ باد میں کچھ بلندی پر پہنچ جاتا ہے تو آسمان اس طرح نیلگوں دکھائی نہیں دیتا جس طرح کہ اس کا ہمیں زمین سے مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ نیلگونی نتیجہ ہے اس چیز کا کہ کرۂ باد کے طبقات سورج کی روشنی کو جذب کر لیتے ہیں۔ زمین کے کرۂ باد سے اوپر خلا میں پہنچ جانے والے انسان کو ایک سیاہ آسمان کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور زمین ایک نیلے رنگ کے ہالے میں لپٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس کا سبب زمین کے کرۂ باد کی روشنی کو جذب کر لینے کا حادثہ ہوتا ہے لیکن چاند کا کوئی کرۂ باد نہیں ہے اور اس لیے کرۂ ارض آسمان کے سیاہ پس منظر میں اپنے اصلی رنگوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے لہذا یہ ایک بالکل ہی نیا منظر ہوتا ہے جو خلا میں انسان کی آنکھوں کے آگے آتا ہے۔ موجودہ دور کے انسان کے لیے اس منظر کے فوٹوگراف نہایت معروف شے ہیں۔ یہاں پھر یہ بات مشکل ہو جاتی ہے کہ جب قرآن کے متن کا جدید سائنس کی معلومات سے مقابلہ کیا جائے تو ان بیانات کو دیکھ کر کوئی شخص متاثر نہ ہو جن کو محض کسی ایسے انسان کے خیالات سے منسوب نہ کر دیا جائے، جس کا دور اب سے چودہ صدیوں سے زیادہ قبل کا ہے۔

حواشی

۱۔ قرآن میں فلکیات سے متعلق جو معلومات دی گئی ہیں ان کی صداقت کو دیکھ کر بعض عقلیت پسند یہ تاویل کرتے ہیں کہ عرب ہمیشہ سے فلکیات کے ماہر رہے ہیں اس لیے رسول اللہ نے بھی عربوں کی معلومات کو قرآن میں درج کر دیا۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ عرب میں فلکیات کو ترقی آغاز اسلام سے صدیوں بعد ہوئی۔

۲۔ بالفاظ دیگر آسمانوں کو غیر محسوس اور غیر مرئی سہاروں پر قائم کیا۔ بظاہر کوئی چیز فضائے بسیط میں ایسی نہیں ہے جو ان بے حد و حساب اجرام فلکی کو تھامے ہوئے ہو مگر ایک غیر محسوس طاقت ہے جو ہر ایک کو اس کے مقام اور مدار پر روکے ہوئے ہے اور ان عظیم الشان اجسام کو زمین پر یا ایک دوسرے پر گرنے نہیں دیتی (ابو الاعلیٰ مودودی)

۳۔ یہاں آسمان اور ستارہ، کو اس بات کی اہمیت بتانے کے لیے بطور مشاہدہ پیش کیا گیا ہے جو متن میں بیان ہونے والی ہے۔

۴۔ الا من خطف الخطفة فاتبعه شهاب ثاقب.

تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

۵ . احد عشر کوکبا والشمس والقمر رایتھم لی سجدین.

میں نے دیکھا کہ گیارہ ستارے یا سیارے اور سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں (سورۃ یوسف)

۶ . فلما جن علیہ الیل راکوکبا.

جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا۔

۷ . اذا السمآء انفطرت. و اذا الکواکب انتثرت.

جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے۔

۸۔ آسمان سے مراد غالباً ہمارا کہکشانی جہاں ہے جس میں نظام شمسی اور خالی آنکھ سے دکھائی دینے والے ستارے واقع ہیں۔

۹ . و جعلنا السمآء سقفا محفوظا .

ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا۔

۱۰ . و زینا السمآء الدنیا بمصابیح و حفظا .

اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔

۱۱ . و جعلنھا رجوما للشیطین.

اور انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

۱۲۔ جدید ترین انکشاف جو سائنس نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ سورج بھی مجمع النجوم شلیاق کی جانب کسی نامعلوم مرکز کی طرف نہایت تیزی سے بھاگا جا رہا ہے۔ اس مرکز کو سولر اپکس کہا گیا ہے۔ قرآن کی یہ آیت اس کی طرف اشارہ کرتی ہے: والشمس تجری لمستقر لھا ذلک تقدیر العزیز العلیم۔ (اور سورج اپنے

ٹھکانے کی طرف چلا جارہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے) سورۃ ۳۶، آیت ۳۸۔

۱۳۔ یہ غالباً طباعت کی غلطی ہے۔ بطلیموس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی کا ہے۔ (مترجم)

۱۴۔ مُیان پانچویں صدی ق م میں مدینۃ الحکماء ایتھنز میں واقع ایک عظیم ہیئت دان ہوا ہے اس نے ۴۲۲ ق م میں مٹانی دور کی نشان دہی کی۔

۱۵۔ جدید فلکیات کے بموجب کائنات میں مادہ کے بے شمار لمبے چوڑے بادل بکھرے ہوئے ہیں جن کو ماورائے کہکشانی سدیم کہا جاتا ہے اور ان سدیموں میں سے بعض ابھی دخان کی شکل میں ہیں اور بعض میں مادہ منجمد ہو کر ستاروں کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ہمارا کہکشانی جہان بھی ایسا ہی ایک سدیم ہے جس کا مادہ منجمد ہو کر مختلف سائز کے ستارے بن گئے ہیں ایک اندازہ کے مطابق ان ستاروں کی تعداد ایک کھرب ہے۔ ہمارے کہکشانی جہان کی شکل چکی کے ایک پاٹ کی سی ہے (غالباً اسی لیے ہمارے شاعر غیر شعوری طور پر آسمان کو آسائے فلک یعنی آسمان کی چکی کہا کرتے تھے) اس پاٹ کا قطر تقریباً ایک لاکھ نوری سال ہے۔ (ایک نوری سال سے مراد تقریباً ۶۰ کھرب میل ہے) اور موٹائی ۲۰ ہزار نوری سال ہے کہکشانی جہان کے مرکز پر ستاروں کا ہجوم سب سے زیادہ ہے۔ ہمارا سورج بھی ایک ستارہ ہے

جو اس کہکشانی جہان کے مرکز سے تقریباً ۲۰ ہزار نوری سال کے فاصلے پر ہے اور دوسرے ستاروں کی طرح اس کے مرکز کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ جس راستہ پر سورج چل رہا ہے وہی اس کا مدار ہے یہ مدار اتنا لمبا ہے کہ سورج اپنی سرعت کے باوجود اس مدار پر ایک چکر ۲۲ ؍ ۱؍۲ کروڑ سال میں پورا کرتا ہے۔ (مترجم)

۱۶۔ ایک کلو پارسک ایک ہزار پارسک کے برابر ہوتا ہے۔ ۲۶ ؍ ۳ نوری سال (یا ۱۹۱۸۲۵۵۲۰۰۰۰ میل) کے مساوی ہے اس طرح ۲۰ ہزار نوری سال تقریباً ۷ ہزار پارسک یا ۷ کلو پارسک کے برابر ہوئے۔ لہٰذا یہ بات محل نظر ہے کہ کہکشاں کے مرکز سے سورج کا فاصلہ ۱۰ کلو پارسک ہے۔ (مترجم)

۱۷۔ شائع کردہ شیخ محمد اشرف لاہور (پاکستان)

۱۸۔ یہ مصنف نے ان لوگوں کا مفروضہ پیش کیا ہے جو رسول اکرم ﷺ کو نبی کی بجائے ایک مفکر مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ وحی کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ دیگر مفکرین کی طرح آپ کے غور و فکر کا نتیجہ تھا (مترجم)

۱۹۔ سفید بونا بننے کے بعد ستارہ اپنی توانائی کو نہایت تیزی سے ضائع کرتا ہے اور اس کو مزید توانائی حاصل نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ستارہ ٹھنڈا ہو کر روشنی خارج کرنا بند کر دیتا ہے اور ایک تاریک کرۂ کی شکل اختیار کر کے فضائے بسیط میں تیرتا رہ جاتا ہے۔ یہی گویا اس

ستارے کا مرحلہ ممات ہے (مترجم)

۲۰۔ ابھی تک سائنس دانوں کا نظریہ یہ ہے کہ روشنی کی رفتار سب سے زیادہ ہے اور جتنے اجرام سماوی ہمیں اس وقت نظر آتے ہیں یا آئندہ آسکتے ہیں ان کی رفتار روشنی سے کم ہے۔ اسی لیے یہ ممکن ہے کہ ہم ان کو دیکھ سکیں، لیکن بعید ترین معروضات کی ہمارے مخالف سمت میں رفتار روشنی سے بھی زیادہ ہے اس لیے ہم ان کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے (مترجم)

۲۱۔ خلا سے مراد مکان کا وہ حصہ ہے جس میں مادہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ زمین سے چند میل اوپر تک خلا کا وہ حصہ ہے جس میں ہوا ہے کرۂ باد کہلاتا ہے پھر نہایت دور تک خلا ہے جس میں مختلف نوعیت کے اجرام سماوی تیر رہے ہیں، بیشمار مجامع النجوم، عنقود اور سحابیے اور سدیم پھیلے ہوئے ہیں۔ اس حصہ کی حدود کا تعین نہ ابھی تک ہو سکا ہے اور نہ کبھی ہو سکے گا۔ کیونکہ بے انتہا وسعت کے باوجود اس میں نہایت تیزی سے پھیلاؤ ہو رہا ہے۔ اس لیے اس کا آخری سرا دور ہٹتا جا رہا ہے، لہٰذا اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اتنی دور ہے ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں اس سب کی تسخیر ناممکن ہے۔ صرف تھوڑی دور تک اس میں صعود کیا جا سکتا ہے جس طرح کہ کچھ لوگ چاند کی سطح کو چھو آئے۔

۲۲۔ ہمارے نزدیک اس آیت کا انطباق خلائی پروازوں پر نہیں

ہوتا اور نہ خلا کی تسخیر سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ پیرایہ بیان ایسا ہے جس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو بتادیا ہے کہ ہر جگہ اسی کی بادشاہی ہے، لہٰذا اس کی عبودیت و بندگی کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ اگر تم اس کی بادشاہی سے نکل کر کہیں اور پناہ لینے کے چکر میں ہو تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ جب کل کائنات اسی کی ہے تو اس سے نکل کر کہاں جاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ کہیں نہیں جا سکتے گویا انسان کو اس معاملہ میں مجبور بتایا گیا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اس آیت کا ترجمہ کر کے یہ حاشیہ دیا ہے ''زمین اور آسمانوں سے مراد ہے کائنات یا بالفاظ دیگر خدا کی خدائی، آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی خدائی سے بچ نکلنا تمہارے بس میں نہیں ہے جس بازپرس کی تمہیں خبر دی جارہی ہے۔ اس کا وقت آنے پر تم خواہ کسی جگہ بھی ہو، بہر حال پکڑ لائے جاؤ گے۔ اس سے بچنے کے لیے تمہیں خدا کی خدائی سے بچ کر بھاگ نکلنا ہو گا اور اس کا بل بوتہ تم میں نہیں ہے، گر ایسا گھمنڈ تم اپنے دل میں رکھتے ہو تو اپنا زور لگا کر دیکھ لو۔'' (مترجم)

۲۳۔ مصنف علام کی اس تحقیق انیق کے باوجود آیت کے اس مفہوم کو صحیح سمجھنا ممکن نہیں ہے جو وہ بتاتے ہیں کیونکہ آیت مذکورہ کا سیاق و سباق اور طرز بیان اس مفہوم پر دلالت نہیں کرتے اور نہ اس کا تمام سورت کے مضمون سے ربط قائم ہوتا ہے۔ گرامر کے موجودہ قواعد آغاز اسلام کے بہت بعد میں مرتب ہوئے۔ لہٰذا قرآن کا اس کے

ہر قاعدے سے مطابق ہونا ضروری نہیں، نزول کے وقت اہل زبان جس طرح بولتے تھے قرآن نے اسی طرز کا خیال رکھا اور ظاہر ہے کہ بعد میں بعض قواعد مختلف ہو گئے'' اس لیے ہر جگہ قرآن میں ان کا انطباق کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ علاوہ ازیں اس مفہوم کو تسلیم کرنے سے قرآن کی عبارت میں جو بے ربطی قائم ہوتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے بھی یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مفسرین کے ترجمہ اور تفسیر کو صحیح سمجھا جائے۔ اگر ہم نفوذ کے یہ معنی لیں جیسا کہ مصنف نے خود کہا ہے کہ کسی چیز کے آر پار ہو کر دوسری طرف نکل جانا تو کائنات کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناممکن ہے۔ پھر جب ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ کائنات نہایت تیزی سے پھیل رہی ہے تو اس کا امکان بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ قرآن نے خلا یا فضا میں انسان کے صعود کرنے کی کہیں نفی نہیں کی ہے لہٰذا موجود دور کی خلائی پروازوں سے اس کے کسی بیان کی تغلیط نہیں ہوتی۔ خلا بازوں کا چاند یا سیاروں تک پہنچ جانا کائنات کی تسخیر کے ذیل میں نہیں آتا۔

۲۴۔ یہ آیت اللہ کی نعمتوں کو تسلیم کرنے کی ایک دعوت ہے۔ یہ اس پوری سورۃ کا مضمون ہے جس کا عنوان ہے ''رحمٰن'' (مصنف)

۲۵۔ قوسین میں یہ مختصر سا فقرہ دے کر مصنف نے خود کو اس فریب خوردگی سے بچا لیا ہے جس میں اکثر لوگ مبتلا ہیں اور چند

آدمیوں کے چاند پر ہو آنے کے نہ صرف خلا کی تسخیر کا نام دیتے ہیں۔
بلکہ کائنات کی تسخیر قرار دیتے ہیں (مترجم)

باب پنجم

زمین

جیسا کہ ان مضامین کا معاملہ ہے جن کا جائزہ پہلے لیا جا چکا ہے، قرآن کی وہ آیات جن میں زمین کا ذکر ہے، الکتاب میں منتشر حالت میں پائی جاتی ہیں، ان کی درجہ بندی کرنا مشکل ہے اور جو طریقہ یہاں برتا جا رہا ہے وہ ایک ذاتی چیز ہے۔

ان کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کے لیے چند وہ آیات علیحدہ کی جائیں جن میں بیک وقت کئی مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ یہ آیتیں اپنے اطلاق و استعمال کے اعتبار سے بالکل عام ہیں اور ان میں انسانوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ فراہم کردہ مثالوں پر غور کر کے خدا کی شان کریمی پر دھیان دیں۔

ان آیات کا دوسرا مجموعہ علیحدہ کیا جا سکتا ہے جن میں زیادہ مخصوص مضامین سے بحث کی گئی ہے جیسا کہ ذیل میں درج ہے۔

.......پانی کا دور اور سمندر۔

.......سطح زمین کے نشیب و فراز۔

.......زمین کا کرۂ باد۔

الف۔ وہ آیتیں ہیں جن میں وہ شواہد فراہم کیے گئے ہیں جن کا مقصد انسان

کو یہ ہدایت دینا ہے کہ وہ اللہ کے اس کرم بے نہایت پر غور کریں جو اس کا اپنی مخلوق پر ہے تاہم کہیں کہیں ان میں ایسے بیانات بھی ہیں جو جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے دلچسپ ہیں۔ غالباً وہ اس اعتبار سے بالخصوص چونکا دینے والے ہیں کہ ان میں قدرتی حوادث سے متعلق ان متنوع عقائد کا اظہار کہیں نہیں ہوا ہے۔ جو نزول قرآن کے وقت رائج تھے، آئندہ چل کر سائنسی معلومات سے ان کا ابطال ہونا تھا۔

ایک طرف ان آیات میں وہ سیدھے سادے خیالات بیان کیے گئے ہیں جو جغرافیائی اعتبار سے ان لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے آ جاتے ہیں جو قرآن کے مخاطب اول ہیں، یہ مکہ اور مدینہ کے باشندے اور جزیرہ نما عرب کے بدو لوگ ہیں، دوسری جانب ان میں عام نوعیت کے وہ رموز و نکات شامل ہیں جن سے کسی زمانہ اور کسی مقام کے بھی زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ لوگ، جب وہ ان پر ایک بار غور کرنا شروع کر دیں تو کچھ نہ کچھ سبق آموز باتیں سیکھ جائیں۔ یہ چیز قرآن کے آفاقی ہونے کی ایک علامت ہے۔

چونکہ قرآن میں ایسی آیتوں کی بظاہر کوئی درجہ بندی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کو یہاں سورتوں کی عددی ترتیب سے پیش کیا جا رہا ہے۔

سورۃ ۲، آیت ۲۲:

الذی جعل لکم الارض فراشا والسمآء بنآء وانزل من السمآء مآء فاخرج به من الثمرات رزقا لکم ج فلا تجعلوا لله اندادا و انتم تعلمون.

''وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مد مقابل نہ ٹھہراؤ۔''

سورۃ ۲، آیت ۱۶۴:

ان فی خلق السموت والارض واختلاف الیل والنهار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل الله من السمآء من مآء فاحیا به الارض بعد موتها و بث فیها من کل دآبة ص و تصریف الریح والسحاب المسخر بین السمآء والارض لایت لقوم یعقلون.

''جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرماں بنا کر رکھے گئے ہیں بے شمار نشانیاں ہیں۔''

سورۃ ۱۳، آیت ۳:

و ھو الـذی مد الارض و جعل فیھا رواسی وانھرا ط و من کـل الثمـرات جـعل فیھا زوجین اثنین یغشی الیل النھار ط ان فی ذلک لایت لقوم یتفکرون.

''اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں، اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔''

سورۃ ۱۵، آیت ۱۹ تا ۲۱: باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

والارض مددنھا والقینا فیھا رواسی وانبتنا فیھا من کل شیء موزون. و جعلنا لکم فیھا معایش و من لستم له برزقین. و ان من شیء الا عندنا خزآئنه وما ننزله الا بقدر معلوم.

''ہم نے زمین کو پھیلایا۔ اس میں پہاڑ جمائے اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائی اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کیے تمہارے لیے بھی اور ان بہت سی مخلوقات کے لیے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو، کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں، ایک مقدار مقررہ میں نازل کرتے ہیں۔''

سورۃ ۲۰، آیت ۵۳، ۵۴:

الذی جعل لکم الارض مھدا و سلک لکم فیھا سبلا و انزل من السمآء مآء ط فاخرجنا بہ ازواجا من نبات شتی. کلو وارعوا انعامکم ان فی ذلک لایت لاولی النھی.

”وہی (خدا ہے) جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا اور اس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے اور اوپر سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی، کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں عقل رکھنے والوں کے لیے ہیں۔“

سورۃ ۲۷، آیت ۶۱:

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَا اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

”اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیئے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔“

یہاں زمین کے قشر کے عام استحکام کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ کرۂ ارض کی موجودگی کے ابتدائی مدارج میں قشر ارض کے ٹھنڈا ہونے سے قبل موخر الذکر غیر مستحکم تھا تاہم قشر ارض کا استحکام مکمل طور پر یکساں نہیں ہے۔ اس لیے کہ

ایسے منطقات موجود ہیں جہاں زلزلے متواتر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں تک بین البحرین حاجزا (''دو سمندروں کے درمیان پردے کے حائل ہونے) کا تعلق ہے، یہ ایک اشارہ ہے جس سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ بڑے بڑے دریاؤں کے پانی اور سمندر کے پانی، بعض بڑے بڑے دریاؤں کے دہانوں پر ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط نہیں ہو جاتے۔

سورۃ ۶۷، آیت ۱۵:

ھوالذی جعل لکم الارض ذلولا فامشوا فی مناکبھا و کلوا من رزقہ ط و الیہ النشور.

''وہی تو ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے تابع کر رکھا ہے، اس کی چھاتی پر چلو پھرو اور خدا کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔''

سورۃ ۷۹، آیات ۳۰ تا ۳۳:

والارض بعد ذلک دحھا. اخرج منھا مآئھا و مرعھا. والجبال ارسھا . متاعا لکم ولانعامکم.

''اس کے بعد زمین کو بچھایا اس کے اندر اس کا پانی اور چارا نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے، سامان زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے۔''

ایسی ہی کئی آیتوں میں پانی اور زمین کی مٹی میں اس کی موجودگی کے عملی نتائج

کے اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔پانی کی موجودگی کا نتیجہ مٹی کی زرخیزی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ صحرائی علاقوں میں پانی انسان کی بقاء کے لیے سب سے زیادہ اہم شے ہے لیکن قرآن میں اس کا حوالہ جغرافیائی تفصیلات سے بھی آگے تک جاتا ہے۔سائنسی معلومات کے مطابق کرۂ ارض ایک ایسا سیارہ ہے جس کی یہ خصوصیت کہ وہ پانی کی دولت سے مالا مال ہے اس کا نظام شمسی میں ایک انفرادیت بخشتی ہے۔اور ٹھیک یہی وہ بات ہے جس کا قرآن میں بہت نمایاں کیا گیا ہے، بغیر پانی کے زمین چاند کی طرح ایک بے جان سیارہ ہوتی۔قرآن، زمین کے قدرتی نوامیس میں، جن کا اس میں ذکر ہے، پانی کو سب سے پہلا درجہ عطا کرتا ہے۔قرآن میں پانی کے دور کو نہایت صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(ب) پانی کا دور اور سمندر:

جب آج قرآن کی ان آیات کی تلاوت کی جاتی ہے جن کا تعلق انسانی زندگی میں پانی کے عمل سے ہے تو وہ سب ہمیں ان خیالات کو ظاہر کرتی ہوئی دکھائی دیں گے جو بالکل واضح ہیں ان کی وجہ نہایت سادہ سی ہے، ہمارا زمانہ اور دور وہ ہے جب ہم سب کم یا زیادہ پانی کے اس چکر سے واقف ہیں جو قدرتی طور پر چل رہا ہے۔

لیکن اگر ہم ان مختلف تصورات پر غور کریں جو قدماء موضوع سے متعلق قائم کیے ہوئے تھے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں دی ہوئی معلومات وہ

اساطیری تصورات نہیں ہیں جو نزول وحی کے وقت رائج تھے اور جو مشاہدہ شدہ حوادث کے مقابلہ میں فلسفیانہ تصورات کے مطابق پروان چڑھے تھے، اگرچہ یہ بات اوسط درجہ میں حاصل ہونا تجربی طور پر ممکن تھا، تاہم آبپاشی کی ترقی کے لیے جس عملی معلومات کی ضرورت تھی، اور عام طور پر پانی کے دور کے متعلق جو تصورات قائم تھے وہ موجودہ زمانہ میں مشکل سے قابل قبول ہو سکتے تھے۔

اس طرح یہ تصور آسانی سے کیا جاتا رہا ہوگا کہ زیر زمین پانی، بارش کے پانی کے مٹی میں جذب ہونے سے حاصل ہوتا ہے، البتہ ازمنۂ قدیم میں یہ نظریہ جو پہلی صدی قبل مسیح میں ویٹروویس پولیو مارکس نے روم میں قائم کیا تھا، ایک استثناء کے طور پر نقل کیا گیا تھا۔ اس لیے صدیوں تک (اور نزول قرآن اسی مدت کے دوران ہوا) پانی کے دور سے متعلق انسان کلیتہً غلط نظریات قائم کیے رہا۔

اس مضمون کے دو ماہرین جی گیسٹینی اور بی۔ بلیو۔ یونی ورسالیز انسائیکلوپیڈیا (آفاقی دائرۃ المعارف) میں ہائیڈروجیولوجی (ماطبقات الارض) کے عنوان کے تحت اپنے اندراجات میں اس مسئلہ کی روحانی تاریخ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ساتویں صدی قبل مسیح میں تھالیس ملطوی کا نظریہ یہ تھا کہ سمندروں کا پانی، ہواؤں کے اثر سے براعظموں کے اندر کی جانب گھس پڑا، اس طرح پانی خشکی پر پڑا اور مٹی میں نفوذ کر گیا..... افلاطون نے ان نظریات کو اپنایا اور بتایا کہ پانی کی سمندر کو واپسی ایک بڑے غار ''ٹارٹیرس'' کے ذریعہ ہوئی۔ اس نظریہ کی تائید کرنے والے بہت سے لوگ اٹھارہویں صدی عیسوی تک رہے۔ ان ہی میں ایک رینے دے کارت تھا۔ ارسطو کا خیال تھا کہ مٹی کے اندر کا پانی جو بشکل بھاپ

ہوتا ہے کوہستانی شگافوں میں پہنچ کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور زیر زمین جھیلوں کو جنم دیتا ہے، جن سے چشموں کو پانی بہم پہنچتا ہے۔ اس کی تقلید سینیکا نے (پہلی صدی عیسوی میں) اور بہت سے دوسرے لوگوں نے کی اور یہ سلسلہ ۱۸۷۷ء تک چلتا رہا۔ ان لوگوں میں او۔ والگر شامل ہے۔ پانی کے دور کی اولین اور واضح ضابطہ سازی کا کام ۱۵۸۰ء میں برنارڈ پیلیسی سے منسوب کیا جاتا ہے اس نے دعویٰ کیا تھا کہ زیر زمین بارش سے حاصل شدہ ہوتا ہے جو مٹی میں جذب ہو جاتا ہے اس نظریہ کی توثیق سترھویں صدی میں ای میریٹ اور ٹی پیرول نے کی۔

قرآن کی حسب ذیل آیات میں ان غلط نظریات کا جو حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں رائج تھے، کوئی سراغ نہیں ملتا۔

سورۃ ۵۰، آیت ۹ تا ۱۱:

و نزلنا من السمآء مآء مبرکا فانبتنا به جنت و حب الحصيد. والنخلبسقت لها طلع نضيد. رزقا للعباد واحيينا به بلدة ميتا ط كذلك الخروج.

"اور آسمان سے ہم نے برکت والا (ا) پانی نازل کیا پھر اس سے باغ اور فصل کے غلے اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بر تہ لگتے ہیں، یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔ اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے) نکلنا بھی اسی طرح ہوگا۔"

سورۃ ۲۳، آیت ۱۸ تا ۱۹:

وانزلنا من السمآء مآء بقدر فاسکنه فی الارض قف صلے وانا علی ذھاب به لقدرون... فانشانا لکم به جنت من نخیل و اعناب لکم فیھا فواکه کثیرة و منھا تاکلون..

''اورآسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، پھر اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں پھر اس پانی کے ذریعہ ہم نے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ پیدا کر دیئے اور تمہارے لیے ان باغات میں بہت سے لذیذ پھل ہیں اور ان سے تم روزی حاصل کرتے ہو۔''

سورۃ ۱۵، آیت ۲۲:

وارسلنا الریح لواقح فانزلنا من السمآء مآء فاسقینکموه و مآ انتم له بخزنین....

''بار آور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں اور اس پانی سے تمہیں سیراب کرتے ہیں، اس دولت کے خزانہ دار تم نہیں ہو۔''

اس آخری آیت کی دو ممکن تشریحات ہیں۔ بار آور ہواؤں سے مراد پودوں کی بار آوری ہوسکتی ہے کیونکہ یہ ہوائیں ہی ان کے تخم لے جاتی ہیں۔ لیکن یہ ایک مجازی مفہوم ہوسکتا ہے جو تمثیل کی راہ سے ہوا کے اس کردار کی جانب اشارہ کرتا ہے جو یہ ہوا اس عمل میں ادا کرتا ہے۔ جس سے ایک بارش نہ برسانے والا بادل،

ابر مطیر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اس کردار کا اکثر حوالہ دیا گیا ہے، جیسے حسب ذیل آیات ہیں:۔

سورۃ ۳۵، آیت ۹:

واللہ الذی ارسل الریح فتثیر سحابا فسقنہ الی بلد میت فاحیینا بہ الارض بعد موتھا ط کذالک النشور...

"وہ اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر ہم اسے ایک اجاڑ علاقہ کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے اس زمین کو جلا اٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی، مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہوگا۔"

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت کے پہلے جز میں کس طرح بیانیہ طرز اختیار کیا گیا ہے اس کے بعد وہ بغیر کسی تغیر کے اللہ تعالیٰ کے ایک ارشاد کی جانب منتقل ہو جاتی ہے۔طرز بیان میں اس نوع کی یک بیک تبدیلیاں قرآن کریم میں نہایت عام ہیں۔

سورۃ ۳۰، ایت ۴۸:

اللہ الذی یرسل الریح فتثیر سحابا فیبسطہ فی السمآء کیف یشآء و یجعلہ کسفا فتری الودق یخرج من خللہ ج فاذا اصاب بہ من یشآء من عبادہ اذا ھم یستبشرون....

"اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں۔ پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انھیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکا یک وہ خوش وخرم ہو جاتے ہیں۔"

سورۃ ۷، آیت ۵۷:

و ھو الذی یرسل الریح بشرا بین یدی رحمتہ ط حتی اذآ اقلت سحابا ثقالا سقنہ لبلد میت فانزلنا بہ المآء فاخرجنا بہ من کل الثمرات ط کذلک نخرج الموتی لعلکم تذکرون....

"اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لیے ہوئے بھیجتا ہے پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر (اسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے دیکھو اسی طرح ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں شاید کہ تم اس مشاہدہ سے سبق لو۔"

سورۃ ۲۵، آیت ۴۸تا۴۹:

و ھو الذی ارسل الریح بشرا بین یدی رحمتہ و انزلنا من السمآء مآء طھورا... لنحیی بہ بلدۃ میتا و

نسقیه مما خلقنا انعاما و اناسی کثیرا....

''اور وہی ہے جو اپنی رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے پھر آسمان سے پاک پانی نازل کرتا ہے تاکہ ایک مردہ علاقہ کو اس کے ذریعہ زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے۔''

سورۃ ۴۵، آیت ۵:

وما انزل الله من السمآء من رزق فاحیا به الارض بعد موتها و تصریف الریح ایت لقوم یعقلون.....

''اور اس رزق میں جسے اللہ آسمانوں سے نازل کرتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے اور ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

اس آخری آیت میں جس رزق کے نزول کا حوالہ دیا گیا ہے وہ پانی کی شکل میں ہے۔ جو سیاق عبارت کے مطابق آسمان سے نازل کیا جاتا ہے۔ زور ہواؤں کی تبدیلی پر دیا گیا جو بارش کے دور میں تبدیلی کا موجب ہوتی ہیں۔

سورۃ ۱۳، آیت ۱۷:

انزل من السمآء مآء فسالت اودیة بقدرها فاحتمل السیل زبدا رابیا ط

''اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا، پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ

گئے۔''

سورۃ ۶۷، آیت ۳۰: اللہ تعالی رسول ﷺ سے ارشاد فرماتا ہے:

قل ارء یتم ان اصبح مآء کم غورا فمن یاتیکم بمآء معین..

''ان سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہیں نکال کر لا دے گا۔''

سورۃ ۳۹، آیت ۲۱:

الم تر ان اللہ انزل من السمآء مآء نسلکہ ینابیع فی الارض ثم یخرج بہ زرعا مختلفا الوانہ....

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کو سوتوں، چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کے رنگ مختلف ہیں۔''

سورۃ ۳۶، آیت ۳۴:

وجعلنا فیھا جنت من نخیل و اعناب و فجرنا فیھا من العیون....

''ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس کے اندر سے چشمے پھوڑ نکالے۔''

چشموں کی اہمیت اور جس طریقہ سے بارش کا پانی ان میں جاتا ہے اس پر آخر کی تین آیتوں میں کافی زور دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت قابل غور ہے۔ اس موقع پر ان نظریات کو جو ازمنۂ متوسط میں پھیلے ہوئے تھے، ذہن میں لانا چاہیے۔ مثلاً وہ نظریات جو ارسطو نے قائم کیے تھے جن کے مطابق چشموں اور دریاؤں میں پانی زیر زمین واقع جھیل سے آتا ہے، فرانسیسی قومی مدرسۂ فلاحت (ایکول ناسیونال ڈوژینی رورال، دے ایئو اے فوریتا) کے ایک استاد ایم۔ اے۔ ریمیز اس نے انسائیکلوپیڈیا یونیورسالس میں شامل اپنے مقالہ مائیات میں مائیات کے مخصوص مدارج بیان کیے ہیں۔ اور قدیم اقوام بالخصوص مشرق قریب کی قوموں کے آبپاشی کے عظیم الشان کارناموں کا ذکر کیا ہے تاہم وہ بتاتے ہیں کہ ایک تجربی نظریہ نے ہر چیز پر غلبہ پالیا تھا۔ اس لیے کہ اس زمانہ کے نظریات غلط قسم کے تصورات پر مبنی ہوتے تھے۔ وہ اپنے خیالات کو حسب ذیل طریقہ پر پیش کرتے ہیں۔

نشاۃ ثانیہ تک (تقریباً ۱۴۰۰ء اور ۱۶۰۰ء کے درمیان) یہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ خالص فلسفیانہ تصورات کی جگہ اس قسم کی تحقیق نے لی ہو جن کی بنیاد مادئیاتی حوادث کے معروضی مشاہدہ پر ہو۔ لیونارڈو داونسی (۱۴۵۲۔۱۵۱۹) نے ارسطو کے بیان سے انحراف کیا۔ برنارد پیلیسے "پانی اور قدرتی اور مصنوعی چشموں کی نوعیت" پر اپنے عجیب وغریب مقالہ (وسکورا دمیرابل دے لاناتیور دے ایوا ے فوتین تان ناتیورلیس کو آرتی فیالیس (پیرس ۱۵۷۰ء) میں پانی کے دور اور بالخصوص اس طریقہ کی صحیح توضیح وتشریح دیتے ہیں جس طریقہ سے کہ چشموں

میں بارش کا پانی زمین میں آتا ہے۔

یہ آخری بیان یقیناً وہی ہے جو سورۃ ۳۹ کی آیت ۲۱ میں پیش ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح بارش کا پانی زمین کے منابع میں پہنچتا ہے۔

سورۃ ۲۴، آیت ۴۳ کا مضمون بارش اور ژالا ہے:۔

الم تر ان اللہ یزجی سحابا ثم یؤلف بینہ ثم یجعلہ رکاما فتری الودق یخرج من خللہ ج و ینزل من السمآء من جبال فیھا من برد فیصیب بہ من یشآء و یصرفہ عن من یشآء ط یکاد سنا برقہ یذھب بالابصار......

''کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں اور وہ آسمان سے ان پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بند ہیں اولے برساتا ہے پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچالیتا ہے اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے، رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے۔''

مندرجہ ذیل عبارت میں کسی قدر تشریح کی ضرورت ہے:۔

سورۃ ۵۶، آیت ۶۸ تا ۷۰:

افرء یتم الماء الذی تشربون.... ء انتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون.... لو نشآء جعلنہ اجاجا فلو لا تشکرون....

''کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا ہے کہ یہ پانی جو تم پیتے ہو، اسے تم نے بادلوں سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں، پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے۔''

اس حقیقت کا تذکرہ کہ خداوند قدوس میٹھے پانی کو کھارا بنا سکتا ہے اس کی قدرت کاملہ کے اظہار کا طریقہ ہے۔ اسی قدرت سے ہمیں آگاہ کرنے کا ایک اور ذریعہ انسان کے لیے وہ چیلنج ہے جو بارش کو بادلوں سے نازل کرنے کے سلسلہ میں کیا گیا ہے لیکن موجودہ زمانہ میں حرفیات (ٹیکنالوجی) نے مصنوعی طریقہ سے بارش برسانے کو یقیناً ممکن کر دکھایا ہے۔ کیا اس کی بنیاد پر کوئی شخص قرآن کے اس بیان کی تردید اس بات کی روشنی میں کر سکتا ہے کہ انسان میں ترشح کرنے کی قابلیت پیدا ہو گئی ہے؟

اس کا جواب نفی میں ہو گا۔ کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس میدان میں انسان کی کچھ مجبوریاں اور پابندیاں ہیں۔ فرانسیسی دفتر موسمیات کے ایک ماہر ایم اے فاسی نے بارش کے عنوان کے تحت انسائیکلوپیڈیا اونی ورسالیس میں حسب ذیل بیان تحریر کیا ہے۔ ''یہ بات کبھی بھی ممکن نہیں ہو سکے گی کہ کسی ایک بادل سے جس نے ابر مطیر کی مناسب خصوصیات حاصل نہ کر لی ہوں یا ابھی ارتقاء

کے مناسب مرحلہ پر نہ پہنچ گئے ہوں بارش برسائی جا سکے۔'' لہٰذا انسان اپنے حرفتی ذرائع کو کام میں لا کر اس صورت میں کبھی بھی عمل ترشح کو بسرعت انجام نہیں دے سکتا، جب تک کہ وہ شرائط جو قدرتی طور پر درکار ہیں وجود نہ ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کبھی بھی خشک سالی، جو واضح طور پر ہوتی رہتی ہے: عملاً رونما نہ ہوتی۔ اس لیے بارش اور خوشگوار موسم پر انسان کا اختیار اب بھی محض ایک خواب ہے۔ (۲)

انسان اپنی مرضی سے پانی کے اس قائم شدہ نظام کو شکست نہیں کر سکتا۔ جو قدرتی طور پر اس میں جاری ہے۔ مائیات کے جدید نظریات کے مطابق اس دور کا خاکہ حسب ذیل طریقہ پر پیش کیا جا سکتا ہے:۔

سورج کی کرنوں سے حاصل شدہ حرارے سمندر اور سطح ارض کے ان حصوں سے جو پانی سے ڈھکے ہوئے ہیں یا جن میں پانی جذب ہے، بخارات کو وجود میں لاتے ہیں۔ پانی کے ابخرات وجود میں آ کر بلند ہو کر کرۂ باد میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور عمل تکاثف سے بادلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہوائیں اپنا عمل دکھاتی ہیں اور اس طرح تشکیل شدہ بادلوں کو مختلف بلندیوں پر لے جاتی ہیں، پھر یا تو بادل بغیر بارش برسائے منتشر ہو جاتے ہیں یا اپنی جسامت کو دوسرے بادلوں کے ساتھ ملا کر زیادہ کثافت کا موجب ہوتے ہیں۔ یا پھر وہ ٹکڑیوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اور اپنے ارتقاء کے کسی مرحلہ میں بارش برسا دیتے ہیں (۳) جب بارش کا پانی سمندر میں پہنچتا ہے۔ (سطح زمین کا ۷۰ فیصد حصہ سمندروں سے ڈھکا ہوا ہے) تو اس دور کا اعادہ فوراً ہی ہونے لگتا ہے۔ جب بارش کا پانی زمین پر پڑتا ہے تو اس میں سے کچھ نباتات جذب کر لیتی ہے اور اس طرح اس کی بالیدگی

میں مدد ملتی ہے۔ نباتات اپنی باری سے پانی خارج کر دیتی ہے اور اس میں سے کچھ پانی پھر کرۂ باد کو واپس چلا جاتا ہے۔ باقی کم یا زیادہ مقدار میں زمین کے اندر جذب ہو جاتا ہے جہاں سے وہ یا تو گزرگاہوں سے ہو کر سمندروں میں چلا جاتا ہے۔ یا چشموں اور سوتوں سے سطح زمین پر واپس آ جاتا ہے۔

جب مائیات کی جدید معلومات کا موازنہ ان بیانات سے کیا جاتا ہے، جو قرآن کی متعدد آیات سے اس پیراگراف میں نقل کیے گئے ہیں تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے درمیان بڑی حد تک مطابقت ہے۔

سمندر:

جب کہ مذکور الصدر آیات قرآنی نے پانی کے قدرتی دور کے بارے میں جدید معلومات کے درمیان موازنہ کرنے کے لیے مواد فراہم کیا ہے۔ سمندروں کے سلسلہ میں ایسا نہیں ہے۔ قرآن میں کوئی ایک بیان بھی ایسا نہیں ہے۔ جس میں سمندروں کا مذکور ہو اور جو سائنسی معلومات کے ساتھ موازنہ کرنے کے لیے اسی طرح استعمال کیا جا سکے۔ تاہم اس سے اس بات کی ضرورت کم نہیں ہوتی کہ یہ بتا دیا جائے کہ قرآن کا کوئی بیان بھی جو سمندروں سے متعلق ہے، ان عقائد اساطیر یا توہمات کو حوالہ نہیں دیتا جو اس کے نزول کے وقت پھیلے ہوئے تھے۔

کچھ آیات ایسی ہیں جن میں سمندروں اور جہاز رانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ بطور غور و فکر کے موضوعات کے ان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار کیا گیا ہے جو

عام مشاہدہ شدہ حقائق سے مترشح ہے۔حسب ذیل آیات اس کی مثالیں ہیں۔

سورۃ ۱۴، آیت ۳۲:

و سخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ ط

''.....(اللہ نے) کشتی کو تمھارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے۔''

سورۃ ۱۶، آیت ۱۴:۔

و ھو الذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحما طریا و تستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونھا و تری الفلک مواخر فیہ ولتبتغوا من فضلہ و لعلکم تشکرون..

''اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تا کہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو، تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار رہو۔''

سورۃ ۳۱، آیت ۳۱:

الم تر ان الفلک تجری فی البحر بنعمت اللہ لیریکم من آیتہ ط ان فی ذلک لایت لکل صبار شکور...

''کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے

تاکہ وہ تمھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔''

سورۃ ۵۵، آیت ۲۴:

ولہ الجوار المنشئت فی البحر کالاعلام..

''اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح (نشانات بن کر) کھڑے ہوئے ہیں (اونچے اٹھے ہوئے ہیں)''

سورۃ ۳۶، آیت ۴۱تا۴۴:

وایة لھم انا حملنا ذریتھم فی الفلک المشحون... و خلقنا لھم من مثلہ ما یرکبون.. وہ ان نشأ نغرقھم فلا صریح لھم ولا ھم ینقذون... الا رحمة و متاعا الی حین..

''ان کے لیے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی (کشتی نوحؑ) میں سوار کردیا اور پھر ان کے لیے ویسی ہی کشتیاں اور پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں، ہم چاہیں تو ان کو غرق کردیں کوئی ان کی فریاد سننے والا کوئی نہ ہو اور کسی طرح یہ نہ بچائے جاسکیں۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انہیں پار لگاتی ہے اور ایک وقت خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقع دیتی ہے۔''

یہاں جو حوالہ دیا گیا ہے وہ صاف طور پر اس کشتی کا ہے جو سمندر پر انسان کو لیے پھرتی ہے بالکل اسی طرح جیسے عرصہ دراز پہلے حضرت نوحؑ کی کشتی اور ان کو

اوران دوسرے افراد کو جو اس میں سوار تھے لے کر چلی اور ان کو خشکی پر پہنچا دیا۔

سمندر سے متعلق ایک دوسرا واقعہ جو مشاہدہ میں آتا ہے اپنی غیر معمولی نوعیت کی وجہ سے قرآن کی ان آیات میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے جو آیتیں اس کے لیے وقف ہیں۔ تیس آیتیں ایسی ہیں جو ان بعض خصوصیات کا حوالہ دیتی ہیں جو بڑے دریاؤں میں جب وہ بہہ کر سمندر میں گرتے ہیں اس وقت مشترک ہوتی ہیں۔

یہ واقعہ نہایت عام ہے اور اکثر اس وقت مشاہدہ میں آتا ہے جب سمندر کا کھارا پانی دریا کے تازہ پانی میں ایک دم نہیں مل جاتا۔ قرآن میں اس چیز کا حوالہ پانی کی اس رو کے سلسلہ میں دیتا ہے جس کو دجلہ اور فرات کی اچھوری قرار دیا جاتا ہے۔ جہاں یہ دونوں دریا مل کر وہ چیز بناتے ہیں جس کو ۱۰۰ میل سے زیادہ طویل سمندر یعنی ''شط العرب'' کہا جا سکتا ہے۔ خلیج کے اندرونی حصوں میں مدوجزر کا اثر اس خوش آئند واقعہ کو جنم دیتا ہے جس سے تازہ پانی خشکی میں اندر تک چڑھ آتا ہے اور اس طرح یقینی طور پر مناسب آبیاری ہو جاتی ہے۔ متن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ جاننا پڑتا ہے کہ انگریزی کا لفظ ''سی'' (سمندر) عربی کے لفظ ''بحر'' کے عمومی مفہوم پر حاوی ہے جس کا پانی کے ایک بڑے ذخیرے پر اطلاق ہوتا ہے اور مساوی طور پر سمندر اور بڑے دریاؤں مثلاً نیل، دجلہ اور فرات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ذیل میں تین آیتیں درج کی جاتی ہیں جن میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ ۲۵، آیت ۵۳:

و هو الذی مرج البحرین هذا عذب فرات و هذا ملح اجاج ط و جعل بینهما برأخا و حجرا محجورا...

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے، ایک رکاوٹ ہے جو انہیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

سورۃ ۲۵، آیت ۱۲:

وما یستوی البحرن ذ هذا عذب فرات سائغ شرابه و هذا ملح اجاج ط و من کل تاکلون لحما طریا و تسخرجون حلیة تلبسونها ج

''اور پانی کے دو ذخیرے یکساں نہیں ہیں ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا ہے، پینے میں خوشگوار، اور دوسرا سخت کھاری کہ حلق چھیل دے مگر دونوں سے تم تروتازہ گوشت حاصل کرتے ہو، پہننے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو۔''

سورۃ ۵۵، آیات ۱۹۔۲۰ اور ۲۲:

مرج البحرین یلتقین بینهما برزخ لا یبغین ...یخرج منهما اللئولئو والمرجان.

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں اس پر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے .... ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔''

ایک خاص واقعہ کے بیان کے علاوہ، ان آیات میں ان اشیاء کا بھی حوالہ ہے جو میٹھے پانی اور سمندر کے شور سے حاصل ہو سکتی ہیں، مچھلیاں، زینت کا سامان یعنی مونگے اور موتی۔ اس واقعہ سے متعلق جس سے دریا کا پانی اچوری کے مقام پر سمندر کے پانی سے نہیں ملتا۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ بات دجلہ اور فرات ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے متن میں ان کا ذکر نام لے کر نہیں کیا گیا لیکن خیال ہے کہ اشارہ ان ہی کی طرف ہے۔ان دریاؤں کی بھی جو سمندر میں بہہ کر بہت آگے تک جاتے ہیں، یہی خصوصیت ہے جیسے مسی سپی اور یا ملگشی کیا نگ، ان کا میٹھا پانی سمندر کے کھارے پانی سے اس وقت تک مخلوط نہیں ہوتا جب تک کہ وہ بہت آگے تک سمندر میں نہ پہنچ جائیں۔

(ج) زمین کا ابھار (نشیب وفراز):

زمین کی ساخت انتہائی پیچیدہ ہے۔آج کل اس کو نہایت موٹے طریقے پر اس طور سے سمجھنا ممکن ہے کہ یہ ایک دبیز پرت سے بنی ہوئی ہے جس کا درجہ حرارت بہت بلند ہے، خصوصیت سے اس مرکزی حصہ (کرۃ الوزن) کا جہاں چٹانیں ہنوز پگھلی ہوئی حالت میں ہیں اور ایک سطحی پرت کا جو قشر ارض کہلاتا ہے اور جو ٹھوس اور ٹھنڈا ہے۔ یہ قشر بہت پتلا ہے اس کی دبازت کا اندازہ زیادہ سے زیادہ میلوں کی اکائیوں یا میلوں کی دہائیوں میں لگایا جاتا ہے لیکن زمین کا نصف قطر ۳۷۸۰ میل سے کچھ ہی زیادہ ہے۔اس طرح قشر (اوسطاً) زمین کے نصف

قطر کے سویں حصہ کو بھی ظاہر نہیں کرتا۔ یہ جو کچھ بھی ہے اس پوست پر ہے کہ تمام طبقات الارضی حوادث رونما ہوئے۔ ان حوادث کی ابتدا لہریوں کے پیدا ہونے سے ہوئی جنھوں نے کوہستانی سلسلوں کو جنم دیا۔ ان کی بناوٹ کو علم طبقات الارض میں جبال زائی (پہاڑوں کی ابتدا) کہا جاتا ہے۔ یہ عمل بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ زمین کے ابھار میں ترقی ہونے کے ساتھ جس سے پہاڑوں کی تشکیل ہوئی تھی قشر ارض اسی تناسب سے نیچے کی طرف دھنسا۔ اس عمل سے اس پرت میں ایک بنیاد قائم ہوئی جو اس کے نیچے بچھی ہوئی ہے۔

کرۂ ارض کی سطح پر سمندر اور خشکی کی تقسیم کی تاریخ حال ہی میں متعین کی گئی ہے اور وہ ابھی تک انتہائی جدید اور سب سے زیادہ جانے پہچانے ادوار کے لیے بھی بڑی حد تک نامکمل ہے۔ ممکن ہے سمندروں کے ظہور کو جن سے کرۂ آب کی تشکیل ہوئی ہے تقریباً پچاس کروڑ سال کا عرصہ ہوا ہے۔ غالباً ابتدائی دور کے اختتام پر تمام براعظم مل کر خشکی کا ایک ہی تودہ تھا جو انجام کار ٹوٹ کر حصوں میں بٹ گیا۔ علاوہ ازیں کچھ براعظم یا براعظموں کے حصے بحری منطقات میں پہاڑوں کی تشکیل سے ابھر کر معرض وجود میں آئے ہیں (یعنی شمالی اطلانٹکی براعظم اور یورپ کا کچھ حصہ)۔

جدید تصورات کے بموجب خشکی جو ابھر کر معرض وجود میں آئی اس کی تشکیل میں غالب جز کوہستانی سلسلوں میں تکمیل ہے۔ ابتدائی دور سے لے کر دور رابع تک، زمین کا ارتقاء جبال زائی حالتوں کے مطابق ان درجات میں منقسم ہے جن کی جماعت بندی اسی نام کے ادوار میں ہوئی ہے اس لیے کہ پہاڑی بلندیوں کی

تشکیل سمندر اور براعظموں کے مابین توازن قائم رکھنے کے لیے ایک ردعمل ہے۔ اس کی وجہ سے خشکی کے کچھ حصے غائب ہو گئے اور کچھ نمودار ہوئے اور کروڑوں سال میں اس عمل نے براعظموں اور بحر اعظموں کی سطحی تقسیم کو بدل کر رکھ دیا۔ فی الحال اول الذکر اس سیارے کی سطح کے محض تین دسویں حصہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔

اس طریقہ سے ان تغیرات کا جو گذشتہ کروڑوں سال میں ظہور پذیر ہوئے ایک بہت ہی کام چلاؤ سا خاکہ پیش کر دینا ممکن ہے۔

زمین کے ابھار کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن حکیم جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں صرف پہاڑوں کی تشکیل کا ذکر کرتا ہے۔ جدید نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ فی الحقیقت ان آیات کے بارے میں جو صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا اظہار کرتی ہیں زمین کی تشکیل کے لحاظ سے نہایت قلیل ہے جیسا کہ حسب ذیل آیات میں ہے:۔

سورۃ ۷۱، آیات ۱۹ تا ۲۰:

والله جعل لكم الارض بساطا... لتسلكوا منها سبلا فجاجا....

''اور اللہ نے زمین کو تمھارے لیے فرش کی طرح بچھایا ہے تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں پر چلو۔''

سورۃ ۵۱، آیت ۴۸:

والارض فرشنها فنعم المهدون....

''زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے

ہیں۔''

فرش جو بچھایا گیا ہے قشر ارض ہے جو ایک سخت خول ہے جس پر ہم رہ سکتے ہیں۔اس لیے کہ کرۂ ارض کے زیریں پرت نہایت گرم، رقیق اور کسی قسم کی حیات کے لیے بھی معاند و مخالف ہیں۔

قرآن میں وہ بیانات جن میں پہاڑوں کا حوالہ اور لہریوں کے حادثہ کے نتیجہ میں ان کے استحکام کا تذکرہ ہے نہایت اہم ہیں۔

سورۃ ۸۸، آیت ۱۹، ۲۰ سیاق عبارت میں منکرین کو بعض حوادث پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے جن میں:۔

..... والی الجبال کیف نصبت... والی الارض کیف سطحت.

۔۔۔۔۔''پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے ہیں؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے۔

مندرجہ ذیل آیات اس طریقے کی تفصیلات دیتی ہیں جس طریقہ سے کہ پہاڑوں کو زمین کے اندر مضبوطی سے جمایا گیا ہے۔

سورۃ ۷۸، آیت ۶، ۷:

الم نجعل الارض مھدا... و الجبال اوتادا...

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔''

جن میخوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کسی زمانہ میں کسی خیمہ کو زمین پر مضبوطی سے

جمانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔(اوتاد جمع ہے وتد کی)

موجودہ دور کے ماہرین ارضیات زمین کے لہریوں کو پہاڑوں کی بنیادیں بتاتے ہیں اور وہ اندازاً ایک میل سے تقریباً ۱۰ میل کی گہرائی تک گئی ہوئی ہیں۔ قشر ارض کا استحکام ان لہریوں کے حادثہ کا نتیجہ ہے۔

لہٰذا یہ بات حیرت خیز نہیں رہتی جب ہم قرآن کی بعض عبارتوں میں پہاڑوں کے متعلق اظہار رائے پاتے ہیں، جیسا کہ ذیل میں درج ہے۔

سورۃ ۷۹، آیت ۳۲:

والجبال ارسھا...

''اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے۔''

سورۃ ۳۱، آیت ۱۰:

والقی فی الارض رواسی ان تمیدبکم

''اس نے (خدا نے) زمین میں پہاڑ جما دیئے تا کہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔''

یہی محاورہ سورۃ ۱۶، آیت ۱۵ میں دہرایا گیا ہے اور یہی خیال بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے سورۃ ۲۱، آیت ۳۱ میں ظاہر کیا گیا ہے:

وجعلنا فی الارض رواسی ان تمیدبھم

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تا کہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔''

ان آیتوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ پہاڑوں کو اس طریقہ سے جمایا گیا

ہے کہ استحکام کا تیقن پیدا ہو گیا اور یہ بات ارضیاتی معلومات سے مکمل طور پر مطابقت رکھتی ہے۔

(د) زمین کا کرۂ باد:

کچھ ایسے بیانات کے علاوہ جو مخصوص طور آسمان کے ذکر سے متعلق ہیں جیسا کہ گذشتہ باب میں دیکھا گیا ہے، قرآن کریم میں متعدد آیات اس قسم کی شامل ہیں جن میں اس حادثہ کا تذکرہ ہے جو کرۂ باد میں رونما ہوتا رہتا ہے، جہاں تک کہ ان میں اور جدید سائنس کی معلومات میں موازنہ کا تعلق ہے یہاں اور مقامات کی طرح اس بات پر غور کیا جانا چاہیے کہ آج کل کی جدید سائنسی معلومات اور قرآن میں مذکور حوادث کے درمیان مطلق کوئی تضاد تناقص نہیں ہے۔

ارتفاع:

زیادہ بلندی پر جس بے چینی کا تجربہ ہوتا ہے اور جو بے چینی جس قدر اوپر جاتے ہیں اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ عام احساس سورۃ ٦ کی آیت ١٢٥ میں بیان کیا گیا ہے:

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ج

ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد

فی السمآء ط

"پس جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے اور اس کو ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا وہ آسمان کی طرف پرواز کر رہا ہے۔"

بعض شارحین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ زیادہ بلندی پر بے چینی کا تصور حضرت محمد ﷺ کے زمانہ کے عربوں میں نہیں تھا۔ یہ دعویٰ قطعی طور پر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جزیرہ نمائے عرب میں ایسی چوٹیوں کو وجود جو دو میل سے زیادہ بلند ہیں اس دعویٰ کو انتہائی نامعقول بنا دیتا ہے کہ وہ لوگ زیادہ بلندی (۴) پر سانس لینے کی دشواری کو نہیں جانتے تھے۔ کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جن کو اس آیت میں خلا کی تسخیر کی پیشین گوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی رائے ہے جو کم از کم ایسے عبارت میں منطقی طور پر انکار کی طالب نظر آتی ہے۔

کرۂ باد میں بجلی:

کرۂ باد میں بجلی اور اس کے نتائج یعنی کوندہ اور ژالہ باری کا حوالہ حسب ذیل آیات میں دیا گیا ہے۔

سورۃ ۱۳، آیت ۱۲، ۱۳:

هو الذي يريكم البرق خوفا و طمعا و ينشى ء

السحاب الثقال... و يسبح الرعد بحمده والملئكة من خيفته ج و يرسل الصواعق فيصيب بها من يشآء و هم يجادلون فی الله ط و هو شديد المحال...

"وہی (خدا) ہے جو تمھارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے جنھیں دیکھ کر تمھیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں امیدیں بھی بندھتی ہیں۔ وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے۔ بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں وہ کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے اور بسا اوقات انھیں جس پر چاہتا ہے عین اس حالت میں گرا دیتا ہے کہ لوگ ان کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ فی الواقع اس کی چال بڑی زبردست ہے۔"

سورۃ ۲۴، آیت ۴۳:

الم تر ان الله يزجي سحابا ثم يؤلف بينه ثم يجعله ركاما فترى الودق يخرج من خلله ج و ينزل من السمآء من جبال فيها من برد فيصيب به من يشآء و يصرفه عمن يشآء ط يكاد سنا برقه يذهب بالابصار...

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑ دیتا ہے پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے

آتے ہیں۔ اور وہ آسمان سے ان پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں اولے برساتا ہے(۵) پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچالیتا ہے، ان کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔"

ان دو آیتوں میں گہرے ابر ہائے مطیر یا ابر ہائے ژالہ و برق کی تشکیل کے مابین واضح تعلق کا اظہار کیا گیا ہے۔ اول الذکر اندیشے لاحق ہونے اور امیدیں بندھنے کا موجب ہوتے ہیں اس لیے کہ ان سے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور موخر الذکر خوف و دہشت کا سبب ہوتا ہے کیونکہ جب وہ صاعقہ بن کر گرتا ہے تو یہ سب بحکم خداوندی ہوتا ہے۔ ان دونوں حادثوں کے درمیان تعلق کی تصدیق کرۂ باد میں موجود بجلی کی جدید دور کی معلومات سے ہوتی ہے۔

پرچھائیاں (سائے):

پرچھائیوں کا واقعہ اور ی حقیقت کہ وہ حرکت کرتی ہیں آج کل اس سب کی تشریح بہت آسان ہے۔ یہ حسب ذیل مشاہدات کا موضوع ہے:

سورۃ ۱۶، آیت ۸۱:

والله جعل لکم مما خلق ظللا..........

"اس نے (خدا نے) اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں سے تمھارے لیے سائے کا انتظام کیا۔"

سورۃ ۱۶، آیت ۴۸:

اولم یروا الی ما خلق اللہ من شیی ء یتفقیؤا ظللہ عن الیمین و الشمآئل سجد للہ و ھم دخرون....

''اور کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے دائیں اور بائیں کو گرتا ہے۔ سب اس طرح اظہار عجز کر رہے ہیں۔''

سورۃ ۲۵، آیات ۴۵،۴۶:

الم تر الی ربک کیف مدالظل ج ولو شآء لجعلہ ساکنا ج ثم جعلنا الشمس علیہ دلیلا... ثم قبضنہ الینا قبضا یسیرا..

''تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔ پھر جیسے جیسے سورج اٹھتا جاتا ہے ہم اس سایہ کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔''

خدا کے آگے اس کی تمام مخلوقات بشمول ان کے سایوں کے عجز و انکسار کی مختلف صورتوں سے الگ اور اس حقیقت سے جداگانہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی قوت کے جملہ مظاہر کو جس طرح وہ چاہتا ہے واپس لے سکتا ہے، قرآن کریم سورج اور سایوں کے درمیان تعلق کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس موقع پر یہ حقیقت ذہن میں رہنی چاہیے کہ حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ سایہ جب چلتا ہے تو وہ کس طرح سورج کی مشرق سے مغرب کی جانب حرکت سے متاثر ہوتا ہے اسی

اصول کو طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے درمیان وقت معلوم کرنے کے سلسلہ میں دھوپ گھڑی کی صورت میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس مثال میں قرآن مجید اس تشریح کا حوالہ دیئے بغیر جو نزول کے وقت رائج تھی اس واقعہ کا ذکر کر دیتا ہے۔ اس کو صدیوں بعد تک وہ لوگ فوری طور پر تسلیم کر لیتے جو حضرت محمد ﷺ کے بعد ہوئے لیکن انجام کار وہ غلط ثابت ہو جاتی۔ قرآن صرف اس عمل کا ذکر کر دیتا ہے جو سورج سایہ کے ظاہر کرنے والے کی حیثیت سے انجام دیتا ہے۔ بظاہر اس طریقہ کے، جس طرح قرآن میں سایہ کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد جو کچھ ہم دور جدید میں اس واقعہ کے متعلق جانتے ہیں، درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

حواشی

۱۔ جہاں کہیں بھی قرآن کریم میں ''ہم'' یا ''ہم نے'' استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد خداوند کریم ہے۔

۲۔ ہمارے نزدیک اس صراحت کی بھی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ قرآن کریم میں اس بات کی نفی نہیں کی گئی ہے کہ انسان کبھی بھی ترشح کا عمل خواہ وہ کسی پیمانہ پر ہو انجام نہیں دے سکے گا بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ عام طور پر جو پانی تم پیتے ہو ان کو قدرتی طور پر بنانے والے بادلوں سے ہم برساتے ہیں تم نہیں برساتے اور نہ برسا سکتے ہو۔

۳۔ بادلوں کی دس بڑی بڑی قسمیں کی گئی ہیں ان میں سے تین قسم کے بادل کافی بلندی پر ہوتے ہیں۔ دو قسم کے متوسط بلندی پر اور تین قسم کے نہایت کم بلندی پر۔ دو قسمیں ایسی ہیں جو نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہیں اور ان کی بلندی بعض اوقات کئی کئی میل کی ہوتی ہے اوپر کے بادلوں میں اتنی ٹھنڈ ہوتی ہے کہ پانی کے ابخرات منجمد ہو کر برف کے تراشے بن جاتے ہیں۔ اس لیے ان سے بارش ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ متوسط بادلوں میں سے ایک قسم اور زیریں بادلوں میں دو قسمیں ایسی ہیں جن سے بارش کا امکان ہوتا ہے۔ ان میں بھی زیریں قسم کے بادل اسٹریٹس (ابر مطیر یا سحاب باراں) بارش کے لیے مخصوص ہیں اوپر کی طرف بڑھنے والے

بادلوں میں کیومولونمبس سے گرج چمک اور ژالہ باری ہوتی ہے، سحاب باراں کے ٹکڑے معصرات (بدلیاں) کہلاتے ہیں وہ بھی بارش برساتے ہیں۔(مترجم)

۴۔ یمن کے دارالحکومت صنعاء میں حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں آبادی تھی، اس شہر کی بلندی سطح سمندر سے ۷۰۰۰ فٹ کے قریب ہے۔

۵۔ جن بادلوں سے اولے پڑتے ہیں ان کا پھیلاؤ نیچے سے اوپر کی طرف ہوتا ہے، یہ بادل کیومولونمبس کہلائے ہیں ان کی بلندی بعض اوقات کوہ ایورسٹ سے بھی زیادہ ہوتی ہے جب یہ سر کے اوپر ہوتے ہیں تو اپنی دبازت کی وجہ سے سیاہ دکھائی دیتے ہیں اور جب افق پر ہوتے ہیں تو بلند پہاڑ معلوم ہوتے ہیں جو دوش ہوا پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں غالباً پہاڑوں سے ان ہی پہاڑ نما بادلوں کی طرف اشارہ ہے۔(مترجم)

باب ششم

عالم حیوانی اور عالم نبات

بہت سی وہ آیات جن میں حیات کی ابتداء کا ذکر ہے اس باب میں جمع کر دی گئی ہیں، ساتھ ہی عالم نبات کے بعض پہلوؤں اور عالم حیوانی سے متعلق عمومی یا خصوصی عنوانات پر بحث کی گئی ہے الکتاب میں منتشر آیات کی جماعت بندی سے اس پوری معلومات کا ایک عمومی تصور سامنے آ جاتا ہے۔ جو ان موضوعات سے متعلق قرآن کریم میں شامل ہے۔

اس باب میں آئندہ باب کے موضوع کے سلسلہ میں قرآنی متن کا تجزیہ لغات کی بعض مشکلات کے سبب خصوصیت سے کسی قدر رنزاکت اختیار کر گیا ہے۔ ان مشکلات پر اس حقیقت کو کام میں لا کر قابو پایا گیا ہے کہ وہ سائنسی معلومات جس سے اس موضوع پر روشنی پڑتی ہے، زیر غور لائی گئی ہے۔ ذی روح اشیاء یعنی حیوان، نباتات اور انسان کے سلسلہ میں خصوصیت سے ایسا کیا گیا ہے، جہاں قرآن میں شامل ان عنوانات پر بعض بیانات کے مفہوم کی تلاش میں سائنس کی تعلیمات کے ساتھ ایک گونہ مقابلے کا ہونا ناگزیر بتایا گیا ہے۔

یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قرآن کی ان عبارتوں کے متعدد ترجمے جو علماء نے کیے ہیں، سائنسدانوں کو غلط معلوم ہوں گے۔ یہی بات ان تفاسیر پر بھی صادق آتی ہے، جو ان حضرات نے کی ہیں جن کو وہ سائنسی معلومات حاصل نہیں

تھیں، جو متن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

(الف) حیات کی ابتداء:

اس سوال نے انسان کو خود اپنی خاطر اور ان ذی روح اشیاء کی خاطر جو اس کو گھیرے ہوئے ہیں ہمیشہ سے الجھائے رکھا ہے، یہاں اس چیز کا عام نقطہ نظر سے جائزہ کیا جائے گا، انسان کے مسئلہ کو، جس کے زمین پر ظہور اور افزائش نسل کے عوامل، تفصیلی بحث کے موضوع ہیں، آئندہ باب میں بیان کیا جائے گا۔

جب قرآن کریم میں حیات کی ابتداء کے موضوع کو نہایت وسیع پیانہ پر بیان کیا جاتا ہے، تو یہ بیان بے انتہا مختصر ہوتا ہے۔ یہ بات اس کی ایک آیت میں ہوئی ہے جس میں کائنات کی تشکیل کے عمل کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کو پہلے ہی دہرایا گیا اور اس کی تشریح کی گئی ہے۔

سورۃ ۲۱، آیت ۳۰:۔

اولم یرالذین کفروا ان السموت والارض کانتا رتقا ففتقنھما ط و جعلنا من المآء کل شیء حی ط افلا یؤمنون.

"کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے۔ غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی، کیا وہ (ہماری اس

اخلاق کو) نہیں مانتے؟‘‘

کسی چیز کو کسی چیز سے نکالنے اور جدا کرنے کا تصور شکوک وشبہات کا موجب نہیں ہوتا۔ اس فقرہ کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ ہر زندہ چیز پانی سے بنائی گئی ہے (جو اس چیز کا لازمی عنصر ہے) یا ہر جاندار شے کی ابتداء پانی میں ہوئی ہے۔ یہ دونوں امکانی مفہوم سائنسی معلومات سے کلی طور پر مطابقت رکھتے ہیں، حیات کی ابتداء فی الحقیقت مائی ہے اور پانی تمام جاندار خلیات کا جزو اعظم ہے پانی کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہے۔ جب کسی دوسرے سیارے پر حیات کے امکان پر بحث کی جاتی ہے تو پہلا سوال ہمیشہ یہ ہوتا ہے، کیا وہاں حیات کو قائم رکھنے کے لیے کافی مقدار میں پانی موجود ہے؟

موجود معلومات ہمیں اس بات پر غور کرنے کی طرف مائل کرتی ہے کہ قدیم ترین جاندار شے کا تعلق یقیناً عالم نبات سے ہوگا، سمندری کائی کا سراغ ماقبل کیمبرین دور سے ملا ہے یعنی اس زمانہ سے جو قدیم ترین معلوم سرزمینوں کا دور ہے۔ نامیاتی اشیاء جن کا تعلق عالم حیوانی سے ہے غالباً کسی قدر بعد میں ظہور پذیر ہوئیں، ان کا وجود بھی سمندر سے ہوا۔

یہاں جس لفظ کا ترجمہ ’’پانی‘‘ کیا گیا ہے وہ ’’ماء‘‘ ہے جس سے مراد آسمان سے برسا ہوا پانی اور سمندری پانی دونوں ہوسکتی ہے۔ اس پر مستزاد کسی نوع کی رقیق چیز ہوسکتی ہے، پہلے معنوں میں پانی وہ عنصر ہے جو تمام نباتاتی زندگی کے لیے ضروری ہے۔

سورۃ ۲۰، آیت ۵۳:۔

الـذی جـعـل لـکم الارض مهدا و سلک لکم فیها
سبـلا و انـزل مـن السمـآء مآء ط فاخرجنا به ازواجا من
نبات شتی..

”وہی (خدا) ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا اور اس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے اور اوپر سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔“

عالم نبات میں جوڑے کے تصور کا یہ پہلا حوالہ ہے، ہم بعد میں اس کی جانب مراجعت کریں گے۔ دوسرے معنوں میں ایک سیال شے بغیر کسی مزید اشارے کے کہ اس کی نوعیت کیا ہے، یہ لفظ اپنی غیر معین شکل میں یہ صراحت کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے کہ تمام حیواناتی زندگی کی تشکیل کی بنیاد کیا ہے۔

سورۃ ۲۴، آیت ۴۵:۔

واللہ خلق کل دآبۃ من مآء ط

”اور اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا۔“

ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ یہ لفظ مادۂ منویہ (۱) کے لیے بھی **مستعمل** ہے۔

لہٰذا خواہ اس سے عمومی طور پر زندگی کی ابتداء سے بحث کی جائے یا وہ عنصر مراد ہو جو پودوں کو مٹی میں جنم دیتا ہے۔ یا حیوانات کا تخم سمجھا جائے۔ قرآن میں شامل حیات کی ابتداء کے تمام بیانات جدید سائنسی معلومات سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں زندگی کی ابتداء سے متعلق جو اساطیر نزول قرآن کے وقت عام طور پر رائج تھے ان میں سے کوئی بھی قرآن کے متن میں مذکور نہیں ہیں۔

(ب) عالم نبات:

قرآن میں موجود ایسی متعدد آیات کو بالکلیہ نقل کر دینا ممکن نہیں ہے جن میں بارش کے اثر سے متعلق اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت کا حوالہ دیا گیا ہے جو نباتات کی بالیدگی کی موجب ہوتی ہے۔ اس موضوع پر یہاں تین آیات پیش ہیں۔

سورۃ ۱۶، آیت ۱۰، ۱۱:۔

هو الذی انزل من السمآء مآء لکم شراب و منه شجر فیه تسیمون۔۔ ینبت لکم به الزرع و الزیتون والنخیل و الاعناب ومن کل الثمرات ط

"وہی (خدا) ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعے سے کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔"

سورۃ ۶، آیت ۹۹:۔

و هو الذی انزل من السمآء مآء ج فاخرجنا به نبات کل شیء فاخرجنا منه خضرا نخرج منه حبا متراکبا ج ومن النخل من طلعها قنوان دانیة و جنت من اعناب والزیتون والرمان مشتبها و غیر متشابه ط

انـظـرو الـی ثـمـره اذا اثمر و ینعه ط ان فی ذلکم لایت لقوم یومنون..

''اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔پھراس کے ذریعہ سے ہر قسم کی نباتات اگائی پھر اس سے ہرے بھرے کھیت اور درخت پیدا کیے۔پھر اس سے تہ بر تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں، یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان کے پھل آئے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت پر ذرا غور کی نظر سے دیکھو، ان کی نشانیاں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔''

سورۃ ۵۰، آیات ۹ تا۱۱:۔

و نـزلـنـا من السمآء مآء مبرکا فانبتنا به جنت وحب الـحـصـیـد. والنخل بسقت لها طلع نضید.. رزقا للعباد لا واحیینا به بلدة میتا ط کذلک الخروج...

''اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی نازل فرمایا پھر اس سے باغ اور فصل کے غلے اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بہ تہ لگتے ہیں یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے

ہیں (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے نکلنا بھی اسی طرح ہوگا۔)‘‘

قرآن ان عام معلومات پر دوسری ایسی باتوں کا اضافہ کرتا ہے جن میں زیادہ خصوصی مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔

عالم نبات میں توازن:

سورۃ ۱۵، آیت ۱۹:۔

والارض مددنها والقينا فيها رواسى وانبتنا فيها من كل شيء موزون.....

’’ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ جمائے اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائی۔‘‘

متعدد غذاؤں کی مختلف مقداریں:

سورۃ ۱۳، آیت ۴:۔

وفى الارض قطع متجورت و جنت من اعناب وزرع و نخيل صنوان و غير صنوان يسقى بمآء واحد قف و نفضل بعضها على بعض فى الاكل ط ان فى ذلك لايت لقوم يعقلون...

’’اور دیکھو زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک

دوسرے سے متصل واقع ہیں۔ انگور کے باغ ہیں کھیتیاں ہیں کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے، سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کمتر۔ ان سب چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

ان آیات کی موجودگی پر غور کرنا اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ ان سے مستعمل مصطلحات کی سنجیدہ نوعیت ظاہر ہوتی ہے اور ساتھ ہی کسی ایسے بیان کے فقدان کا بھی پتہ چلتا ہے جو اس دور کے عقائد کو بنیادی حقائق کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں کر کے پیش کرے۔ لیکن جو بات خصوصیت سے ہماری توجہ کو اپنی جانب مبذول کرے وہ قرآن مجید کے وہ بیانات ہیں جن کا تعلق عالم نبات میں افزائش نسل ہے۔

عالم نبات میں افزائش نسل:

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عالم نبات میں افزائش نسل کے دو طریقے ہیں ایک جنسی دوسرا غیر جنسی۔ ان میں صرف پہلا طریقہ ایسا ہے جو افزائش نسل کی اصطلاح کا فی الحقیقت مستحق ہے۔ کیونکہ اسی سے ایک ایسے حیات عمل کا تعین ہوتا ہے جس کا مقصد اس پودے کے مقابلہ میں جس سے یہ پیدا ہوا ہے ایک جدید منفرد وجود کا اظہار ہے۔

غیر جنسی افزائش نسل بالکل سادہ طریقہ پر تعداد میں اضافہ کا نام ہے۔ یہ ایک نامیاتی وجود کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتا ہے جو اصل پودے سے جدا ہو گیا ہو۔ اور اس طریقہ سے ترقی پا گیا ہو کہ وہ پھر اسی پودے سے واصل ہو جائے جس سے وہ نکلا تھا۔ گلیر مونڈ اور مینگو کے نزدیک یہ بالیدگی کی ایک مخصوص کیفیت ہے۔ اس کی ایک سادہ سی مثال قلم لینا ہے۔ کسی پودے سے قلم لے کر اس کو موزوں پانی میں نم مٹی کے اندر لگا دیا جاتا ہے اور نئی جڑیں نکل آنے سے وہ پھر جم جاتا ہے۔ بعض پودوں کے نامیاتی اجزاء خصوصیت سے اسی مقصد کے لیے وضع ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے ہوتے ہیں جن میں کلے پھوٹتے ہیں اور ان کا عمل وہی تخم جیسا ہوتا ہے (یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تخم جنسی افزائش نسل کے عمل کے نتائج ہیں)

عالم نبات میں جنسی افزائش نسل ایک ہی پودے پر نر اور مادہ کے ملاپ سے جنسی تشکیل کے ذریعہ عمل میں آتی ہے یا جداگانہ پودوں پر قائم ہو جاتی ہے۔ صرف یہی وہ وجہ ہے جس کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے۔

سورۃ ۲۰، آیت ۵۳۔

وانزل من السمآء مآء ط فاخرجنا به ازواجا من نبات شتي...

''اور (اللہ ہی وہ ذات ہے) جس نے آسمانوں سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے سے مختلف نباتات کے جوڑے پیدا کیے۔''

''جوڑے میں سے'' ایک ترجمہ ہے زوج کا (جس کی جمع ازواج ہے) جس

کے ابتدائی معنی ہیں ''وہ شے جو ایک دوسری شے کے ساتھ مل کر ایک جوڑا بنائے۔'' یہ لفظ بالکل اسی طرح ایک شادی شدہ جوڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے جس طرح جوتوں کے ایک جوڑے کے لیے۔

سورۃ ۲۲، آیت ۵:۔

وتری الارض هامدة فاذآ انزلنا عليها المآء اهتزت وربت وانبتت من كل زوج م بهيج....

''اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ بھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی۔''

سورۃ ۳۱، آیت ۱۰:

فانبتنا فيها من كل زوج كريم....

''پس ہم نے زمین میں پودوں اور نباتات کے اچھے جوڑے اگائے۔''

سورۃ ۱۳، آیت ۳:۔

ومن كل الثمرات جعل فيها زوجين اثنين

''اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔''

ہمیں معلوم ہے کہ پھل ان اعلیٰ درجہ کے پودوں کی افزائش نسل کے عمل میں آخری حاصل ہے جن کے نظام انتہائی ترقی یافتہ اور پیچیدہ ہے۔ پھل سے قبل کا درجہ پھول کا ہے جس میں نر اور مادہ دونوں کے اعضاء (حاصل زر اور بیضہ)

ہوتے ہیں۔آخر الذکر میں اگر ایک مرتبہ تخم اُگ گیا تو وہ بارآور ہوجاتا ہے جو اپنی باری سے بڑھتا اور تخم پیدا کرتا ہے۔لہذا تمام پھل نر اور مادہ کے اعضاء کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔قرآن میں جو آیت دی گئی ہے اس کا یہی مفہوم ہے۔

یہ بات ذہن نشین کرنی پڑے گی کہ بعض اقسام میں غیر بارآور پھولوں سے بھی پھل پیدا ہوسکتا ہے۔(خودزا پھل...) مثلاً کیلا۔کئی قسم کے اناس، انجیر، سنترے اور انگور، اس کے باوجود وہ ان پودوں سے حاصل ہوسکتے ہیں جن میں واضح طور پر جنسی خصوصیات ہوتی ہیں۔

افزائش نسل کے عمل کی آخری شکل تخم کے نمونہ کے ساتھ اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ایک مرتبہ اس کا بیرونی خول شق ہوجاتا ہے۔(بعض اوقات یہ تخم ایک گٹھلی میں بند ہوتا ہے)اس اشقاق سے جڑیں باہر نکل آتی ہیں جو مٹی سے وہ تمام چیزیں جذب کرلیتی ہیں جو پودے کی سست رفتار زندگی کے لیے ایک تخم کی حیثیت سے ضروری ہوتی ہیں جب کہ یہ تخم بڑھتا اور ایک نئے پودے کو جنم دیتا ہے۔

قرآن کی ایک آیت نمو کے اس عمل کا اس طرح حوالہ دیتی ہے۔

سورۃ ۶، آیت ۹۵:۔

ان اللہ فالق الحب والنوی ط

"تحقیق کہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔"

قرآن کرم اکثر عالم نبات میں ایک جوڑے کے ان اجزائے ترکیبی کے وجود کا اظہار کرتا ہے اور ایک عمومی سیاق کے ساتھ بغیر کسی حصر کے ایک جوڑے (زوج) کا تصور پیش کردیتا ہے۔

سورة ۳٦، آیت ۳٦:۔

سبحان الذی خلق الازواج کلها مما تنبت الارض ومن انفسهم و مما لا یعلمون....

"پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (نوع انسانی) میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔"

ان اشیاء کے معنوں کے متعلق جو حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں لوگ نہیں جانتے تھے بہت سے مفروضے قائم کیے جا سکتے ہیں آج ہم ان چیزوں کے ڈھانچوں یا مزدوج عملوں کے مابین امتیاز کر سکتے ہیں۔ جو ذی روح اور غیر ذی روح اشیاء میں بے انتہا چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لگا کر بے حد بڑی چیزوں تک چلی گئی ہیں۔ اصل نکتہ جو ان واضح طور پر بیان کردہ تصورات کو یاد رکھنے اور ایک مرتبہ پھر ذہن نشین کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ وہ جدید سائنس سے کلی طور پر مطابقت رکھتے ہیں۔

(ج) عالم حیوانی:۔

قرآن مجید میں عالم حیوانی سے متعلق متعدد سوالات ہیں جو ایسی تشریحات کے موضوع ہیں جن کا جدید سائنسی معلومات سے مقابلہ و موازنہ ہوتا ہے لیکن اگر اس اقتباس جیسی جو آئندہ دیا جاتا ہے اس موقع پر کوئی عبارت چھوڑ دی جائے تو

پھر قرآن میں اس مضمون کے متعلق جتنا کچھ شامل ہے اس کا ایک نامکمل تصور ہی حاصل ہوتا ہے اس عبارت میں عالم حیوانی میں پائے جانے والے کچھ عناصر کی تخلیق اس غرض سے بیان کی گئی ہے کہ انسان اللہ تعالٰی کے اس فضل و کرم پر غور کرے۔ جو خداوند قدوس نے اس پر کیا ہے۔ یہ عبارت بنیادی طور پر اس طریقہ کی مثال پیش کرنے کے لیے نقل کی گئی ہے جس طریقہ سے قرآن انسانی ضروریات کے مطابق تخلیق کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ یہ خصوصیت سے ان لوگوں کے معاملہ کو بیان کرتا ہے۔ جو دیہاتی ماحول میں رہتے ہیں اس لیے کہ کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا جائزہ کسی اور نقطہ نظر سے لیا جا سکتا ہو۔

سورۃ ۱۶، آیت ۵ _ ۸:

والانعام خلقھا لکم فیھا دف ء و منافع و منھا تاکلون.. ولکم فیھا جمال حین تریحون و حین تسرحون... و تحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بلغیه الا بشق الانفس ط ان ربکم لرء وف رحیم... والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینة ط و یخلق مالا تعلمون....

اس نے جانور پیدا کیے جن میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی اس میں تمہارے لیے جمال ہے۔ جب کہ تم صبح کے وقت انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو اور جبکہ

شام کے وقت انہیں واپس لاتے ہو۔ وہ تمھارے لیے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔ اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔ وہ اور بہت سی چیزیں تمہارے فائدے کے لیے پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک نہیں ہے۔"

ان عام کیفیات کے ساتھ ساتھ قرآن کریم انتہائی متنوع مضامین پر بعض معلومات فراہم کرتا ہے۔

۔۔۔۔۔عالم حیوانی میں افزائش نسل۔۔۔۔۔۔۔حیوانی برادریوں کے وجود کا ذکر۔۔۔۔۔ایسے بیانات جو شہد کی مکھیوں، مکڑیوں اور پرندوں سے متعلق ہیں ۔۔۔۔۔جانوروں کے دودھ کے اجزائے ترکیبی کے ذریعہ پر ملاحظات اور آراء

ا۔ عالم حیوانی میں افزائش نسل:

اس کو بڑے اختصار کے ساتھ سورۃ ۵۲ کی آیات ۴۵ اور ۴۶ میں بیان کیا گیا ہے۔

وانہ خلق الزوجین الذکر والنثی.. من نطفۃ اذا تمنی..

"اور یہ کہ اس نے نر اور مادہ کو جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی

جاتی ہے۔''

جوڑا (زوج) وہی لفظ ہے جس سے ہمیں پہلے ہی آیتوں میں سابقہ پڑ چکا ہے جن میں عالم نبات میں افزائش نسل کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ یہاں جنسوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیل جو مطلقاً قابل ذکر ہے۔ وہ وضاحت ہے جس سے اس امر کا اظہار کیا گیا کہ رقیق شے کی نہایت قلیل مقدار افزائش نسل کے لیے درکار ہوتی ہے۔ خود لفظ ''نطفہ'' استعمال کیا گیا ہے جو اس رقیق شے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس قول کی موزونیت پر آئندہ باب میں صراحت پیش کی جائے گی۔

۲۔ حیوانی برادری کے وجود کا ذکر:

سورۃ ٦، آیت ٣٨:۔

وما من دآبة فی الارض ولا طٰئر یطیر بجناحیه الا امم امثالکم ط ما فرطنا فی الکتاب من شیء ثم الی ربهم یحشرون...

''زمین پر چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب تمہاری ہی طرح کے انواع ہیں ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑ دی۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمٹے جاتے ہیں۔''

اس آیت میں کئی نکات ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔ اولاً یہ بات ظاہر

ہو گی کہ اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ بعد مرنے کے جانوروں کے ساتھ کیا پیش آتا ہے۔ بظاہر اس معاملہ میں اسلام میں کوئی اصول متعین نہیں ہے۔ اس کے بعد عمومی طور پر تقدیر کا مسئلہ ہے (۲) جس کا یہاں ذکر کیا جائے گا اس کو مطلقاً جبر سمجھا جائے یا اضافی طور پر یعنی اجسام اور ایک باضابطہ نظام تک محدود رکھا جائے جو ایک خاص طرز عمل پر منحصر ہو۔ حیوان مختلف خارجی مہیجات اور تحریکات کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔ جو مخصوص حالت کے تابع ہوتی ہیں۔

بلاشیر کا کہنا ہے کہ ایک قدیم مفسر جیسے رازی (امام فخر الدین رازی) کا خیال تھا کہ یہ آیت محض جبلی افعال کی جانب اشارہ کرتی ہے جو یہ ہے کہ جانور خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ شیخ ابوبکر حمزہ اپنے ترجمہ قرآن کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اس جبلت کا ذکر کرتے ہیں جو حکمت ربانی کے بموجب جملہ اشیاء کو جماعتوں کی شکل میں اس طرح آگے کی جانب دھکیلتی ہے کہ ان کا ہر فرد سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ تمام جماعت کی خدمت انجام دے۔

قریبی دہ سالوں میں حیوانی طرز عمل کا بغور جائزہ لیا جا چکا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حقیقی طور پر حیوانی برادریاں وجود رکھتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ یقیناً طویل عرصہ تک ایک جماعت یا برادری کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے نتیجہ میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ برادری کی تنظیمیں قائم ہیں۔ لیکن حال ہی میں ایسا ہوا ہے کہ اس نوع کی کسی تنظیم کے لیے جس نظام کی کارفرمائی ہے وہ صرف چند انواع میں دریافت ہوئی ہے۔ جس معاملہ کا سب سے زیادہ مطالعہ کیا گیا ہے اور جس کے بارے میں سب سے زیادہ واقفیت ہے وہ شہد کی مکھی کا معاملہ ہے جس کے طرز عمل

اور کارگزاری سے فان فریش لارنیز اور ٹمبرگین نے اس شعبہ میں جو کام کیا اس کے لیے انہیں ۱۹۷۳ء میں نوبل انعام ملا تھا۔

۳۔ایسے بیانات جو شہد کی مکھیوں ،مکڑیوں اور پرندوں سے متعلق ہیں:

جب اعصابی نظام کے ماہرین اس انوکھی تنظیم کی نمایاں مثالیں فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ جو حیوانی رویہ اور طرز عمل میں رہنمائی کرتی ہے تو اس میں امکانی طور پر جن جانوروں کا زیادہ حوالہ دیا جاتا ہے وہ شہد کی مکھیاں، مکڑیاں اور پرندے (بالخصوص موسمی پرندے) ہیں۔ بات خواہ کچھ ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تینوں جماعتیں ایک انتہائی ترقی یافتہ تنظیم کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

یہ حقیقت کہ قرآن کا متن عالم حیوانی میں اس مثالی تکڑی کا حوالہ دیتا ہے اس غیر معمولی دلچسپ طرز عمل کے ساتھ مطلقاً مطابقت رکھتی ہے جو ان جانوروں میں سے ہر ایک سائنسی نقطہ نظر اختیار کرتا ہے۔

شہد کی مکھیاں:

قرآن مجید میں شہد کی مکھیاں سب سے طویل تفسیر و تشریح کا موضوع ہیں۔

سورۃ ۱۶، آیات ۶۸ اور ۶۹:۔(۳)

و اوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال

بیوتا و من الشجر و مما یعرشون ... ثم کلی من کل الثمرات فاسلکی سبل ربک ذللا ط یخرج من بطونها شراب مختلف الوانه فیه شفآء للناس ط

''اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹہنیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔''

یہ جاننا اس وقت مشکل ہے کہ ''اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتے رہنے'' کا صحیح مفہوم کیا ہے، جب تک کہ اس کو عام اصطلاحوں میں نہ سمجھا جائے۔ ان کے طرز عمل سے حاصل شدہ معلومات کے سلسلہ میں وہ سب کچھ جو کہا جا سکتا ہے یہ ہے کہ یہاں ۔۔۔۔ جیسا کہ ان تین جانوروں میں سے جن کو بطور مثال قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر ایک کے معاملہ میں ۔۔۔۔ ایک عجیب و غریب اعصابی نظام ان کے رویہ اور طرز عمل کو سہارا دے رہا اور چلا رہا ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ شہد کی مکھی کے ناچ کا ڈھنگ دوسری مکھیوں کی جانب خبر رسانی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ اس طریقہ سے شہد کی مکھیاں اپنی ہی نوع کو ہدایت اور ان پھولوں کے فاصلہ کے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں جن سے رس جمع کرنا ہوتا ہے۔ فان فریش نے اس سلسلہ میں جو تحریر کیا ہے وہ اس مخلوق کی اس نقل و حرکت کے مفہوم کو واضح کر دیتا ہے جس کا مقصد مزدور مکھیوں کے درمیان

خبریں منتقل کرنا ہے۔

مکڑیاں:

قرآن میں مکڑیوں کا ذکر ان کے مسکن کی نزاکت (تارِ عنکبوت) پر زور دینے کے لیے کیا گیا ہے جو سب سے زیادہ بودا ہوتا ہے ان کی پناہ گاہ قرآن کریم کے بموجب ایسی ہی بوجھ کی ہوتی ہے جیسا کہ ان لوگوں کا مسکن ہوتا ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا رب بنایا ہے۔

سورۃ ۲۹، آیت ۴۱:

مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیآء کمثل
العنکبوت ج اتخذت بیتا ط وان اوھن البیوت لبیت
العنکبوت م لو کانوا یعلمون....

''جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں، ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔''

مکڑی کا جالا فی الحقیقت ریشمی دھاگوں کا ہوتا ہے جو اس جانور کے غدودوں سے رس کر نکلتا ہے اور وہ بے انتہا مہین ہوتا ہے اس کی نزاکت کی نقل انسان نہیں اتار سکتا۔ ماہرین حیوانات کام کے اس غیر معمولی نمونہ سے جو اس جانور کے اعصابی خلیات سے ترتیب پاتا ہے مسحور ہو جاتے ہیں اس اعصابی نظام سے اس

جانور کو ایک مکمل ہندسی نوعیت کا جالا تاننے میں مدد ملتی ہے۔

پرندے:

پرندوں کا قرآن مجید میں اکثر تذکرہ کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے حالات زندگی کے دوران دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن حوالہ جات زیر غور مضمون پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔
زمین پر حیوانی برادریوں اور آسمان پر پرندوں کے غولوں سے متعلق آیت صدر میں پیش کر دی گئی ہے۔

سورۃ ۶، آیت ۳۸:۔

وما من دآبة فی الارض ولا طئر یطیر بجناحیه الا امم امثالکم ط مافرطنا فی الکتاب من شیء ثم الی ربهم یحشرون...

"زمین پر چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب تمہاری ہی طرح کے انواع ہیں ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمٹے جاتے ہیں۔"

دو اور آیتیں پرندوں کے قدرت خداوندی کے مکمل طور پر تابع ہونے کی نمایاں کرتی ہیں۔

سورۃ١٦، آیت ۷۹:۔

الـم یـروا الی الطیر مسخراب فی جو السمآء ط ما یمسکھن الا الله....

''کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں؟ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے؟''

سورۃ ٦٧، آیت ١٩:۔

اولـم یـروا الی الـطیـر فـوقھـم صـفت و یقبضن م مایمسکھن الا الرحمن ط

''کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلاتے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے۔ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو۔''

ان آیات میں سے ہر ایک میں محض ایک لفظ کا ترجمہ ایک نہایت نازک مسئلہ بن جاتا ہے۔ جو ترجمہ یہاں دیا گیا ہے اس سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پرندوں کو اپنی قدرت سے تھامے رہتا ہے۔ زیر غور عربی کا لفظ ''امسک'' ہے جس کا ابتدائی مفہوم ہے ''قبضہ میں رکھنا، پکڑنا، تھامنا، روکنا''

ان آیتوں کے مقابلہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپنی نقل و حرکت کے پروگرام میں پرندوں کی بعض انواع کو جو تکمیل کا درجہ حاصل ہوتا ہے اس سلسلہ میں یہ آیتیں اس بات پر زور دیتی ہیں کہ موجودہ کسی عقلی دلیل کے مقابلہ میں پرندے حکم ربی پر کہیں زیادہ انحصار کرتے ہیں پرندوں کو توالد و تناسل کے رمز (Genetic Code) (٤) میں صرف ایک انتقالی پروگرام کی موجودگی ہی

ان طویل اور انتہائی پیچیدہ سفروں کی وجہ ہوسکتی ہے جن کو نہایت ننھے منے پرندے بغیر کسی سابقہ تجربہ اور کسی رہنما کے مکمل کر لیتے ہیں۔ یہ بات اس کی اس خوبی کے علاوہ ہے کہ وہ ایک مقررہ تاریخ پر پھر اسی جگہ واپس آ جاتے ہیں جہاں سے وہ روانہ ہوئے تھے۔ پروفیسر ہمبرگر اپنی کتاب "طاقت اور کمزوری" (لا بوٹیاں اے لاغر اثرات) (۵) میں مٹن برڈ کے جو بحرالکاہل کے علاقہ میں رہتی ہے۔ مشہور واقعہ کی مثال پیش کرتے ہیں کہ وہ پندرہ ہزار پانچ سو میل کا سفر انگریزی کے ہندسہ آٹھ کی شکل (۶) میں ترتیب پا کر طے کرتی ہے۔ یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ اس قسم کے سفر کے لیے یہ انتہائی پیچیدہ ہدایات اس پرندے کے محض اعصابی خلیات ہی میں شامل ہوسکتی ہیں۔ وہ بے انتہا واضح طور پر منضبط ہوتے ہیں لیکن اس انضباط کو وجود میں لانے والا کون ہے؟

۴۔ جانوروں کے دودھ کے اجزائے ترکیبی کا ذریعہ:

قرآن کریم میں اس کی تعین جدید معلومات کے ساتھ کلی طور پر مطابقت رکھتی ہے (سورۃ ۱۶ آیت ۲۲) یہاں اس آیت کا ترجمہ اور اس کی تشریح میری اپنی کی ہوئی ہے کیونکہ جدید ترجمے بھی روایتی طور پر اس کا وہ مفہوم بتاتے ہیں جو میری رائے میں مشکل سے ہی قابل قبول ہوسکتا ہے۔ یہاں دو مثالیں پیش ہیں۔

آربلیشر کا ترجمہ: (۷)

''یقیناً تمہارے جانوروں میں تمہارے لیے ایک سبق ہے! ہم تمہیں پینے کے لیے خالص دودھ دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے نہایت خوب ہوتا ہے یہ ان کے پیٹ میں جس چیز سے بنتا ہے وہ کیلوس اور خون کے درمیان کی چیز ہے۔''

پروفیسر حمید اللہ کا ترجمہ: (۸)

یقیناً تمہارے جانوروں میں سوچنے کے لیے غذا ہے۔ ان کے فضلہ اور خون کے درمیان ان کے پیٹ میں جو کچھ ہے اس میں سے ہم تمہیں وہ خالص دودھ پلاتے ہیں جس کا ہضم کرنا پینے والوں کے لیے آسان ہوتا ہے۔''

اگر یہ متون کسی ماہر عضویات کو دکھائے جائیں تو وہ کہے گا کہ یہ تو بے انتہا مبہم ہیں وجہ یہ ہے کہ ان کے اور جدید تصورات کے درمیان نہایت ابتدائی سطح پر بھی مشکل سے کوئی مطابقت دکھائی دیتی ہے۔ یہ ترجمے عربی زبان کے بڑے ماہرین کے کیے ہوئے ہیں لیکن یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ کوئی مترجم خواہ وہ کتنا ہی ماہر ہو، سائنسی بیانات کے ترجمے میں غلطیاں کر سکتا ہے جب تک کہ وہ زیر غور موضوع کا ماہر نہ ہو۔

انتہائی صحیح ترجمہ جو مجھے محسوس ہوتا ہے وہ حسب ذیل ہے:

''یقیناً جانوروں میں تمھارے لیے ایک سبق ہے۔ ہم تمہیں ان کے جسموں کے اندر کی اس چیز سے جو آنتوں کے مادہ اور خون کے اختلاط سے ایسا دودھ دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خالص اور فرحت بخش ہوتا ہے۔'' (سورۃ ۱۶،

آیت ٦٦)

یہ تشریح اس تشریح سے بہت قریب ہے جو منتخب ۱۹۷۳ء مین دی گئی ہے جس کو سپریم کونسل برائے اسلامی امور قاہرہ نے ترتیب دیا تھا۔ جس کی تائید جدید علم الاعضاء سے ہوتی ہے۔

اپنی لغات کے لحاظ سے مجوزہ ترجمہ مندرجہ ذیل طریقہ پر حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے۔

میں نے ترجمہ کیا ہے ''ان کے جسموں کے اندر'' اور اس طرح نہیں جس طرح آر بلیشر اور پروفیسر حمید اللہ نے کیا ہے ''ان کے پیٹ میں'' اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ ''بطن'' کے معنی ''وسط'' اور کسی چیز کے اندر بھی ہیں اور ''پیٹ'' بھی ہیں۔ یہاں ان میں کوئی مفہوم ایسا نہیں ہے جو تشریح بدن کے لحاظ سے صحیح ہو۔ ''ان کے جسموں کے اندر'' ایسا فقرہ ہے جو سیاق عبارت سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔

دودھ کے اجزائے ترکیبی کے ابتدائی ماخذ کا تصور لفظ ''من'' سے واضح ہوا ہے۔ (انگریزی میں لفظ فرام) اور ایک حرف عطف کا تصور لفظ ''بین'' سے ملتا ہے۔ موخر الذکر نہ صرف ''من جملہ'' کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے بلکہ ''درمیان'' کے معنی بھی دیتا ہے۔ جیسا کہ دوسرے ترجموں میں بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ اس تصور کو بیان کرنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے کہ دو چیزیں یا دو اشخاص باہم ملائے گئے یا قریب لائے گئے ہیں۔

سائنسی نقطہ نظر سے عضویاتی تصورات اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے ذہن میں لانے پڑیں گے۔

جو مادے جسم کے لیے عام تغذیہ کے سلسلہ میں یقینی ہوتے ہیں وہ اس کیمیاوی استحالہ سے حاصل ہوتے ہیں جو دائرہ ہضم کے طول میں رونما ہوتا ہے یہ مادے آنتوں کے مشمولات سے فراہم ہوتے ہیں۔

آنت میں کیمیاوی استحالہ کے ایک مناسب مرحلہ پر پہنچ کر وہ اس کی جدار سے گزرتے ہیں اور دوران منہاجی کی جانب رواں ہوتے ہیں۔ یہ انتقال دو طریقوں سے ہوتا ہے یا تو براہ راست یعنی ان نسوں کے ذریعہ جو عروق جاذبہ کہلاتی ہیں، یا بالواسطہ یعنی بذریعہ دوران الباب۔ اس طرح سے پہلے وہ جگر میں پہنچتے ہیں جہاں ان میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور یہاں سے وہ دوران منہاجی میں شامل ہونے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ اس طرح ہر شے خون کی نالی سے ہوکر گزرتی ہے۔

دودھ کے اجزائے ترکیبی پستان کے غدودوں سے رستے ہیں۔ پھر جیسا کہ ہوتا ہے۔ ان کو غذا کے ہضم ہونے سے بننے والی اس شے سے غذائیت ملتی ہے جو خون کی نالیوں کے ذریعے ان اجزاء تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ خون اس شے کا جو کھانے سے حاصل ہوتی ہے جمع کرنے اور پہنچانے والا حامل ہے اور اسی سے پستانوں کے غدودوں کا تغذیہ ہوتا ہے جہاں دودھ کی تولید ہوتی ہے۔ یہ اسی طرح کا عمل ہے جس طرح کا دوسرے کسی عضو کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں وہ ابتدائی عمل جو ہر دوسری چیز کو حرکت میں لے آتا ہے، آنت اور خون کے مشمولات کو خود جدار الامعاء کی سطح پر باہم ملا دیتا ہے۔ یہ نہایت واضح تصور کیمیا اور علم الاعضاء میں تحقیقات کے نتیجہ کے طور پر حاصل ہوا ہے۔ رسول خدا حضرت

محمد ﷺ کے زمانہ میں اس کا قطعاً علم نہیں تھا اور محض ماضی قریب میں اس کو سمجھا گیا ہے۔ دوران خون کی دریافت نزول قرآن کے تقریباً دس صدیوں بعد ہاروے نے کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تصورات کے حوالوں کی قران میں موجودگی کی وضاحت انسان کے بس کی بات نہیں اس لیے کہ وہ تصورات بعد میں وضع ہوئے۔

حواشی

۱۔ یہ مادہ تولیدی غدود سے رستا ہے اور اس میں حیوانات منویہ شامل ہوتے ہیں۔

۲۔ ہم نے اس کتاب کے تیسرے حصے کی تمہید میں اس چیز سے بحث کی تھی جس کے مطابق خود انسان کے متعلق مسئلہ جبر و قدر کے سلسلہ میں عقیدہ رکھنا چاہیے۔

۳۔ ضمناً یہ بات نوٹ کی جاسکتی ہے کہ قرآن کریم میں صرف یہ آخری آیت ہی ایسی ہے جس میں انسان کے دوا علاج کا ذکر کیا گیا ہے۔شہد یقیناً کئی بیماریوں کے لیے مفید ہے اس مضمون کے متعلق مخالفت میں خواہ کچھ کہا جائے قرآن میں کسی اور مقام پر کسی معالجاتی فن کا حوالہ نہیں ملتا۔

۴۔ جدید ترین تحقیقات پر سائنس نے دریافت کیا ہے کہ تمام جانداروں کے (نباتات ہوں یا حیوانات) ہر خلیہ میں ایک کیمیاوی مرکب ڈی۔این۔اے ہوتا ہے۔یہ بہت معمولی قسم کا کیمیاوی مرکب ہے۔اس کی شکل ایک گول زینہ کی طرح ہوتی ہے اور یہ خردبینی کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے جس میں احکام کے یاد کرائے ہوئے حافظہ کی لاتعداد نقلیں ہوتی ہیں جن کو کوڈ (رمز) کہتے ہیں جب یہ خلیہ دو میں تقسیم ہوتا ہے تو ہر حصہ کو اپنے اپنے کام کے لحاظ سے یہ نقلیں بھی مل جاتی ہیں۔

احکام کا یہ ٹیپ ریکارڈ ہر خلیہ میں صحیح وقت اور موقع پر احکام جاری کرتا رہتا ہے کہ خلیہ کو اب کیا کام کرنا ہے۔ یہ کوڈ اسی حساب سے احکام جاری کرتے رہیں گے جو اس کو خلیہ کی تقسیم کے وقت اس نقل میں لے تھے ان احکام کی تلاش میں ڈی۔این۔اے اور یہ کوڈ (رمز) دریافت ہوئے۔ ان رموز کو کون واضح کرتا ہے اور کیوں؟ ابھی تک سائنس اس کو سمجھنے سے بھی قاصر ہے، بنانا تو درکار۔

ڈی۔این۔اے کے یہ کوڈ خلیات میں تحریر
ہے ایک نوشتہ جو ہے احکام کی تعمیر
ڈی کوڈ یہ جب ہوتی ہے لکھی ہوئی تقدیر
آتی ہے نظر فعل کی صورت میں یہ تفسیر
یہ دیکھ کے سمجھو کہ ضرورت ہے خدا کی

(ماخوذ از بصیرت مصنفہ ڈاکٹر قیوم پاشا زبیری)

۵۔ شائع کردہ فلیماریوں ۱۹۷۲ء پیرس۔

۶۔ یہ اس سفر کو چھ ماہ کی مدت میں طے کرتی ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ کی تاخیر سے پھر اسی جگہ واپس آ جاتی ہے جہاں سے روانہ ہوئی تھی۔

۷۔ شائع کردہ جی۔پی۔ ٹیپے نیوایور ۱۹۶۶ء پیرس

۸۔ شائع کردی کلب فرانسے دولیور ۱۹۷۱ء پیرس

باب ہفتم

انسان کی افزائش نسل

جس لمحہ سے قدیم انسانوں کی تحریروں میں افزائش نسل کے موضوع پر تفصیلات کا سلسلہ شروع ہوا ہے (خواہ وہ کتنا ہی قلیل تھا) اس وقت سے ان میں ایسے بیانات پیش ہوتے رہے ہیں جو غیر صحیح ہیں۔قرون وسطیٰ میں۔۔۔۔۔اور نسبتاً جدید زمانہ میں بھی۔۔۔۔۔ افزائش نسل کے موضوع کو تمام اقسام کے اساطیر اور توہمات گھیرے رہے ہیں۔اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا۔جب ہم اس حقیقت کو دیکھتے ہیں کہ اس کی انتہائی درجہ کی پیچیدہ میکانیات کو سمجھنے کے لیے انسان کے لیے ضروری تھا کہ وہ تشریح بدن سے واقفیت حاصل کرتا۔اس کے لیے خوردبین کی دریافت ضروری تھی اور پھر اس کے لیے ان نام نہاد بنیادی سائنسوں کی اساس قائم ہوتی جو عضویات،جینیات قابلہ گری وغیرہ کو ترقی دیتیں۔

قرآن کریم میں کیفیت اس سے قطعاً مختلف ہے۔الکتاب بہت سے مقامات پر صحیح میکانیات کو بتاتی اور افزائش نسل کے واضح مدارج کو بیان کرتی ہے جس میں کسی ایک مقام پر بھی غیر صحیح ہونے کا کوئی امکان نہیں۔قرآن میں ہر بات آسان لفظوں میں بیان کر دی گئی ہے جو انسان کے آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے اور اس چیز سے پورے طور پر مطابقت رکھتی ہے جس کی دریافت بہت بعد میں ہونے والی تھی۔

انسان کی افزائش نسل کا واقعہ قرآن مجید میں کئی درجن آیات میں دیا گیا ہے اور مختلف سیاق وسباق کے ساتھ ہے۔اس کی تشریح ایسے بیانات کے ذریعے ہوئی ہے جن میں ایک بار زیادہ مخصوص نکات کا تذکرہ ہے۔تمام آیات کا ایک مجموعی تصور دلانے کے لیے ان بیانات کو یکجا کرنا پڑے گا اور اس طرح جیسا کہ دوسرے مضامین کے سلسلے میں پیشتر دیکھا جا چکا ہے ان پر رائے زنی کرنا آسان ہوگا۔

بعض بنیادی تصورات کی یاددہانی:

بعض ان بنیادی تصورات کو یاد دلانا قطعی ضروری ہے جو نزول قرآن کے وقت اور اس کے بعد کی صدیوں میں نامعلوم تھیں۔

انسان کی افزائش نسل ایک ایسے سلسلۂ عمل سے ہوتی ہے جو ہمارے اور دودھ پلانے والے جانوروں میں مشترک ہے۔نقطہ آغاز ایک ایسے بیضہ کا بارور ہونا ہے جو خود کیسہ تخم (بیضہ دان) سے الگ ہو جاتا ہے۔یہ عمل حیض کے دوران نصف مدت میں قنات المحیض میں انجام پاتا ہے۔بارور کرنے والا عامل مرد کا نطفہ ہے یا زیادہ صحیح کہیں تو حیوان منویہ ہے جس کا محض ایک بارور کرنے والا خلیہ درکار ہوتا ہے۔لہٰذا باروری کے عمل کو یقینی بنانے کے لیے مادہ منویہ کی نہایت ہی قلیل مقدار جس میں ایک بڑی تعداد حیوانات منویہ کی (ایک وقت میں کروڑوں) ہو درکار ہوتی ہے۔یہ مادہ خصیوں سے پیدا ہوتا اور عارضی طور پر منابع اور نالیوں کے ایک نظام میں جمع رہتا ہے اور آخر میں پیشاب کی نالی میں پہنچ جاتا ہے۔اس موخرالذکر

نالی کے اردگرد دوسرے غدود ہوتے ہیں جو اپنی اضافی رطوبات کو منی کے اندر شامل کردیتے ہیں۔

اس عمل سے بارور شدہ بیضہ کا استقرار نسوانی نظام تولید میں ایک مخصوص مقام پر انجام پاتا ہے اور ایک قنات المیض کے ذریعے رحم میں داخل ہوجاتا اور رحم کے اندر قیام کرتا ہے جہاں وہ عضلہ اور جھلی کی دبازت میں پیوست ہوکر اصطلاحی طور پر استقرار پاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی مدد سے آنول نال کی تشکیل ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر بارور بیضہ کا استقرار بجائے رحم کے قنات المیض میں ہو گیا تو حمل میں بے ضابطگی پیدا ہوجائے گی۔

جب ایک مرتبہ جنین خالی آنکھ سے نظر آنے لگے تو وہ گوشت کی ایک چھوٹی سی بوٹی کی طرح معلوم ہوتا ہے جس کے مرکز پر شروع شروع میں انسانی شبیہہ ناقابل شناخت ہوتی ہے۔ وہاں یہ مختلف اور ترقی یافتہ مدارج سے گزرتی ہے جس کے متعلق آج کل بخوبی علم و واقفیت ہے۔ وہ بڑھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتی ہے۔ اس پر عضلات چڑھتے ہیں، اعصابی نظام قائم ہوتا ہے۔ پھر دوران خون اور احشاء وغیرہ کی تخلیق ہوتی ہے۔

یہ تصورات حوالہ کی ان اصطلاحوں کو سمجھنے میں کام دیں گے جن کے ساتھ افزائش نسل سے متعلق قرآن مجید میں دیئے ہوئے بیانات کا مقابلہ کرنا ہے۔

قرآن میں انسانی افزائش نسل:

اس بات کا تصور دلانا آسان نہیں ہے کہ قرآن میں اس موضوع سے متعلق کیا دیا ہوا ہے۔ پہلی دقت اس حقیقت کی بناء پر پیش آتی ہے جس کا پیشتر ذکر کر دیا گیا ہے۔ یعنی اس موضوع سے متعلق بیانات پوری الکتاب میں منتشر حالت میں پائے جاتے ہیں۔ تاہم یہ سب سے بڑی دقت و دشواری نہیں ہے۔ جو چیز ایک متجسس قاری کو زیادہ چکر میں ڈال سکتی ہے وہ لغت کا مسئلہ ہے۔

حقیقت میں اس وقت بھی بہت سے ایسے تراجم اور تفاسیر رائج ہیں جن سے کسی سائنس دان کو جو قرآن کا مطالعہ کرے، اس موضوع سے متعلق نزول قرآن کا ایک بالکل غلط تصور قائم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تراجم کی اکثریت انسان کی تشکیل خون کے ایک قطرہ یا ایک لسلسے مادہ سے قرار دیتی ہے۔ اس قسم کا کوئی بیان ان سائنس دانوں کے لیے قطعاً ناقابل قبول ہے جو اس شعبہ میں اختصاص کیے ہوئے ہیں۔ جس پیراگراف میں رحم مادر میں بیضہ کی باروری سے بحث کی گئی ہے، اگر اس کی روشنی میں ان اسباب کا جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ ان مشہور عربی دانوں نے جو سائنسی معلومات سے عاری ہیں کیوں اس نوع کی فاش غلطیاں کی ہیں۔

یہ مشاہدہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ لسانی اور سائنسی معلومات کی وابستگی کس قدر اہم ہے، جب کہ اس سے افزائش نسل سے متعلق قرآنی بیانات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جنین رحم مادر میں اپنی منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے جن متواتر تبدیلیوں سے ہو کر گزرتا ہے قرآن کریم ان پر زور دیتے ہوئے بیان کرتا ہے۔

سورۃ ۸۲، آیت ۶ تا ۸:۔

یآیھا الانسان ما غرک بربک الکریم۔۔ الذی خلقک فسوک فعدلک۔۔ فی ای صورۃ ما شآء رکبک۔۔۔

"اے انسان، کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا۔ تجھے مناسب حالت میں بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا؟"

سورۃ ۷۱، آیت ۱۴:۔

وقد خلقکم اطوارا۔۔

"اس نے (خدا نے) طرح طرح سے تمہیں بنایا۔"

اس عمومی مشاہدہ کے ساتھ، قرآن کریم افزائش نسل سے متعلق ان متعدد نکات کی جانب توجہ مبذول کرتا ہے جس کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

۱۔ باروری کا عمل رقیق مادہ کی صرف نہایت قلیل مقدار سے انجام پاتا ہے۔

۲۔ بارور کرنے والے رقیق مادہ کے اجزائے ترکیبی۔

۳۔ بارور شدہ بیضہ کا استقرار

۴۔ جنین کا ارتقاء

ا۔ باروری کا عمل رقیق مادہ کی محض نہایت قلیل مقدار سے انجام پاتا ہے:

قرآن کریم میں مندرجہ ذیل عبارت کو استعمال کر کے اس تصور کو گیارہ مرتبہ دہراتا ہے۔

سورۃ ۱٦، آیت ۴:۔

خلق الانسان من نطفة

''اس نے (خدا نے) انسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا۔ (منی کی قلیل مقدار)''

عربی لفظ ''نطفہ'' کا ترجمہ (منی) کی قلیل مقدار کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس ایسی اصطلاحیں موجود ہیں جو مکمل طور پر موزوں ہوں۔ یہ لفظ ایک ایسے صدر سے مشتق ہے جس کا مفہوم ہے ''ٹپکنا'' یا قطرہ قطرہ ہو کر گرنا، یہ لفظ اس چیز کو بتانے کے لیے مستعمل ہے جو ایک ایسی بالٹی میں تہہ نشین ہوتی ہے جس کو خالی کر لیا گیا ہو۔ لہٰذا یہ لفظ رقیق مادہ کی نہایت قلیل مقدار کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں اس مادہ سے مراد منی ہے۔ کیونکہ یہ لفظ ایک دوسری آیت میں بھی خود لفظ ''منی'' کے ساتھ وابستہ ہے۔

سورۃ ۷۵، آیت ۳۷:۔

الم یک نطفة من منی یمنی...

''کیا وہ حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا۔''

یہاں عربی کا لفظ ''منی'' رقیق مادے کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک دوسری آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیر بحث ''قلیل مقدار'' ایک نہایت مستحکم حالت میں ٹھیرتی (قرار) ہے جس کا مفہوم ظاہراً طور پر ''آلات تناسل'' ہے۔

سورۃ ۲۳، آیت ۱۳: ارشاد خداوندی ہے۔

ثم جعلنه نطفة فی قرار مکین....

''پھر (آدمی) کو ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔''

یہاں یہ وضاحت کرنی پڑے گی کہ اس صفت کا جو اس متن میں ''مستحکم حالت میں ٹھہرنے'' ''مکین'' کو ظاہر کرتی ہے، میرے نزدیک بمشکل ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ لفظ ایک نہایت مستحکم اور لائق احترام جگہ کے تصور کو پیش کرتا ہے۔ معاملہ خواہ کچھ ہو اس لفظ سے ماں کو وہ عضو مراد ہے جس میں انسان بالیدگی حاصل کرتا ہے۔ یہ مادہ کی اس انتہائی قلیل مقدار کے تصور پر زور دینے کے معاملہ میں نہایت اہم ہے جو باروری کے عمل کے لیے ضروری ہے۔ یہ چیز اس سے کلی طور پر مطابقت رکھتی ہے جو اس مضمون کے بارے میں آج ہمیں معلوم ہے۔

۲۔ بارور کرنے والے رقیق مادے کے اجزائے ترکیبی:

قرآن بارور کرنے والے رقیق مادہ کو جس انداز میں پیش کرتا ہے، اس کا جائزہ دلچسپ ہے۔

الف۔ ''منی'' جیسا کہ واضح طور پر بیان ہوا ہے۔ (سورۃ ۷۵، آیت ۳۷)

ب۔ ''اچھلنے والا پانی'' انسان کو ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا۔

(سورۃ ۸۶، آیت ۶)

ج۔ ''حقیر پانی'' (سورۃ ۳۲، آیت ۸ اور سورۃ ۷۷، آیت ۲۰)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صفت ''حقیر'' (مھین) کی اتنی زیادہ خود رقیق مادہ کی اپنی نوعیت کے سبب تشریح نہیں کی جائے گی جتنی کہ اس حقیقت کی وجہ سے کہ یہ اس نالی کو جو پیشاب کے گزرنے کے لیے مخصوص ہے استعمال کر کے دائرہ بول کے راستہ سے خارج ہوتا ہے۔

د۔ مرکب ''یا مخلوط نطفہ'' (امشاج) سورۃ ۷۶، آیت ۲:

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفہ سے پیدا کیا ہے۔''

بہت سے مفسرین، جیسے پروفیسر حمید اللہ ان رقیق مادوں کو مرد اور عورت کے عوامل خیال کرتے ہیں۔ یہی نظریہ دوسرے مفسرین نے بھی اپنایا تھا جن کو باروری کی عضویات حیوانی خصوصیت سے عورت کے معاملہ میں اس کی حیاتیاتی کیفیات کا کچھ بھی تصور تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس لفظ سے دو عناصر کی صرف یکجائی مراد ہے۔

لیکن جدید مصنفین جیسے منتخب کے مفسرین نے جس کو قاہرہ کی اسلامی امور کی

سپریم کونسل نے مرتب کیا ہے اس نظریہ کی تصحیح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نطفہ کی تھوڑی سی مقدار بہت سے اجزائے ترکیبی سے بنی ہے۔ منتخب کا شارح زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا لیکن میری رائے میں یہ نہایت مدبرانہ مشاہدہ ہے۔

نطفہ کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

مادہ منویہ مختلف قسم کی رطوبات سے جو مندرجہ ذیل غدودوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ مل کر بنتا ہے۔

الف۔ خصیئے: مرد کے تناسلی غدہ کی رطوبت میں حیوانات منویہ شامل ہوتے ہیں جو لمبوترے خلیات ہوتے ہیں۔ جن میں پلک کی شکل کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ وہ ایک کیلوسی رقیق مادہ کے اندر ڈوبے رہتے ہیں۔

ب۔ حوضلہ منویہ (منی کی تھیلیاں): یہ اعضا حیوانات منویہ کے مخزن ہوتے ہیں۔ اور غدہ مثانہ کے قریب واقع ہوتے ہیں۔ ان سے اپنی رطوبت بھی رستی ہے لیکن اس میں باروری کے عوامل نہیں ہوتے۔

ج۔ غدہ مثانہ: اس میں سے ایک رطوبت رستی ہے جس سے نطفہ میں ایک چکنی ساخت اور مخصوص بو پیدا ہوتی ہے۔

د۔ دائرہ بول سے ملحق غدود: غدودودی سے ایک لیس دار رقیق مادہ رستا ہے اور غدو ولٹر سے لیس دار لعاب نکلتا ہے۔

یہ مخلوط مادوں کے مراکز ہیں جن کا حوالہ قرآن سے ملتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس موضوع پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ جب قرآن مجید مختلف اجزاء پر مشتمل بارور کرنے والے رقیق مادہ پر گفتگو کرتا ہے تو ہمیں اس امر سے بھی

آ گاہی بخشتا ہے کہ انسان کی تشکیل کسی ایسی چیز سے قائم رہے گی جو اس رقیق مادہ سے حاصل ہوگی۔

یہ سورۃ ۳۲، آیت ۸ کا مفہوم ہے۔

ثم جعل نسله من سللة من ماء مهين....

''پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔''

عربی کا لفظ جس کا ترجمہ یہاں ''ست'' سے کیا گیا ہے ''سللة'' ہے۔ یہ کسی ایسی چیز کو ظاہر کرتا ہے جو کشید کی گئی ہو، جو کسی دوسری شے میں سے نکلی ہو اور جو کسی چیز کا بہترین جزو ہو۔ اس کا خواہ کسی طرح سے ترجمہ کا جائے یہ کل شئے کے ایک جزو پر دلالت کرتا ہے۔

بیضہ کا بارور ہونا اور افزائش نسل ایک خلیہ سے وجود پاتے ہیں جو نہایت لمبوترا ہوتا ہے اس کے ابعاد کو ایک ملی میٹر کے دس ہزارویں حصے میں ناپا گیا ہے۔ عام حالات میں (۱) ان کروڑوں خلیات میں جو انسان کے اندر تخلیق پا کر نکلتے ہیں۔ صرف ایک خلیہ بیضہ دان میں نفوذ پاتا ہے۔ ان میں سے بڑی تعداد پیچھے رہ جاتی ہے اور اس سفر کو جو وجینیا سے بیضہ دان تک ہوتا ہے کبھی پورا نہیں کرتی۔ یہ سفر رحم اور قنات المبیض سے ہو کر طے کرنا پڑتا ہے۔ لہذا اس رقیق مادہ کے ست کا جس کی ترکیب انتہائی پیچیدہ ہوتی ہے ایک نہایت ہی قلیل حصہ ایسا ہوتا ہے جو اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے۔

نتیجتاً اس بات پر حیرت زدہ رہ جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے جب قرآن کے

متن اور سائنس کی اس معلومات کے درمیان مطابقت دکھائی دیتی ہے جو ان واقعات کے بارے میں آج ہمیں حاصل ہے۔

۳۔عورت کے تناسلی اعضاء میں بارورشدہ بیضہ کا استقرار:

ایک بار جب قنات المبیض میں بیضہ بارور ہو جاتا ہے تو وہ رحم کے اندر قرار پکڑتا ہے۔اس عمل کو بیضے کا استقرار کہا جاتا ہے ۔قرآن میں بارور بیضہ کی جائے قرار کو''بچہ دانی'' کہا گیا ہے۔

سورۃ ۲۲،آیت ۵:۔

ونقر فی الارحام ما نشاء الی اجل مسمی (۲)

''ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔''

رحم کے اندر بیضے کا استقرار بالوں کے بڑھنے اور بیضہ کے واقعتہً لمبا ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے وہ مٹی کے اندر جڑوں کی طرح رحم کی دبازت سے وہ غذائیت حاصل کرتا ہے۔جو بیضہ کی بالیدگی کے لیے ضروری ہے۔اس تشکیل کو لغوی طور پر بیضے کے رحم کے ساتھ جمے ہونے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ دور جدید کی ایک دریافت ہے۔

جمے ہونے کے عمل کو قرآن میں پانچ مختلف مواقع بیان کیا گیا ہے۔اول کی سورۃ ۹۶،آیات ۱ اور ۲:

اقرا باسم ربک الذی خلق.... خلق الانسان من

علق...

''پڑھو(اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔''

کوئی جمی ہوئی چیز ترجمہ ہے لفظ ''علق'' کا۔ یہ اس لفظ کے اصلی معنی ہیں۔ اس سے جو ایک مفہوم اخذ کیا گیا۔ ''خون کی پھٹکی'' وہ اکثر ترجمہ میں نمایاں رہتی ہے۔ یہ ایک غلطی ہے جس میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ انسان کبھی بھی اس مرحلہ سے نہیں گزرتا جس کو ''خون کی پھٹکی'' سے تعبیر کیا جائے۔ یہی بات ایک اور ترجمہ کے لیے صحیح ہے۔ وہ اصطلاح ہے ''چسپیدگی'' کی جو مساوی طور پر ناموزوں ہے۔ ''کوئی جمی ہوئی چیز'' ہی وہ اصلی مفہوم ہے جو آج کل کی مصدقہ دریافت سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔

یہ تصور چار اور آیات میں بھی دیا گیا ہے جن میں نطفہ کی قلیل مقدار سے شروع کر کے آخری مرحلہ تک تمام تبدیلیوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔

سورۃ ۲۲، آیت ۵:۔

فانا خلقنکم من .... علقة

''ہم نے تم کو کسی جمی ہوئی چیز لوتھڑے سے پیدا کیا۔''

سورۃ ۲۳، آیت ۱۴:۔

ثم خلقنا النطفة علقة

''پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی۔''

سورۃ ۴۰، آیت ۶۷:۔

هو الذی خلقکم من .... نطفة ثم من علقة

''وہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا نطفے سے پھر خون کے لوتھڑے سے''

سورۃ ۷۵، آیات ۳۷، ۳۸:۔

الم یک نطفة من منی یمنی...ثم کان علقة فخلق فسوی..

''کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے۔
پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے۔''

جس عضو میں حمل قرار پاتا ہے اس کو قرآن کریم میں ایک ایسے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اب بھی عربی میں رحم کے معنی دیتا ہے۔ بعض سورتوں میں اس کو ایک محفوظ جگہ (قرار مکین) کہا گیا ہے (سورۃ ۲۳، آیت ۱۳) جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اور سورۃ ۷۷، آیت ۲۱ (۳)

۴۔ رحم کے اندر جنین کا ارتقاء:

جنین کے بڑھنے اور ترقی کے بعض مدارج کا قرآنی بیان پوری طرح اس معلومات سے مطابقت رکھتا ہے جو اس کے بارے میں آج ہمیں حاصل ہے اور قرآن کریم میں ایک بھی بیان ایسا نہیں ہے جو جدید سائنس کے لحاظ سے تنقید کی زد میں آ سکے۔

''کسی جمی ہوئی شے'' (جو نہایت مستحکم عبارت ہے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) کے بعد قرآن ہمیں اس امر سے واقفیت دلاتا ہے کہ جنین گوشت کے لوتھڑے (مضغہ) کی شکل سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس کے بعد استخوانی نسیجیں ظاہر ہوتی ہیں اور ان پر گوشت چڑھتا ہے (اس چیز کو ایک مختلف لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے جس کا مفہوم بندھی ہوئی بوٹی ہوتا ہے)۔

سورۃ ۲۳، آیت ۱۴:۔

فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظما فكسونا العظم لحما....

''پھر ہم نے لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔''

''گوشت کا لوتھڑا'' ترجمہ ہے لفظ ''مضغہ'' کا اور بندھی ہوئی بوٹی (گوشت یا عضلات) کے لیے ''لحم'' ہے۔ اس فرق پر خصوصیت سے توجہ دینے کی ضرورت ہے جنین ابتداء میں ایک ''چھوٹی سی پھٹکی'' کی شکل میں تھا پھر وہ خالی آنکھ کو ایک لوتھڑے کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ بعدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ اس لوتھڑے کے اندر ارتقاء پاتا ہے جس کو وسطی مغز کہا جاتا ہے جو ہڈیاں تخلیق پا جاتی ہیں۔ ان پر عضلات (گوشت) چڑھ جاتے ہیں۔ ان پر لفظ ''لحم'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنین کی بالیدگی کے دوران بعض اعضاء کس طرح مکمل طور پر غیر متناسب معلوم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بعد میں بعض تو ان میں سے منفرد رہتے ہیں اور دوسرے متناسب ہو جاتے ہیں۔

یہ یقیناً لفظ ''مخلقة'' کے معنی ہیں جس کا مفہوم تناسب مین ہونا ہے۔ جیسا کہ اس واقعہ کو بیان کرنے کے لئے سورۃ ۲۳ کی آیت ۵ میں استعمال ہوا ہے۔

فانا خلقنکم من علقة مخلقة و غیر مخلقة

''ہم نے تم کو بنایا خون کے لوتھڑے سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔''

قرآن مجید حواس اور اعضائے رئیسہ کی اشکال کو بھی بیان فرماتا ہے۔

سورۃ ۳۲، آیت ۹:۔

و جعل لکم السمع و الابصار و الافئدة...

''اور تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں اور دل دیئے۔''

اس میں جنسی اعضاء کی تشکیل کا بھی ذکر ہے۔

سورۃ ۵۳، آیات ۴۵، ۴۶:۔

وانه خلق الزوجین الذکر و الانثی... من نطفة اذا تمنی..

''اور اس نے نر اور مادہ کو جوڑا پیدا کیا۔ ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔''

جنسی اعضاء کی تشکیل کا ذکر قرآن کی دو سورتوں میں ہوا۔

سورۃ ۳۵، آیت ۱۱:۔

واللہ خلقکم من تراب ثم من نطفة ثم جعلکم ازواجا..

''اور اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے (یعنی مرد اور عورت)

سورۃ ۷۵، آیت ۳۹:۔

فجعل منه الزوجين الذكر و الانثى

''پھر اس سے (اللہ تعالیٰ نے) مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔''

جیسا کہ پیشتر بتایا جا چکا ہے۔قرآن مجید کے تمام بیانات کا مقابلہ آج کل کے تسلیم شدہ تصورات سے کیا جانا چاہیے۔ان کے درمیان مطابقت نہایت واضح ہے لیکن یہ نہایت اہم بات ہے کہ اس موضوع پر عام عقائد سے جو نزول قرآن کے وقت رائج تھے۔ان کا مقابلہ اس غرض سے کیا جائے کہ اس زمانہ میں لوگ ان مسائل سے متعلق اس طرح کے نظریات سے کتنی دور تھے جس طرح کے نظریات یہاں قرآن میں بتائے گئے ہیں۔اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ وحی کی تشریح اس طرح کرنے سے قاصر تھے جو آج ہم کر سکتے ہیں کیونکہ ہمیں ان چیزوں سے مدد ملتی جو جدید معلومات ہمارے لیے فراہم کرتی ہیں۔درحقیقت انیسویں صدی کے دوران ہی یہ ہوا کہ لوگوں کو اس مسئلہ کا کسی قدر زیادہ واضح تصور حاصل ہوا۔

پورے قرون وسطیٰ میں انتہائی متنوع اصول وضوابط کی ابتداء بے بنیاد اساطیر اور قیاسات سے ہوئی تھی۔وہ اس عہد کے بعد کئی صدیوں تک قائم رہے جنینیات کی تاریخ میں انتہائی بنیادی مرحلہ ہاروے کا یہ بیان تھا (۱۶۵۱ء) کہ ''جملہ حیات ابتدا میں بیضہ سے ظہور پاتی ہے۔'' لیکن اس وقت بھی جب پیدائش سے متعلق

سائنس نے (مضمون ہمدست کے لیے) بہت کچھ خوردبین کی ایجاد سے فائدہ اٹھالیا تھا۔لوگ بیضہ اور حیوان منی کے انفرادی کردار پر گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔عظیم ماہر حیوانیات ونباتات بفون ان لوگوں میں سے تھا جو بیضہ کے نظریہ کے حامی تھے۔لیکن بونے نے تخموں کے باہم ملاپ کے نظریہ کی حمایت کی۔ یہ خیال تھا کہ اماں حوا کی جو جملہ نسل انسانی کی ماں تھیں، بیضہ دانیوں میں تمام انسانوں کے تخم موجود تھے جو ایک دوسرے کے اندر گتھے ہوئے تھے۔اس نظریہ کی حمایت اٹھارویں صدی تک ہوتی رہی۔

ہمارے زمانہ میں سے ایک ہزار سال سے زیادہ قبل جب یہ توماتی ضوابط ہنوز رائج تھے لوگوں کو قرآن کی معلومات حاصل تھیں۔اس میں جو بیانات شامل ہیں، ان سے نہایت سادہ الفاظ میں بنیادی اہمیت کے ان حقائق کا اظہار ہوتا ہے جن کی دریافت میں انسان نے صدیاں لگادی ہیں۔

قرآن میں جنسی تعلیم:

ہمارے دور کا یہ عقیدہ ہے کہ اس نے تمام ممکنہ شعبہ جات میں ہمہ جہتی دریافتیں کی ہیں۔خیال کیا جاتا ہے کہ جنسی تعلیم کے میدان میں بڑی راہیں نکالی ہیں اور زندگی کے حقائق کی وہ معلومات جو نوجوانوں کے لیے کھلی کتاب کی طرح ہے جدید دنیا کا ایک کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔پچھلی صدیاں اس نکتہ پر دانستہ طور پر اغماض برتنے میں نہایت نمایاں رہیں اور بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ

مذہب۔۔۔بغیر یہ بتائے کہ کون سا مذہب۔۔۔اس کا موجب ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا معلومات اس بات کا ثبوت ہے کہ چودہ صدی پیشتر انسانی افزائش نسل سے متعلق نظری مسائل (جیسے بھی کچھ تھے) انسان کی توجہ کا مرکز بنے تھے۔ یہ چیز جس حد تک ممکن تھی کی گئی۔ قطع نظر اس کے کہ تشریحی اور عضویاتی معلومات جو مزید وضاحت کے لیے درکار تھیں، اس کی کمی تھی۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ سمجھنے کے لیے سادہ زبان جو ان لوگوں کی فہم کی سطح سے مطابقت رکھتی ہو استعمال کرنا ضروری تھا جو اس تبلیغ کو سنتے تھے۔

عملی نوعیت کے امور کو خاموشی سے نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔قرآن میں زندگی کے عملی پہلو پر عمومیت کے ساتھ بہت سی تفصیلات ہیں اور وہ طریقہ بتایا گیا ہے جو انسان کو اپنی حیات کے مختلف مواقع پر اختیار کرنا چاہیے۔اس کی جنسی زندگی بھی کوئی استثنٰی نہیں ہے۔

قرآن مجید کی دو آیتیں خود جنسی تعلقات سے بحث کرتی ہیں۔ وہ جنسی تعلقات ایسے الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں، جن میں صحت کی ضرورت کو نفاست کے ساتھ ملا دیا گیا ہے لیکن جب تراجم اور تشریحات سے رجوع کیا جاتا ہے تو انسان ان کے درمیان اختلافات کو دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ میں نے اس قسم کی آیات پر طویل عرصہ تک غور کیا ہے اور میں ڈاکٹر اے کے جیراد سابق پروفیسر فیکلٹی آف میڈیسن، بیروت کا حسب ذیل تشریح کے لیے ممنون کرم ہوں۔

سورۃ ۸۶، آیات ۶، ۷ اور ۸:۔

خلق من مآء دافق... یخرج من بین الصلب

والترآئب.. انه علی رجعه لقادر...

''انسان ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یقیناً وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ (وہ مرد اور عورت کے جنسی مقام کے اتصال سے نکلتا ہے)''(۴)

مرد کے جنسی مقام کو قرآن کریم کے متن میں لفظ ''صلب''(واحد) سے ظاہر کیا گیا ہے۔عورت کے جنسی مقام کو قرآن میں لفظ ''ترائب''(جمع) سے موسوم کیا گیا ہے۔

یہ وہ ترجمہ ہے جو سب سے زیادہ تشفی بخش معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس ترجمہ سے مختلف ہے جو اکثر انگریزی اور فرانسیسی مترجمین بیان کرتے ہیں۔ ''یعنی انسان ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو ریڑھ ہڈی اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یہ ترجمہ سے زیادہ تشریح معلوم ہوتی ہے اور بمشکل قابل فہم کہی جا سکتی ہے۔

مرد کا رویہ اس کی اپنی بیوی کے ساتھ اس کے گہرے تعلقات کے سلسلہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

حیض کے ایام کے بارے میں جو حکم دیا گیا ہے وہ سورۃ ۲ کی ۲۲۲ اور ۲۲۳ نمبر کی آیتوں میں شامل ہے۔اللہ تعالی نبی ﷺ کو حسب ذیل حکم دیتا ہے۔

سورۃ ۲،آیات ۲۲۲،۲۲۳:۔

یسئلونک عن المحیض ط قل هو اذی لا

فاعتزلوا النسآء فی المحیض لا ولا تقربوھن حتی یطھرن ج فاذا تطھرن فاتوھن من حیث امرکم اللہ ط ان اللہ یحب التوابین و یحب المتطھرین....

”اے رسولﷺ وہ (اہل ایمان) آپ سے المحیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کیونکہ وہ ایک گندگی کی حالت ہے۔ اس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ۔ جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔“

نسآئکم حرث لکم ص فاتوا حرثکم انی شئتم ز وقدموا لانفسکم ط

”تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو۔“

اس عبارت کی ابتداء اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صاف ہے۔ اس میں دستور اور رواج کے مطابق ایک شخص کو ایک عورت کے ساتھ جو ایام ماہواری میں ہو جنسی اختلاط سے منع کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں کھیتی کے اس عمل کو بیان کیا گیا ہے جو کاشتکار اس بیج کے بونے سے قبل انجام دیتا ہے جو اچھا اور ایک نیا پودا پیدا کرتا ہے۔ اس لیے اس مثال سے بالواسطہ طور پر زور جنسی اختلاط کے آخری مقصد یعنی افزائش نسل کو ذہن میں رکھنے کی اہمیت پر دیا گیا ہے۔ آخری فقرہ کا

ترجمہ آربلاشے نے کیا ہے۔اس میں ایک حکم ہے جو جنسی اختلاط سے پہلے کی ابتدائی باتوں کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔

جو احکام یہاں دیئے گئے ہیں وہ بے حد عمومی نوعیت کے ہیں۔ان آیات کے سلسلہ میں مانع حمل شے کے مسئلہ کو اٹھایا گیا ہے۔اس مضمون سے متعلق نہ یہاں اور نہ کسی دوسری جگہ کوئی حوالہ دیا گیا ہے۔

نہ ہی اسقاط حمل کی ترغیب کا کوئی ذکر ہے۔البتہ جنین کے یکے بعد دیگرے تبدیلیوں سے متعلق متعدد عبارتیں جو اوپر نقل ہوئی ہیں۔ان سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ مرد کو قانونی طور پر اس مرحلہ کے لیے حق دیا گیا ہے جس میں کسی جمی ہوئی شے،کے وجود کو بیان کیا گیا ہے اس صورت میں کسی فرد بشر کے مکمل احترام میں جس کا حوالہ قرآن مجید میں دیا گیا ہے۔اسقاط حمل کی ترغیب کی کلی طور پر مذمت ہو جاتا ہے۔آج کل اس طرز عمل میں جملہ توحید پرست مذاہب متفق ہیں۔

رمضان کے مہینہ کے روزے کے دوران جنسی اختلاط کی رات کے وقت اجازت دی گئی ہے۔رمضان سے متعلق آیت حسب ذیل ہے۔

سورۃ ۲ آیت ۱۸۷:۔

احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسآئکم ط ھن
لباس لکم و انتم لباس لھن... فالئن باشروھن وابتغوا ما
کتب اللہ لکم ص

”تمہارے لیے روزوں کے زمانے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے

پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو... اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمہارے لیے جائز کر دیا ہے اسے حاصل کرو۔''

اس کے برخلاف ایام حج کے دوران مکہ میں حاجیوں کے قاعدے اور ضابطے میں کوئی استثنا نہیں برتی گئی ہے۔

سورۃ ۲، آیت ۱۹۷:۔

فمن فرض فیهن الحج فلا رفث ولا فسوق لا

''جو شخص ان مقررہ مہینوں میں حج کی نیت کرے۔ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدکاری سرزد نہ ہو۔''

یہ ممانعت ضابطے کے تحت ہے جیسا کہ یہ واقعہ ہے کہ دوسرے افعال سے بھی منع کیا گیا ہے مثلاً شکار، جدال وقتال وغیرہ سے۔

حیض کا ذکر قرآن میں طلاق کے سلسلے میں پھر کیا گیا ہے۔ الکتاب میں حسب ذیل آیت دی گئی ہے۔

سورۃ ۶۵، آیت ۴:۔

والیء یئسن من المحیض من نسآئکم ان ارتبتم فعدتهن ثلثة اشهر لا والیء لم یحضن ط و اولات الاحمال اجلهن ان یضعن حملهن ط

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں ان کے معاملہ میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو (تمہیں معلوم ہو کہ)

ان کی عدت تین مہینے ہے اور یہی حکم ان کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔''

امید کا زمانہ جس کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے۔ طلاق کا اعلان اور وضع حمل کے درمیان کا وقفہ ہے۔ جن خواتین کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ''وہ حیض سے مایوس ہو چکی ہوں وہ'' وہ ہیں جن کو حیض کا آنا بند ہو گیا ہو۔ ان کے لیے تین ماہ کی احتیاطی مدت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ جیسے ہی یہ مدت تکمیل کو پہنچ جائے، مطلقہ عورتیں جن کو حیض کا آنا بند ہو گیا ہو عقد ثانی کر سکتی ہیں۔

ان عورتوں کے لیے جنہیں حیض ابھی نہ آیا ہو۔ حمل کے وقت تک انتظار کرنا لازمی ہے۔ حاملہ عورتوں کے لیے طلاق اس وقت ہی روبعمل ہو جاتی ہے جس وقت بچہ پیدا ہو جائے۔

یہ تمام ضابطے اور اصول عضویاتی مقدمات کے ساتھ مکمل طور پر مطابقت رکھتے ہوں۔

آگے چل کر یہی مدبرانہ قانونی دفعہ قرآن حکیم کے متن کے اس حصے میں ملتی ہے جہاں بیوگی سے بحث کی گئی ہے۔

اس طرح افزائش نسل سے متعلق نظری بیانات اور زوجین کی جنسی زندگی کے بارے میں عملی ہدایات آپس میں متناقض نہیں ہیں اور ان مقدمات کے خلاف نہیں پڑتے جو ہمیں جدید معلومات سے حاصل ہوئے ہیں۔ نہ ہی کسی ایسی چیز کے مخالف پڑتے ہیں جو منطقی طور پر اس سے اخذ کی جاتی ہے۔

حواشی

۱۔ یہ اندازا لگایا گیا ہے کہ ایک مکعب سنٹی میٹر نطفہ میں ڈھائی کروڑ حیوانات منویہ ہوتے ہیں جب کہ عام حالات میں ایک اخراج میں کئی مکعب میٹر سنٹی میٹر کے بقدر منی ہوئی ہے۔

۲۔ ارشاد خداوندی

۳۔ ایک دوسری آیت میں (سورۃ ۶، آیت ۹۸) قرار مکین کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کو ایک ایسی اصطلاح سے ظاہر کیا گیا ہے جو سابقہ اصطلاح سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے (مستقر) اور وہ رحم مادر کو ظاہر کرتی ہے۔ ذاتی طور پر میں اس آیت کا یہی مفہوم سمجھتا ہوں۔ لیکن تفصیلی طور پر وضاحت ایک طویل بحث وتشریح کو مستلزم ہو گی جو اس کتاب کی حدود سے ماورا ہے۔

ایک دوسری آیت جو ایک نازک توضیح وتشریح کی متقاضی ہے۔ درج ذیل ہے۔

سورۃ ۳۹، آیت ۶:۔

یخلقکم فی بطون امھتکم خلقا من م بعد خلق فی ظلمت ثلث ط

”وہ (اللہ تعالیٰ) تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین باریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔“

قرآن کے جدید دور کے مفسرین کو اس آیت میں ان تین تشریحی پرتوں کا خیال پیدا ہوتا ہے جن کے اندر بچہ کی تولیدی وقفہ کے دوران حفاظت ہوتی ہے۔ یعنی جدار شکمی، خود رحم اور رحم میں پرورش پاتے ہوئے جنین کا اردگرد کا حصہ (آنول نال، غشا، جنین، ماءغشائی)

مجھے اس آیت کو تکمیل کی غرض سے نقل کرنا پڑا۔ یہاں جو وضاحت کی گئی وہ مجھے تشریحی نقطہ نظر سے قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتی لیکن کیا قرآن کریم کا بھی حقیقت میں یہی مقصود ہے؟

۴۔ بین الصلب والترائب کا جو ترجمہ پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان دیا گیا ہے۔ وہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے ترجمہ قرآن مجید کے مطابق ہے اور قوسین کے درمیان دیا ہوا ترجمہ مصنف کتاب ھٰذا نے بیان کیا ہے۔ مترجم

جزء اول

قرآن اور بائبل کے بیانات

عام خاکے:

بہت سے وہ مضامین جن سے بائبل میں بحث کی گئی ہے وہ قرآن مجید میں بھی دیئے گئے ہیں۔ اولاً وہ بیانات ہیں جن میں پیغمبروں کے تذکرے ہیں جیسے نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، یوسف علیہ السلام، یونس علیہ السلام، ایوب علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام: بنی اسرائیل کے حکمران جیسے ساؤل علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام۔ صرف چند خاص خاص تذکروں کے جو ان میں مشترک ہیں یہاں نام بتائے گئے ہیں۔ اس کے بعد ان بڑے بڑے واقعات کے زیادہ مخصوص نوعیت کے بیانات ہیں جن کے دوران فوق الفطرت باتیں در آئی ہیں۔ مثلاً ارض وسماوات کی تخلیق، تخلیق آدم، طوفان عالمگیر، خروج۔ آخر میں وہ سب کچھ ہے جو یسوع اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہ السلام سے متعلق ہے اور یہ تذکرہ عہدنامہ جدید سے تعلق رکھتا ہے۔

دونوں صحیفوں میں بیان کردہ مضامین کو جب ہم صحائف کے ماخذات سے الگ اپنی جدید معلومات کی روشنی میں دیکھیں تو وہ کیا تاثرات قائم کرتے ہیں۔

مشابہ: قرآن۔اناجیل اور جدید معلومات

قرآن اور اناجیل کے مشابہ بیانات کا جہاں تک تعلق ہے اس میں سب سے پہلے اس بات پر توجہ کرنی چاہیے کہ اناجیل میں بیان کردہ کوئی سے بھی مضامین جن پر سائنسی نقطہ نظر سے تنقید کی گئی تھی (ملاحظہ کیجئے اس کتاب کا جز دو) وہ قرآن میں نقل نہیں ہوئے ہیں۔

یسوع کا ذکر قرآن میں متعدد بار ہوا ہے۔میلاد مسیح کے سلسلے میں حضرت مریم ؑ کا ان کے باپ کو اطلاع دینا۔معجزانہ میلاد مسیح کی اطلاع حضرت مریم ؑ کو۔ یسوع کا جلیل القدر پیغمبروں میں مقام۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کردار مسیح کی حیثیت سے۔وہ الہام جو انہوں نے آدم کو بتایا جس سے توریت کی توثیق و ترمیم ہوتی ہے،ان کے مواعظ،ان کے حواری اور رسول،معجزے،رفع مسیح،یوم الحساب میں ان کا کردار وغیرہ۔

قرآن مجید کی تیسری اور انیسویں سورتوں میں (جن میں سے موخرالذکر میں حضرت مریم ؑ کا نام لیا گیا ہے)حضرت عیسیٰ علیہ السلام (یسوع) کے خاندان سے متعلق لمبی لمبی عبارتیں ہیں۔ان عبارتوں میں ان کی والدہ محترمہ مریم کی ولادت۔ ان کی جوانی اور ان کی معجزانہ امویت کے اعلان کا ذکر ہے۔ان (حضرت عیسیٰ) کا شجرہ نسب مختص طور پر ان کی والدہ کے لحاظ سے دیا گیا ہے جو قطعاً منطقی ہے۔اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کوئی صلبی باپ نہ تھے۔ یہاں قرآن،متی اور لوقا کی انجیلوں سے اختلاف کرتا ہے۔جیسا کہ ہم پہلے دیکھ

چکے ہیں۔وہ دونوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام (یسوع) کے ابوی نسب نامے دیتے ہیں جو مزید برآں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے اموی نسب نامہ کے لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد (قرآن میں ان کا نام عمران بتایا گیا ہے) کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ ۳، آیات ۳۳، ۳۴:۔

ان الله اصطفى ادم و نوحا وال ابراهيم وال عمران على العلمين... ذرية بعضها من م بعض ط والله سميع عليم..

''اللہ نے آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ ایک سلسلے کے لوگ تھے جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے۔اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔''

لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ حضرت مریمؑ اور ان کے والد عمران کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہوتے ہیں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اجداد کے ناموں کی جو غلطیاں اناجیل میں ہوئی ہیں وہ قرآن میں موجود نہیں ہیں، نہ ہی حضرت ابراہیم کے اجداد کے سلسلہ کی وہ ناممکن باتیں ہیں جو عہد نامہ قدیم میں شامل ہیں۔ان دونوں باتوں کا

جائزہ اس کتاب کے پہلے اور دوسرے حصے میں لیا جا چکا ہے۔

اگر کسی کو معروضی نقطۂ نظر اختیار کرنا ہے تو اس بات کا ایک بار پھر جائزہ لینا چاہیے۔اس کی انتہائی اہمیت ان بے بنیاد بیانات کے مواجہ میں صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے جن میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے مصنف حضرت محمد ﷺ نے بہت کچھ بائبل کی نقل کر دی ہے (نعوذ باللہ) اس بات کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ کس شخص یا کس سبب نے ان کو ان عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کرنے پر مجبور کیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اجداد کے بارے میں بائبل میں موجود ہیں اور اس جگہ پر قرآن مجید میں ان صحیح باتوں کو شامل کرنے پر کس نے اکسایا جن کی بدولت جدید معلومات کے مقابلے میں ان کا (حضرت محمد ﷺ) کا متن تنقید سے بالاتر ہو گیا ہے۔اناجیل اور عہد نامہ قدیم قطعاً ایک دوسرے سے متبائن ہیں اور اس نقطۂ نظر سے وہ کلیتہً نا قابل قبول ہیں۔

مشابہ: قرآن۔عہد نامہ قدیم اور جدید معلومات

جہاں تک عہد نامہ قدیم کا تعلق ہے۔اس تشابہ کے بعض پہلوؤں پر پہلے ہی بحث کی جا چکی ہے۔مثال کے طور پر دنیا کی تخلیق کو اس کتاب کے عہد نامہ جدید والے حصہ میں تنقیدی جائزہ کا موضوع بنایا گیا تھا۔اسی موضوع کا تنزیل قرآن کے سلسلے میں جائزہ لیا گیا اور مقابلہ کیا جا چکا ہے اور اب کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اس زمین کو پھر بے سپر کیا جائے۔

سلاطین بنی اسرائیل سے متعلق مسائل جو قرآن اور بائبل دونوں کے بیانات کے موضوع ہیں، ان کے بارے میں جدید معلومات کی روشنی میں تشابہات قائم کرنے کے لیے تاریخی معلومات نہایت مبہم اور اثریاتی اکتشافات نہایت قلیل ہیں۔

آیا جدید معلومات کی روشنی میں نبیوں کے مسائل پر گفتگو کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ یہ امر اس بات پر منحصر ہے کہ جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، انہوں نے کس حد تک اپنے ایسے نشانات و اثرات چھوڑے ہیں جو ہم تک پہنچے ہوں یا نہ پہنچے ہوں۔

تاہم دو مضامین ایسے ہیں جن سے قرآن اور بائبل دونوں میں اعتنا کیا گیا ہے جن کی جانب ہمیں توجہ مبذول کرنی چاہیے اور جن کا جدید معلومات کی روشنی میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ وہ مضامین حسب ذیل ہیں۔

طوفان عالمگیر

خروج

پہلا اس لیے کہ اس نے تاریخ تمدن میں کوئی ایسے تاثرات نہیں چھوڑے جو بائبل کے بیان کی تائید کرتے ہوں جب کہ جدید معلومات ہمیں اس بیان پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں دیتی جو قرآن میں شامل ہے۔

دوسرا اس لیے کہ بائبل اور قرآن کے بیانات اپنے عام خاکوں کے اعتبار سے واضح طور پر ایک دوسرے کا تکملہ کرتے ہیں اور جدید معلومات سے ان کو نہایت نمایاں طور پر تاریخی تائید حاصل ہوتی ہے۔

جزءدوم

طوفان عالمگیر (۱)

طوفان عالمگیر کے متعلق بائبل کا بیان اوراس پرنقدوتبصرہ۔ایک یادداشت

طوفان کے بارے میں عہدنامہ قدیم کاجوجائزہ اس کتاب کے پہلے حصہ میں لیا گیا تھا۔اس سے حسب ذیل مشاہدات حاصل ہوتے ہیں۔

طوفان کاصرف ایک بیان نہیں ہے بلکہ دو بیانات ہیں۔جومختلف اوقات میں تحریر ہوئے۔

۔۔۔۔۔۔یہودی بیان جس کازمانہ نویں صدی قبل مسیح کا ہے۔

۔۔۔۔۔مرشدانہ متن (سیسر ڈوٹل ورژن) جس کازمانہ چھٹی صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔یہ اس نام سے اس لیے موسوم ہے کہ اس کواس زمانہ کے مذہبی پیشواؤں نے مرتب کیا تھا۔

یہ دونوں بیانات پہلو بہ پہلو نہیں رکھے گئے بلکہ آپس میں پیوست ہیں۔چنانچہ ایک کے اجزاءدوسرے کے اجزاء کے بیچ بیچ میں ترتیب دے دیئے گئے ہیں۔یعنی ایک ماخذ کے پارے یکے بعد دیگرے دوسرے ماخذ کے پاروں سے ملے ہوئے ہیں۔بائبل سکول یروشلم کے ایک پروفیسر،فادردے وو، نے کتاب

پیدائش کے ترجمہ پر جو تشریحی بیان پیش کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ماخذوں کے درمیان پارے کس طرح منقسم ہیں۔ یہ بیان یہودی بیان ہی سے شروع ہوتا ہے اور یہودی عبارت پر ہی ختم ہوتا ہے۔ یہودی پاروں کی کل تعداد دس ہے اور ہر ایک کے درمیان ایک مرشدانہ متن ٹھونس دیا گیا ہے (مرشدانہ پاروں کی کل تعداد نو ہے) جب اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے کہ واقعات کا تسلسل پیش نظر رہے تو عبارتوں کی یہ پچی کاری مربوط دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے کہ دونوں ماخذوں میں زبردست تناقضات ہیں۔ ''فادر دے وو'' ان کو طوفان کے دو بیانات کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جن میں طوفان مختلف عوامل کی بناء پر رونما ہوتا ہے اور مختلف مدتوں تک قائم رہتا ہے۔ کشتی میں جانور مختلف تعداد میں لیے جاتے ہیں۔

جب جدید معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو طوفان کے بارے میں بائبل کا بیان حسب ذیل وجوہ کی بناء پر کلیتاً ناقابل قبول ہوتا ہے۔

الف۔ عہد نامہ جدید اس کو ایک عالمگیر طوفان کی نوعیت سے بیان کرتا ہے۔

ب۔ جہاں یہ ہے کہ یہودی متن سے لیے گئے پاروں سے طوفان کا زمانہ متعین نہیں ہوتا وہیں مرشدانہ متبع اس کا تعین ایک ایسے زمانے میں کرتا ہے جب اس قسم کا طوفان رونما نہیں ہوسکتا تھا۔

اس رائے کی تائید کرنے والے دلائل حسب ذیل ہیں۔

مرشدانہ بیان واضح طور پر بتاتا ہے کہ طوفان اس وقت آیا تھا جب حضرت

نوح علیہ السلام کی عمر ۶۰۰ سال کی تھی۔ کتاب پیدائش کے باب نمبر ۵ میں دیے گئے نسب ناموں کے مطابق (جو مرشدانہ متن سے بھی لیے گئے ہیں اور اس کتاب کے پہلے حصہ میں نقل ہوئے ہیں) ہمیں معلوم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی ولادت حضرت آدم علیہ السلام کے ۱۰۵۶ سال بعد بتائی جاتی ہے۔ نتیجتاً طوفان تخلیق آدم علیہ السلام کے ۱۶۵۵ سال بعد رونما ہوا ہوگا۔ علاوہ ازیں ابراہیم علیہ السلام کے نسب نامے جو اسی متن سے لیے گئے ہیں اور کتاب پیدائش (۱۱، ۱۰۔۳۲) میں دیے گئے ہیں۔ ہمیں یہ حساب لگانے میں مدد دیتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ۲۹۲ سال بعد پیدا ہوئے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے (بائبل کے مطابق) حضرت ابراہیم علیہ السلام تقریباً ۱۸۵۰ ق م حیات تھے۔ لہٰذا طوفان اکیسویں یا بائیسویں صدی قبل مسیح میں رونما ہوا ہوگا۔ یہ حساب بائبل کے قدیم نسخے میں دی ہوئی اس معلومات سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے جو بائبل کے متن کے آغاز میں نہایت نمایاں طور پر دی گئی ہیں۔ یہ بات اس زمانے میں تھی جب اس موضوع پر انسانی معلومات ایسی تھیں کہ مخالفت میں دلائل کی کمی کے سبب۔۔۔ بائبل میں دیے گئے تاریخی اعداد کو قارئین نے بغیر کسی حیل و حجت کے صحیح تسلیم کرلیا تھا۔ (۲)

آج یہ بات سمجھ لینا کیسے ممکن ہے کہ اکیسویں یا بائیسویں صدی قبل مسیح میں ایک عالمگیر طوفان ایسا آیا ہوگا جس نے تمام روئے زمین سے حیات کو فنا کر دیا ہو گا۔ (سوائے ان لوگوں اور جانوروں کے جو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار تھے؟) یہ وہ زمانہ تھا جب تمدن کرہ ارض کے مختلف حصوں میں پھیل چکا تھا اور

اس تمدن کے آثار اب ان قوموں کے اخلاف تک پہنچ چکے ہیں۔ مثال کے طور پر اس زمانہ میں مصر میں درمیانی دور، سلطنت قدیم کے بعد اپنا جلوہ دکھا چکا تھا اور سلطنت وسطیٰ کی ابتدا سے پہلے رونما ہو چکا تھا۔ اس دور کی تاریخ کے متعلق ہمیں جو معلومات حاصل ہیں ان کے پیش نظر یہ بات قطعاً نامعقول ہو گی کہ طوفان نے اس زمانہ میں تمام تمدن کو مٹا دیا ہو گا۔

چنانچہ تاریخی اعتبار سے یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ طوفان کا ذکر جس طرح بائبل میں کیا گیا ہے۔ وہ جدید معلومات سے قطعی طور پر متناقض ہے۔ ان صحیفوں میں انسان کی کارستانی کا واضح ثبوت یہی ہے کہ اس وقت کتاب کے دو متن موجود ہیں۔

طوفان کا ذکر جو قرآن میں دیا گیا ہے:

قرآن مجید ایک عام بیان پیش کرتا ہے جو اس سے مختلف ہے جو بائبل میں دیا گیا ہے اور تاریخی نقطہ نظر سے یہ کوئی اعتراض نہیں پیدا ہونے دیتا۔

اس میں طوفان کا مسلسل بیان نہیں دیا گیا۔ متعدد سورتوں میں اس سزا کا تذکرہ کیا گیا ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر نازل کی گئی۔ اس کا سب سے زیادہ مکمل ذکر سورۃ ۱۱، آیات ۲۵ تا ۴۹ میں ہے۔ سورۃ ۷۱ جس میں نوح علیہ السلام کا نام بھی دیا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر حضرت نوح علیہ السلام کی تعلیمات پیش کرتی ہے۔ یہی بات سورۃ ۲۶ کی آیات ۱۰۵ تا ۱۱۵ میں ہے۔ واقعات نے جو

رخ اختیار کیا، اس میں جانے سے پہلے ہمیں قرآن مجید میں بیان کردہ طوفان کے اس تذکرہ پر غور کرنا چاہیے جو قرآن مجید میں ان قوموں پر نازل کردہ سزا کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے جنہوں نے خدا کے احکام کی صریحاً خلاف ورزی کی تھی۔

جب کہ بائبل میں ایک ایسے عالمگیر طوفان کا ذکر ہے، جو خدا ناشناس نوع انسانی کو سزا دینے کی غرض سے نازل کیا گیا تھا۔ قرآن مجید اس کے برخلاف ان کئی طرح کی سزاؤں کا حوالہ دیتا ہے جو بعض مخصوص قوموں کو دی گئیں۔

یہ بات سورۃ ۲۵، آیت ۳۵ تا ۳۹ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ولقد اتینا موسی الکتاب و جعلنا معه اخاه هرون وزیرا... فقلنا اذهبآ الی القوم الذین کذبوا بایتنا ط فدمرنهم تدمیرا.. وقوم نوح لما کذبوا الرسل اغرقنهم و جعلنهم للناس ایة ط واعتدنا للظلمین عذابا الیما... و عادا و ثمودا واصحب الرس وقرونا بین ذلک کثیرا... و کلا ضربنا له الامثال و کلا تتبرنا تتبیرا..

''ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو مددگار کے طور پر لگایا اور ان سے کہا کہ جاؤ اس قوم کی طرف جس نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے۔ آخر کار ان لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہی حال قوم نوح کا ہوا جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ ہم نے ان کو غرق کر دیا اور دنیا بھر کے لوگوں کے لیے ایک نشان عبرت بنا دیا۔ اور ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہم نے مہیا کر

رکھا ہے۔اس طرح عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور بیچ کی صدیوں کے بہت سے لوگ تباہ کیے گئے ان میں سے ہر ایک کو ہم نے (پہلے تباہ ہونے والوں کی) مثالیں دے دے کر سمجھایا اور آخر کار ہر ایک کو غارت کر دیا۔"

سورۃ ۷ کی آیت ۵۹ تا ۹۳ میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم عاد، ثمود، لوط اور مدین کی قوموں پر ترتیب وار جو عذاب نازل کیے گئے۔ان کی ایک یادداشت دی گئی ہے۔

اس طرح قرآن مجید طوفان کے عذاب کو ایک ایسی سزا کے طور پر پیش کرتا ہے جو خاص طور پر قوم نوح علیہ السلام کے لیے تھی۔یہ وہ پہلا بنیادی فرق ہے جو دونوں بیانات میں پایا جاتا ہے۔

دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ قرآن مجید بائبل کے برعکس طوفان کے زمانہ کا تعین نہیں کرتا۔اور نہ خود طوفان کے جاری رہنے کی مدت کو بتاتا ہے۔

سیلاب کے اسباب دونوں بیانات کے مطابق وہی ہیں۔بائبل کے مرشدانہ متن کے بیان، کتاب پیدائش ۷:۱۱ سے دو اسباب کا پتہ چلتا ہے جو ساتھ ساتھ رونما ہوئے۔اس دن سمندر کے تمام سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔" قرآن مجید سورۃ ۵۴ کی ااویں اور ۱۲ ویں آیتوں میں حسب ذیل بیان پیش کرتا ہے۔

ففتحنا ابواب السمآء بمآء منهمر ... و فجرنا الارض عيونا فالتقى المآء على امر قد قدر .....

”تب ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا اور یہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا۔“

قرآن کریم میں ان اشیاء کو نہایت صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جو کشتی میں موجود تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو جو حکم دیا تھا۔ اس کو نہایت فرمانبرداری سے بجالایا گیا اور وہ باتیں حسب ذیل تھیں جو کرنے کو کہی گئی تھیں۔

سورۃ ۱۱، آیت ۴۰:۔

قلنا احمل فيها من كل زوجين اثنين واهلك الا من سبق عليه القول و من امن ط وما امن معه الا قليل....

”ہم نے کہا، ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو۔ اپنے گھر والوں کو بھی۔ سوائے ان اشخاص کے جن کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے تھے۔“

جس فرد کو خاندان سے خارج کیا گیا تھا۔ وہ حضرت نوح علیہ السلام کا گمراہ بیٹا تھا۔ ہم (سورۃ ۱۱، آیت ۴۵، ۴۶) (۳) میں پڑھتے ہیں کہ کس طرح اس فرد کی جانب سے حضرت نوح علیہ السلام کی بارگاہ خداوندی میں تضرع و زاری اللہ تعالیٰ سے اس کا فیصلہ تبدیل کرانے میں ناکام رہی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان (یعنی ان کا گمراہ بیٹا کنعان) کے علاوہ قرآن مجید کشتی پر سوار چند

دوسرے ایسے مسافروں کا بھی حوالہ دیتا ہے جو خدا پر ایمان لے آئے تھے۔

بائبل کشتی کے سواروں میں موخر الذکر کا تذکرہ نہیں کرتی۔ فی الحقیقت اس کشتی میں موجود اشیاء کے سلسلے میں تین مختلف بیانات ملتے ہیں۔

یہودی بیان کے مطابق خالص جانوروں اور پرندوں اور غیر خالص جانوروں کے درمیان امتیاز برتا گیا ہے۔ (سات جوڑے (۴) یعنی سات نر اور سات مادائیں خالص اقسام کی کشتی میں رکھی گئیں اور ہر ایک غیر خالص قسم کا محض ایک جوڑا لیا گیا)

ایک تبدیل شدہ یہودی آیت کے بموجب (کتاب پیدائش ۷۔۸) خالص وہ خالص قسم تھی یا غیر خالص ہر ایک کا صرف ایک جوڑا تھا۔

مرشدانہ متن کے مطابق، حضرت نوح علیہ السلام تھے۔ ان کا خاندان (بغیر کسی استثناء کے) اور ہر قسم میں سے ایک ایک جوڑا لیا گیا تھا۔

قرآن مجید میں خود سیلاب کا تذکرہ سورۃ ۱۱ آیات ۲۵ تا ۴۹ اور سورۃ ۲۳ میں آیات ۲۳ تا ۳۰ میں دیا گیا ہے۔ بائبل کے بیان میں کوئی خاص فرق دکھائی نہیں دیتا۔

بائبل میں وہ مقام جہاں کشتی آ کر ٹھہرتی ہے۔ کوہستان اراراط میں ہے۔ (کتاب پیدائش ۸، ۴) اور قرآن مجید کے نزدیک یہ جگہ جودی ہے۔ (سورۃ ۱۱، آیت ۴۴) یہ پہاڑ آرمینیا میں سلسلہ اراراط میں بلند ترین بتایا جاتا ہے۔ لیکن کسی بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دونوں بیانات مین مطابقت ہونے کے لیے ناموں کو لوگوں نے تبدیل نہیں کر دیا ہے۔ اس بات کی تصدیق آر بلیشیر نے کر دی

ہے۔ان کے بموجب عرب میں جودی نام کی ایک چوٹی ہے۔ناموں کی مطابقت مصنوعی ہوسکتی ہے۔

القصہ یہ بات بتانا صاف طور پر ممکن ہے کہ اس موقع پر بائبل اور قرآن کے بیانات میں بڑے بڑے اختلافات کیا ہیں۔ان میں سے بعض ایسے ہیں جو تنقیدی جائزے سے بچ سکتے ہیں۔اس لیے کہ معروضی نوعیت کی معلومات کی کمی ہے لیکن جب مصدقہ معلومات کی روشنی میں صحائف کے بیانات کو جانچنا ممکن ہوتا ہے تو بائبل کے بیانات یعنی جو زمانہ کے ساتھ ساتھ اور جغرافیائی حالات کے تحت معلومات حاصل ہوتی رہی ہیں اور ان تحقیقات کے درمیان جنہوں نے جدید معلومات میں اضافہ کیا ہے۔تناقض واضح ہو جاتا ہے۔اس کے برخلاف قرآن میں دی گئی معلومات کسی ایسی چیز سے پاک ہے جو معروضی تنقید کو ابھارتی ہو۔ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا اس مدت میں جو بائبل کے بیان کے وقت سے اس بیان کے جو قرآن مجید میں شامل ہے زمانہ تک ممتد ہے۔انسان کو کوئی ایسی معلومات حاصل ہوسکی ہیں جو اس معاملہ پر روشنی ڈالتی ہو۔اس کا جواب نفی میں ہے۔اس لیے کہ عہد نامہ قدیم کے زمانہ سے قرآن مجید تک انسان کو اس قدیم ترین واقعہ کے متعلق جو دستاویز حاصل رہی ہیں، وہ خود بائبل تھی۔اگر انسانی عوامل ان بیانات میں تبدیلی کی وجہ بتانے سے قاصر ہوں جنہوں نے معلومات جدید کے لحاظ سے معنوں کو متاثر کیا ہو تو پھر دوسری توجیہہ ماننی پڑتی ہے یعنی یہ کہ وہ ایسی وحی ہے جو بائبل میں شامل بیان کے بعد نازل ہوئی ہے۔

حواشی

ا۔ یہ ایک طوفان باراں تھا جو تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح میں حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا سے ان کی امت کی بداعمالیوں کے سبب بطور سزا اس پر نازل ہوا تھا۔ اگرچہ یہ طوفان دجلہ اور فرات کی وادی تک محدود رہا لیکن چونکہ اس زمانہ کی کل آبادی اسی علاقہ میں بسی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ سوائے چند افراد کے تمام بنی نوع انسان اس طوفان سے تباہ ہو گئی تھی اور اسی لیے اس کو طوفان عالمگیر کا نام دیا جاتا ہے۔

اس طوفان کا ذکر تمام قدیم مذاہب کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ سمیری، کلدانی اور اشوری ادب اور شاعری میں بھی اس کا تفصیلی حال بیان ہوا ہے۔ موجودہ صدی میں ماہرین حفریات نے میسوپوٹامیہ کے علاقہ میں کھدائی کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ طوفان عالمگیر کا تذکرہ کوئی طبع زاد افسانہ نہیں ہے جو لوگوں کو خائف کرنے کے لیے گھڑا گیا ہو۔ بلکہ یہ طوفان واقعی آیا تھا اور اس سے ایک بڑا علاقہ غرقاب ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اور اہم کام انگلستان کے محکمہ اثریات کے سابق ڈائریکٹر جنرل سر لیونارڈ وولے نے انجام دیا تھا۔ وہ اپنی کتاب مقام ار پر حفریاتی کام (Eacvations at Ur) میں لکھتے ہیں۔

ہم ثابت کر چکے ہیں کہ طوفان واقعی آیا تھا اور اس لیے ان امکانات پر زور دینے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ یہ محض سمیری فرمانرواؤں کی فہرست میں شامل ایک داستان ہے۔ یا سمیریوں کا من گھڑت افسانہ ہے یا عہد نامہ عتیق میں بیان کردہ ایک روایت کا طوفان ہے تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعہ کی تمام ہی تفصیلات سچی ہوں البتہ اس روایت کا پس منظر ایک تاریخی حقیقت یقیناً ہے۔ جس میں معلمان اخلاق اور شعراء نے اپنے مختلف النوع مقاصد کے حصول کے پیش نظر واقعہ میں پھول پتیاں ضرور پیدا کیں۔ کتاب پیدائش کا بیان ہے کہ پانی کی بلندی پچیس فٹ تھی جو صحیح معلوم ہوتا ہے..... یہ دریائے دجلہ اور فرات کی وادی میں ایک عظیم سیلاب تھا جس سے پہاڑوں اور صحراؤں کے بیچ کی آباد سرزمین غرقاب ہو گئی تھی اور جو لوگ اس سرزمین میں رہتے تھے۔ اس وقت کی پوری دنیا وہی تھی۔ ان لوگوں میں سے اکثریت غرق ہو گئی تھی اور نہایت قلیل اور شکستہ دل لوگوں کی ایک جماعت ہو گی جس نے شہر کی دیواروں سے پانی کو اترتے ہوئے دیکھا ہو گا...''

کلدانیہ اور اشوریہ تہذیب کے تختیوں پر کندہ اس طوفان کا حال ملا ہے۔ دونوں بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام دنیا میں بداعمالیاں پھیل گئی تھیں جس کی وجہ سے خدا کا یہ قہر گناہگار بندوں پر نازل ہوا اور وہ سب کیفر کردار کو پہنچ گئے۔ کلدانیہ کے طوفان کی تختی میں مرقوم ہے۔

۱۔ ای آ دیوتا نے مجھے کہا۔ ''اہل دنیا مجھ سے باغی ہو گئے ہیں۔

میں انہیں سزا دوں گا.....آسمان سے تباہ کن بارش ہو گی....وقت مقررہ آ گیا ہے۔‘‘

۲۔ میں اپنے ساتھ لایا اور جہاز میں ذخیرہ کر دیا۔ ہر چیز کے تخم کا میں اپنے ساتھ اپنے اہل خاندان، خدمت گاروں، عورتوں اور عزیز ترین دوستوں کو لے آیا۔

۳۔ زسسی ساورا کو کوئی خاص کام تفویض نہیں ہوا۔ بلکہ اسے اور اس کی بیوی دونوں کو حیات ابدی عطا ہوئی۔

سمیری روایات اور جلجمیش کی نظم میں جو اشور بنی پال کے کتب خانہ سے تختیوں پر لکھی ہوئی دستیاب ہوئی ہے۔ اس سیلاب کی حسب ذیل تفصیل ملتی ہے۔

’’اس علاقہ میں برائیاں بہت پھیل گئی تھیں۔ اس لیے دیوتا انسان سے بہت ناخوش ہو گئے تھے چنانچہ انہوں نے انسانی آبادی کو تباہ کر دینے کا ارادہ کیا مگر عذاب بھیجنے سے پہلے زیوسدریا زیوسدو نامی پجاری کو جس کو جلجمیش کی نظم میں اتنشپستم کے نام سے موسوم کا گیا ہے۔ ایک کشتی بنانے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس نے کشتی تیار کی اور دیوتاؤں کے حکم کے مطابق اس میں سونا چاندی، جانور اور اعزہ و اقارب کو سوار کیا۔ اس کے بعد ایک طوفان اٹھا اور خوفناک قسم کی کڑک و چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ چھ دن اور چھ رات تک ایک طرح سے پانی برستا رہا۔ یہاں تک کہ پورا علاقہ غرقاب ہو گیا۔ اور رات

نفشیستم کی کشتی بہتی ہوئی جبل نصیر (یہ پہاڑ موصل اور دریائے دجلہ کے مشرق میں دریائے زاب کے قریب واقع ہے) سے جا کر لگی۔

ساتویں دن جب بارش کا سلسلہ ختم ہوا تو ات نفشیستم نے ایک فاختہ کو کشتی سے اڑایا جو چکر کاٹ کر پھر کشتی میں واپس آ گئی۔ اس سے یہ اندازہ کیا گیا کہ پورا علاقہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے...... چند دنوں بعد پھر کالے کوے کا اڑایا گیا جو واپس نہیں آیا...... ات نفیشستم نے کشتی سے اتر کر قربانی چڑھائی۔''

توریت کتاب پیدائش میں حالات نہایت تفصیل سے دیے گئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

''اور خدا نے زمین کی طرف دیکھا اور زمین معصیت سے بھری ہوئی تھی..... اور خدا نے نوح علیہ السلام سے کہا زمین پر طوفان نازل کروں گا اور زمین پر جو چیزیں ہیں سب مر جائیں گی.... کشتی میں تو بیٹھے گا اور تیرے بیٹے، تیری بیوی اور تیری بیٹوں کی بیویاں، ہر جاندار چیز کا تو ایک جوڑا کشتی میں رکھ لینا تاکہ ان کی نسل قائم رہے اور خدا نے نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کو برکت دی اور ان سے کہا پھلو پھولو اور دنیا کو از سر نو آباد کرو۔''

اہل ہند کی ادبیات میں طوفان کا کئی طریقوں پر ذکر آیا ہے۔ زیادہ تر ضخیم مجموعوں یا تصانیف میں۔ البتہ صرف سیان پران (مچھلی کا پران) میں اس کا علیحدہ ذکر ہے۔ ایک چھوٹے پران دگنی میں اس کا بالاختصار

ذکر ہے مگر طوفان کا مفصل اور مکمل ذکر بھاگوت پران اور مہابھارت میں ہے۔علاوہ ازیں ست پتھ برہمن میں بھی اس کا ذکر موجود ہے جس کی قدامت ویدک زمانہ تک پہنچتی ہے۔واقعہ کا خلاصہ اس طرح ہے:

''ایک صبح کو ''منو'' نہا رہا تھا۔ایک مچھلی اس کے ہاتھ میں آ گئی۔اس مچھلی کی درخواست پر اس نے اس کی پرورش کی۔پہلے ایک برتن میں رکھا پھر تالاب میں، پھر گنگا میں اور پھر سمندر میں۔مچھلی نے بتایا کہ میں پرجاپتی برہمہ ہوں تجھے ایک طوفان کی اطلاع دیتی ہوں۔تو ایک جہاز تیار کر میں طوفان کے وقت تیری مدد کروں گی۔چنانچہ طوفان آیا۔جہاز کی رسی مچھلی کے سینگ سے باندھی اور ہمالیہ تک پہنچ گئی۔'' (مترجم)

۲۔ اب کہ ازمنۂ قدیم کی تاریخ کے بارے میں بعض مقدمات تسلیم کیے جا چکے ہیں اور مرشدانہ متن کے مصنفین کی دی ہوئی فرضی تاریخیں اب قابل یقین نہیں رہی ہیں۔لہذا بائبل میں مندرجہ وہ تاریخیں تیزی سے دبادی گئی ہیں۔تاہم ان نسب ناموں کے سلسلے میں جو محفوظ رکھے گئے ہیں۔ان کتابوں کی جدید شروعات جو عوام کے لیے شائع کی جاتی ہیں قارئین کی توجہ کو ان غلطیوں سے ہٹانے میں ناکام رہتی ہیں جو ان میں شامل ہیں۔

۳۔ و نادی نوح ربه فقال رب ان ابنی من اھلی

و ان وعدک الحق وانت احکم الحکمین... قابل یا نوح انہ لیس من اھلک ج انہ عمل غیر صالح فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم انی اعظک ان تکون من الجھلین...

نوح علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا کہا ''اے رب میرا بیٹا میرے گھر والوں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔''

جواب میں ارشاد ہوا۔

''اے نوح علیہ السلام وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔ لہٰذا اس بات کی تو مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت کو تو نہیں جانتا۔ میں تجھ نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو ....کی طرح نہ بنا لے۔''

۴۔ لفظ ''سات'' یہاں بہت سے کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسا کہ اس زمانے کی سامی زبانوں میں اکثر ہوتا ہے۔

جزءسوم

خروج

حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھیوں کے مصر سے خروج کے ساتھ (کنعان کی طرف ان کے نقل مکانی کے پہلے مرحلہ میں) ہمیں بے حد اہمیت کا ایک واقعہ ملتا ہے ۔ یہ ایک مصدقہ تاریخی واقعہ ہے جو ایک معلوم سیاق کے ساتھ رونما ہوتا ہے ۔

عہد نامہ قدیم میں کتاب خروج، اسفار خمسہ یا توریت کی دوسری کتاب ہے جس کے ساتھ صحرا نوردی کی ایک داستان اور جبل سینا پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد (میثاق بنی اسرائیل) شامل ہے ۔ قرآن کریم کے لیے یہ ایک قدرتی امر تھا کہ وہ بھی اس واقعہ کے بیان کے لیے کافی جگہ وقف کرے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی فرعون کے ساتھ گفتگو اور مصر سے نکلنے کا واقعہ دس سے زیادہ سورتوں میں نہایت طویل بیانات کے ساتھ شامل ہے ۔ مثلاً سورۃ ۷، ۱۰، ۲۰ اور ۲۶ میں نسبتاً مختصر بیانات اور سادہ تنبیہات کے ساتھ جو فرعون کا نام جو مصری فریق کا اہم کردار ہے (میری معلومات کے بموجب) قرآن مجید کی ۲۷ سورتوں میں ۷۴ مرتبہ دہرایا گیا ہے ۔

اس موقع پر قرآن مجید اور بائبل کے بیانات کا مطالعہ خصوصیت سے دلچسپ ہے ۔ اس لیے کہ (مثال کے طور پر) طوفان کے بارے میں خصوصیت جو اختلاف ملتا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں یہاں دونوں بیانات میں بہت سی باتیں

مشترک ہیں۔ یقیناً بعض انحرافات ملتے ہیں۔ لیکن بائبل کے بیانات کی بڑی تاریخی قدرو قیمت ہے جیسا کہ ہمیں معلوم ہوگا۔ یہ بات اس لیے ہے کہ اس سے ہمیں فرعون کا تعین کرنے یا زیر بحث دونوں فرعونوں کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے۔ یہ مفروضہ جو بائبل کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں شامل معلومات سے اس کا تکملہ ہو جاتا ہے۔ ان دو صحیفی ذرائع پر جدید معلومات کا اضافہ ہوا ہے اور اس طرح بائبل، قرآن اور آج کل کی معلومات کے مقابلے میں یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ مقدس صحیفوں کے اس واقعہ کا تعین تاریخی سیاق کے ساتھ کیا جا سکے۔

بائبل کے مطابق واقعہ خروج:

بائبل کے بیان، حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کے مصر میں داخلہ کی یاددہانی کے طور پر بیان ہوا ہے۔ بعد میں بموجب کتاب خروج ۱، ۸:

"تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسف کو نہیں جانتا تھا۔"

ظلم و زیادتی کا دور شروع ہوا۔ فرعون نے یہودیوں (بنی اسرائیل) کو حکم دیا کہ وہ پتوم اور رعمسس کے شہر تعمیر کریں۔ (بائبل میں جو نام دیئے گئے ہیں وہ یہاں استعمال کر دیئے گئے ہیں) (کتاب خروج ۱، ۱۱) یہودیوں کی آبادی میں اضافہ سے بچنے کے لیے فرعون نے ہر نوزائیدہ بچے کو دریا میں پھینک دینے کا حکم دیا۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ان کی حیات کے ابتدائی تین ماہ تک ان کو محفوظ رکھا۔ پھر ان کو دریا کے کنارے سینٹھے سے بنی ہوئی ایک

ٹوکری میں بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔فرعون کی بیٹی کی وہ دکھائی دے گئے۔اس نے ان کو بچالیا اور ایک دائی کے جو خود ان کی والدہ تھیں حوالے کر دیا۔ایسا اس لیے ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن اس جستجو اور ٹوہ میں تھی کہ بچے کو کون نکالتا ہے کچھ ایسے حیلے سے کام لیا کہ گویا وہ ان کو پہچانتی نہیں ہے اور شہزادی کی خدمت میں دائی کی سفارش کی جو اصل میں بچے کی والدہ تھیں۔ان کے ساتھ فرعون کے بیٹوں کا سا سلوک کیا گیا اور نام ''موسیٰ'' رکھا گیا۔

جوانی کے عالم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ملک کی جانب چل دیئے جس کا نام مدین تھا۔وہاں انہوں نے شادی کی اور ایک طویل عرصے تک مقیم رہے۔

اس سلسلہ میں ہم کتاب خروج ۲،۲۳ میں ایک اہم تفصیلی بیان پڑھتے ہیں:

''ایک مدت کے بعد یوں ہوا کہ مصر کا بادشاہ مر گیا۔''

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ مصر جائیں۔فرعون سے ملاقات کریں اور اپنے بھائیوں کو مصر سے نکال لائیں (اس حکم کا ذکر آگ کی جھاڑی کے واقعہ میں دیا گیا ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام نے ان کی اس کام میں مدد کی۔یہی وجہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب لوٹ کر مصر آئے تو وہ اپنے بھائی کے ہمراہ فرعون کی ملاقات کے لیے گئے جو اس بادشاہ کا جانشین تھا جس کے عہد حکومت میں وہ کافی عرصہ قبل پیدا ہوئے تھے۔

فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جماعت کے یہودیوں کو مصر سے نکل جانے سے منع کر دیا۔خدا پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر ہوا اور ان کو حکم دیا کہ

وہ فرعون سے اپنی درخواست کو پھر دہرائیں۔ بائبل کے بیان کے مطابق اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر اسی سال کی تھی۔ معجزہ کے ذریعے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو بتایا کہ مجھے فوق الفطرت قوت حاصل ہے لیکن یہ بات بھی کافی نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے مصر پر مشہور وبا نازل کی۔ دریاؤں کا پانی خون بن گیا۔ پھر مینڈکوں، جوؤں اور مکھیوں کے جھنڈوں کے حملے ہوئے۔ جانور مر گئے۔ انسانوں اور جانوروں کے پھوڑے پھنسیاں نکل آئے۔ ژالہ باری اور ٹڈیوں کی بلائیں، نازل ہوئیں۔ تاریکی چھا گئی۔ پہلوٹی کے بچے مر گئے۔ اس کے باوجود فرعون نے یہودیوں (بنی اسرائیل) کو جانے کی اجازت نہیں دی۔

لہٰذا وہ شہر رعمسس سے نکل پڑے اور بال بچوں کو چھوڑ کر وہ کوئی چھ لاکھ مرد تھے، (خروج ۱۲، ۳۷) اس موقع پر فرعون نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا اور اس نے چھ سو منتخب رتھ بان بلکہ مصر کے سب رتھ لیے اور ان سبھوں میں سرداروں کو بٹھایا اور خداوند نے مصر کے بادشاہ فرعون کے دل کو سخت کر دیا اور اس نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا کیونکہ بنی اسرائیل بڑے فخر سے نکلے تھے۔ (خروج ۱۴، ۶ تا ۸) مصریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جماعت کو سمندر کے قریب جا پکڑا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اٹھایا۔ سمندر ان کے سامنے سے پھٹ گیا اور ان کے ساتھی اس کو اس طرح پار کر گئے کہ ان کے پاؤں تک نہ بھیگے۔ اور مصریوں نے تعاقب کیا۔ اور فرعون کے سب گھوڑے، رتھ اور سواران کے پیچھے پیچھے سمندر کے بیچ میں چلے گئے (خروج ۱۴، ۲۳) پانی پلٹ پڑا اور اس نے رتھوں، سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا

کرتا ہوا سمندر میں مل گیا تھا، غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا۔ لیکن بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیوار کی طرح رہا (خروج ۱۴، ۲۸۔۲۹)

خروج کا متن بالکل واضح ہے۔ فرعون تعاقب کرنے والوں کا قائد تھا۔ وہ بھی غرق ہو گیا۔ کیونکہ خروج کا متن بتاتا ہے کہ ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا۔" علاوہ ازیں بائبل کی اس تفصیل کو مناجاتوں میں دہراتی ہے: مناجات ۱۰۶، آیت ۱۱ اور مناجات ۱۳۶ آیات ۱۳، ۱۵ جو شکر خداوندی کا ایک نمونہ ہے۔

"کس نے سمندر کے پانی کو بانٹ دیا.... اور اسرائیل کو ان کے بیچ سے ہو کر گزر جانے دیا لیکن فرعون اور اس کے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا"

لہٰذا اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ بائبل کے مطابق خروج کے زمانہ کا فرعون سمندر میں ڈوب مرا تھا۔ بائبل میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اس کے جسم کا کیا بنا۔

بائبل کے مطابق سلطنت مصر اور بنی اسرائیل کا خروج نقشہ

MAP

قرآن مجید کے مطابق خروج:

اپنے وسیع خاکہ کے اعتبار سے خروج کے بارے میں جو تفصیل قرآن میں دی گئی ہے وہ ویسی ہی ہے جیسی کہ بائبل میں تاہم اسے یہاں پھر مرتب کیا جاتا ہے کیونکہ یہ سب ان عبارتوں کو جوڑنے سے ترتیب پاتی ہے جو الکتاب میں ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ بائبل کی طرح قرآن بھی کوئی ایسا نام فراہم نہیں کرتا جس سے اس فرعون کی شناخت کی جا سکے جو خروج کے وقت حکمران تھا۔ جو بات معلوم ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے مشیروں میں سے ایک کا نام ہامان تھا۔ قرآن میں اس کا ذکر چھ بار آیا ہے۔ (سورۃ ۲۶ میں آیات ۶، ۸، اور ۳۸ اور سورۃ ۲۹ میں آیت ۳۹ اور سورۃ ۴۰ میں آیات ۲۴ اور ۳۶)

وہ فرعون بنی اسرائیل کو ستانے والا شخص ہے۔

سورۃ ۱۴، آیت ۶:۔

واذ قال موسی لقومه اذکروا نعمة الله علیکم اذ انجکم من ال فرعون یسومونکم سوء العذاب یذبحون ابناء کم و یستحیون نسآء کم.

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا۔ اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے تمہارے لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو چھوڑ دیتے تھے۔“

اسی ظلم کا تذکرہ ان ہی الفاظ میں سورۃ ۷ کی آیت ۱۴۱ میں کیا گیا ہے لیکن قرآن ان شہروں کے ناموں کا ذکر نہیں کرتا جو بائبل میں مذکور ہیں کہ بنی اسرائیل نے بیگار میں تعمیر کیے تھے۔

وہ واقعہ جب موسیٰ علیہ السلام کو دریا کے کنارے چھوڑ دیا گیا تھا۔ سورۃ ۲۰ آیات ۳۹، ۴۰ میں اور سورۃ ۲۸ آیات ۷ تا ۱۸ میں مذکور ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی بیوی لے گئی تھی۔ یہ بات ہمیں سورۃ ۲۸، آیت ۸، ۹ میں ملتی ہے۔

فالتقطه ال فرعون ليكون لهم عدوا و حزنا ط ان فرعون و هامن و جنودهما كانو خطئين... و قالت امرأت فرعون قرت عين لي ولك لا تقتلوه ق عسى ان ينفعنآ او نتخذه ولدا وهم لا يشعرون....

”آخر کار فرعون کے گھر والوں نے اسے (دریا سے) نکال لیا تاکہ وہ ان کا دشمن اور ان کے لیے رنج کا سبب بنے۔ واقعی فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر (اپنی تدبیر میں) بڑے غلط کار تھے۔ فرعون کی بیوی نے اس سے کہا۔ یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

اسے قتل نہ کرو۔ کیا عجب کہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں اور وہ (انجام) سے بے خبر تھے۔''

مسلمانوں کی روایت کے مطابق یہ فرعون کی بیوی آسیہ تھیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کی تھی۔ قرآن کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پالنے والی فرعون کی اہلیہ نہیں تھی بلکہ اس کے گھر والے (دیگر افرادِ خاندان) تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جوانی، ان کے مدین میں قیام اور ان کی شادی کا ذکر سورۃ ۲۸ کی آیات ۳۰ تا ۳۵ میں ہوا ہے۔

خصوصیت سے جلتی ہوئی جھاڑی کا واقعہ سورۃ ۲۰ کے پہلے حصہ اور سورۃ ۲۸ کی آیات ۱۳ تا ۲۸ میں ہوا ہے۔

قرآن میں ان دس بلاؤں اور وباؤں کا ذکر نہیں ہے جو عذاب خداوندی کے طور سے مصر پر نازل کی گئی تھیں (اور یہ بات بائبل کے طویل تذکرہ کے خلاف ہے) بلکہ نہایت اختصار سے محض پانچ بلاؤں کا ذکر کر دیا گیا ہے (سورۃ ۷ آیت ۱۳۳) سیلاب، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک اور خون۔

مصر سے فرار کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے لیکن بغیر کسی ان جغرافیائی تفصیلات کے جو بائبل میں دی گئی ہیں۔ نہ ہی اس میں لوگوں کی وہ ناقابل یقین تعداد مذکور ہے جس کا حوالہ بائبل میں ہے۔ یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ چھ لاکھ مرد مع اپنے اہل وعیال کے ایک طویل عرصہ تک صحرا میں رہ سکے ہوں گے۔ جیسا کہ بائبل میں ہمیں یقین دلایا گیا ہے۔

سورۃ ۲۰، آیت ۷۸:۔

فـاتـبـعهـم فــرعـون بـجـنـوده فغشيهـم من اليـم مـا غشيهـم...

''پیچھے سے فرعون اپنے لشکر لے کر پہنچا اور پھر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔''

بنی اسرائیل بچ کر نکل گئے۔ فرعون غرق ہو گیا لیکن اس کا جسم مل گیا۔ یہ ایک نہایت اہم تفصیل ہے جس کا بائبل کے بیان میں کوئی حوالہ نہیں۔

سورۃ ۱۰، آیات ۹۰ تا ۹۲: باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

و جـوزنـا بـبـنـی اسـرآئـیـل الـبـحـر فـاتبعهم فرعون وجـنـوده بـغيا و عدوا ط حتی اذآ ادرکه الغرق لا قال امـنـت انـه لآ الـه الا الذی امنت به بنوآ اسرآئیل وانا من الـمـسـلـمیـن... آلـئـن و قـد عـصـیـت قبل و کـنـت من الـمـفـسـدیـن .. فــالـیـوم نـنـجـیـک ببدنک لتکون لمن خلفک ایة ط و ان کثیرا من الناس عن ایتنا لغفلون...

''اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گذار لے گئے پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا۔ میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی، اس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔ (جواب دیا گیا) اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تو تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد کرنے والوں میں

سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تا کہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنے اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں۔''

اس عبارت میں دو نکات قابل تشریح ہیں۔

الف۔ بغاوت اور دشمنی کا جذبہ جن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس کوشش کی روشنی میں سمجھنا چاہیے جو آپ نے فرعون کو ترغیب دینے کے سلسلے میں کی۔

ب۔ فرعون کی لاش کو بچانے کا ذکر ہے۔ کیونکہ یہ بات سورۃ ۱۱، آیت ۹۸ میں بالکل واضح طور پر بتا دی گئی ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو مردود قرار دے دیا ہے۔

سورۃ۱۱، آیت ۹۸:۔

یقدم قومہ یوم القیمۃ فاوردھم النار ط

''فرعون قیامت کے روز اپنی قوم کے آگے آگے ہو گا اور اپنی پیشوائی میں انہیں دوزخ کی طرف لے جائے گا۔''

لہٰذا ان حقائق کے لیے جن کو تاریخی، جغرافیائی اور اثریاتی معلومات کی روشنی میں جانچا جا سکتا ہے۔ اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن اور بائبلی بیانات میں حسب ذیل نکات پر اختلاف ہے۔

قرآن میں مقامات کے ناموں کی غیر موجودگی، وہ دونوں شہر جن کی تعمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جماعت کے بنی اسرائیل نے کی تھی اور جو اس راستہ پر

واقع تھے جوخروج کے وقت استعمال ہوا۔

جس زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مدین میں قیام تھا اس وقت کسی فرعون کے مرنے کے حوالے کی غیر موجودگی۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اپنا پیغام پہنچایا اس وقت آپ کی عمر سے متعلق تفصیلات کی قرآن میں غیر موجودگی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی تعداد کی قرآن مجید میں غیر موجودگی ۔یہ اعداد صاف طور پر بائبل میں نا قابل یقین حد تک مبالغہ آمیز طریقے پر بیان کیے گئے ہیں (جن کو چھ لاکھ مرد جمع ان کے اہل وعیال کے کل ملا کر ۲۰ لاکھ سے زیادی کی ایک قوم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔)

فرعون کے مرنے کے بعد اس کے جسم کو بچانے کے تذکرہ کی بائبل میں عدم موجودگی ۔ ہمارے موجودہ مقصد کے لیے قابل غور نکات حسب ذیل ہیں کیونکہ ان میں دونوں بیانات شریک ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جماعت کے بنی اسرائیل پر ظلم وستم کا تذکرہ قران میں شامل ہے اور اس سے اس بات کی توثیق وتصدیق ہوتی ہے۔

دونوں بیانات میں شاہ مصر کے کسی تذکرہ کا فقدان۔

خروج کے وقت فرعون کی موت کا ذکر۔قرآن اور اس سے اس واقعہ کی تصدیق۔

مقدس صحیفوں کی معلومات اور جدید معلومات کے درمیان مقابلہ

جو مدت بنی اسرائیل نے مصر میں گزاری، بائبل اور قرآن میں شامل اس سے متعلق بیانات اور جس طرح وہ وہاں سے نکلے۔ اس سے کچھ ایسی باتیں پیدا ہو گئی ہیں جن کا مقابلہ جدید معلومات سے کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں یہ توازن نہایت غیر مساوی ہے۔ اس لیے کہ کچھ معلومات تو ایسی ہیں جو بہت سے مسائل کو جنم دیتی ہیں جب کہ دیگر معلومات، بمشکل بحث کا موضوع بن سکتی ہیں۔

۱۔ بیانات میں شامل بعض تفصیلات کا جائزہ

بنی اسرائیل مصر میں:

بظاہر یہ کہنا قطعاً ممکن ہے (اور اس میں غلطی ہونے کا بہت کم خطرہ ہے) کہ بائبل کے بموجب (پیدائش ۱۵، ۱۸ اور خروج ۱۲، ۴۰) بنی اسرائیل مصر میں ۴۰۰ سال سے لے کر ۴۳۰ سال تک رہے۔ کتاب پیدائش اور کتاب خروج کے مابین اس فرق کے باوجود جو نہایت کم اہمیت رکھتا ہے، یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ مدت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد میں شروع ہوئی جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کے ساتھ مصر میں منتقل ہوئے۔ بہ استثنائے بائبل جس میں مذکورہ بالا معلومات دی گئی ہیں اور قرآن مجید جس میں مصر کی جانب منتقلی کا حوالہ تو ملتا ہے لیکن تاریخوں کا جو اس

سلسلہ میں آتی ہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی دستاویز نہیں ہے جس سے ہمیں اس بارے میں کوئی روشنی ملتی ہو۔

دور حاضر کے شارحین جن کا سلسلہ پی مونتے سے دانیال روپ تک چلا گیا ہے خیال کرتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی مصر میں آمد سترہویں صدی قبل مسیح میں ہیکسوس (۱) کی مصر میں منتقلی کے ساتھ مستطبق ہوتی ہے اور یہ کہ غالباً ایک ہیکسوس فرمانروا نے نیل کے ڈیلٹے میں ایوارس کے مقام پر ان کا نہایت خندہ جبینی سے استقبال کیا۔

بلا شبہ یہ قیاس اس بیان سے صریحاً متناقض ہے جو بائبل میں شامل ہے (سلاطین ۶، ۱) اس کے مطابق مصر سے خروج کا زمانہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے معبد کی تعمیر (تقریباً ۹۷۱ ق م) سے ۴۸۰ سال قبل قرار پاتا ہے۔ اس لیے اندازہ کے مطابق خروج کو ۱۴۵۰ ق م کے قریب سمجھنا پڑے گا اور نتیجہ میں مصر میں ورود ۱۸۸۰۔۱۸۵۰ ق م کے قریب قرار پائے گا لیکن یہ ٹھیک وہی زمانہ ہے جب خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حیات تھے (۲) اور دوسری تفصیلات جو بائبل میں شامل ہیں، ان سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے درمیان کا زمانہ ۲۵۰ سال تھا۔ اس لیے بائبل میں ۱۔ سلاطین کی یہ عبارت تاریخی نقطۂ نظر سے ناقابل قبول ہو جاتی ہے (۳) ہم دیکھیں گے کہ جو نظریہ یہاں ۱۔ سلاطین سے لے کر پیش کیا گیا ہے، اس میں صرف یہی ایک اعتراض ہے جس کو اس کے مقابلے میں مسترد کرنا ہے۔ ان تاریخی معلومات کی نہایت صاف وصریح غلطی اس اعتراض کی قدر و قیمت کو موثر طریقے پر زائل کر

دیتی ہے۔

مقدس صحیفوں سے ہٹ کر بنی اسرائیل نے مصر میں اپنے قیام کے جو اثرات چھوڑے ہیں، وہ نہایت دھندلے ہیں۔ تاہم کئی ہیروغلافی دستاویزات ایسی ہیں جو مصر میں ایسے مزدوروں کی جماعت کے وجود کا حوالہ دیتی ہیں جو اپیرو، ہاپرو اور ہابرو کہلاتی تھی جن کو (صحیح یا غلط طریقہ سے) عبرانیوں سے مطابقت دی جاتی ہے۔ اس جماعت میں تعمیراتی کام کرنے والے، زراعت سے متعلق مزدور، کھیتی کاٹنے والے لوگ وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن یہ لوگ کہاں سے آئے تھے؟ اس سوال کا جواب پانا مشکل ہے۔ فادر دے وو نے ان کے بارے میں حسب ذیل تحریر پیش کی ہے:

''وہ مقامی آبادی کے افراد نہیں ہیں، اور نہ وہ خود کا معاشرہ میں کسی جماعت کی حیثیت سے روشناس کرتے ہیں۔ ان سب کا نہ ایک پیشہ ہے اور نہ ایک مرتبہ۔''

تحوتمس سوم کے زیر حکمرانی ان کا حوالہ اصطبل میں کام کرنے والوں کی حیثیت سے ایک پاپیرس پر لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ کس طرح پندرہویں صدی قبل مسیح میں ایمنوفس دوم ان کے ۳۶۰۰ آدمیوں کو کنعان سے اسیر کر کے لایا تھا اور جیسا کہ فادر دے وو کا کہنا ہے۔ ''ان میں ایک بڑی تعداد شامی فلسطینی آبادی کی تھی۔ تقریباً ۱۳۰۰ ق م سیتھوس اول کے تحت اپیرو نے کنعان کے علاقہ بیت شین میں بڑا فتنہ وفساد و برپا کیا تھا۔ رعمسس دوم کے دور حکمرانی میں ان میں سے کچھ لوگ پتھر کی کانوں میں کام کرنے کے لیے مقرر کیے

گئے اور کچھ ان ستونوں کی نقل وحمل کے کام پر مامور ہوئے جو فرعون کے تعمیری کاموں میں استعمال ہوتے تھے۔ (مثلاً رعمسس میامون کا ایک عظیم باب ہیکل) ہمیں بائبل سے پتہ چلتا ہے کہ رعمسس دوم کے دور حکمرانی میں عبرانی شمالہ پایۂ تخت رعمسس کی تعمیر کا کام انجام دے رہے تھے۔ مصری تحریروں میں بارہویں صدی قبل مسیح کے دوران اپیرو کا پھر ذکر آتا ہے اور آخر میں رعمسس سوم کے زمانہ میں بھی ان کا حوالہ ملتا ہے۔

لیکن 'اپیرو' کا مصر میں کوئی مذکور نہیں۔ لہذا اس لفظ کا اطلاق کلیتہً ہیبریو (عبرانی) پر ہوتا ہے۔ غالباً اس بات کی یاد دہانی کرانا بہتر ہوگا کہ اس لفظ کا استعمال شروع میں ''زبردستی بیگار لیے جانے والے مزدوروں'' کے لیے ہوا ہوگا۔ اس میں ان کی اصل نسل سے کوئی سروکار نہیں رہا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں ایک ایسی صفت بن گیا جس سے کسی شخص کے پیشے کا اظہار ہوتا تھا۔ ہم اس سلسلے میں ایک لفظ سوئیس (سوئس) کے ساتھ قائم کرسکتے ہیں جس کے فرانسیسی زبان میں کئی مختلف مفاہیم ہیں۔ اس کے معنی سوئٹزرلینڈ کا باشاہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کو قدیم فرانسیسی بادشاہت کا ایک کرائے کا سپاہی بھی سمجھا جا سکتا ہے جو سوئس نسل کا ہوتا تھا۔ اس سے مراد پاپائی محلسرا کا ایک محافظ بھی ہے اور عیسائی گرجا گھر کا ایک ملازم بھی۔

بہر حال ہوسکتا ہے کہ رعمسس دوم کے زمانے میں عبرانی (بائبل کے مطابق) یا اپیرو (ہیروغلیفی متن کے بموجب) نے ان کاموں میں حصہ لیا ''جن کا حکم فرعون نے دیا تھا اور جو حقیقتاً زبردستی کی بیگار تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

رعمسس دوم بنی اسرائیل کو ستانے اور ان پر ظلم کرنے والا فرعون تھا۔ رعمسس اور پتھون جن کا ذکر کتاب خروج میں آیا ہے، دریائے نیل کے ڈیلٹے کے مشرقی حصے میں واقع ہیں۔ آج کے تیونس اور قنطر جن کے درمیان تقریباً پندرہ میل کا فاصلہ ہے۔ اسی علاقے میں واقع ہیں۔ جہاں یہ دونوں شہر آباد تھے۔ شمالی صدر مقام جس کی تعمیر رعمسس دوم نے کی تھی۔ وہیں واقع تھا۔ لہذا رعمسس دوم ہی ظلم کرنے والا فرعون تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے ماحول میں پیدا ہوئے۔ دریا کے پانی سے ان کے بچ کر نکل جانے کا حال مختصراً اوپر بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کا ایک مصری نام پی مانتے نے اپنی کتاب مصر اور بائبل (لے ژپت اے لا بائبل) (۴) میں بتایا ہے کہ میسیو یا میسی وہ اعلام ہیں جو ہیروغلفی زبان کی لغت میں جس کو رینک نے مرتب کیا ہے درج ہے موسیٰ اسی لفظ کی نقل جو قرآن میں دی گئی ہے۔

مصر میں جو بلائیں نازل ہوئیں:

اس عنوان کے تحت بائبل میں دس ہزار سزاؤں کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئیں۔ اور ان ''بلاؤں'' میں سے ہر ایک کے متعلق متعدد تفصیلات دی گئی ہیں بہت سی کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے فوق الفطرت ہیں۔ قرآن مجید میں محض پانچ بلاؤں کا ذکر ہے جو بڑی حد تک قدرتی حوادث کی صرف مبالغہ آمیز شکل ہے۔

بائبل میں ٹڈیوں اور مینڈکوں کے نہایت تیز رفتاری سے اضافہ کا ذکر ہوا

ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ دریا کا پانی خون میں تبدیل ہو جاتا ہے اور تمام سر زمین میں سیلاب آ جاتا ہے۔قرآن میں بھی خون کا تذکرہ ہے لیکن بغیر کسی اضافی تفصیلات کے ۔خون کے اس ذکر کے موضوع پر انواع و اقسام کے مفروضے اختراع کرنا ممکن ہے طوفان، جراد،قمل ،صفادع اور دم اور دیگر بلائیں جن کا ذکر بائبل میں ہے (مچھر) مکھیوں کے گچھے، پھوڑے پھنسیاں، ژالہ باری، تاریکی، پہلوٹی کے بچوں اور مویشیوں کا مرنا) ان کے متعدد ماخذات ہیں ۔جیسا کہ طوفان کی حالت میں ہم دیکھ چکے ہیں اور مختلف منابع کی عبارتوں کو باہم ملا کر ان کو تشکیل دی گئی ہے۔

خروج کا راستہ:

قرآن مجید میں اس کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے جب کہ بائبل میں اس کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (خروج باب ۱۲ تا باب ۱۷) فادر دے وو اور پی مانتے نے اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔نقطۂ آغاز غالباً تینس وقینطیر کا علاقہ تھا۔ لیکن باقی راستہ کے کوئی ایسے نشانات نہیں ملے جو بائبل کے بیان کی توثیق کرتے ۔نہ اب یہ بتانا ممکن ہے کہ وہ مقام ٹھیک کہاں تھا جہاں پانی کے پھٹنے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ہمراہیوں کے لیے راستہ بنا تھا۔

پانی کا معجزانہ طور پر پھٹنا:

بعض شارحین نے اس کو غالبًا فلکیاتی اسباب کی بناء پر ایک مدوجذر کا واقعہ خیال کیا اور بعض نے اس کو کسی دور افتادہ مقام پر ہونے والے آتش فشانی کے عمل سے متعلق ایک زلزلہ سمجھا۔ بنی اسرائیل اترتے ہوئے پانی سے فائدہ اٹھا سکتے تھے اور مصری ان کے تعاقب کے جوش میں مدی لہر کے سبب بہ سکتے تھے لیکن یہ سب کچھ ایک خالص مفروضہ ہے۔

۲۔ فرعونوں کی تاریخ میں خروج کا زمانۂ وقوع:

زمانے کے لحاظ سے خروج کا واقعہ جس وقت ہوا، اس کے سلسلے میں زیادہ مثبت شہادت تک رسائی ہونا ممکن ہے۔ ایک طویل عرصے تک رعمسس دوم کے جانشین مرنفتاح کو خروج کے وقت کا فرعون گردانا جاتا رہا۔ اس صدی کے شروع کے ماہر مصریات ماسپیرو نے اپنی کتاب رہنمائے عجائب گھر قاہرہ برائے سیاح ۱۹۰۰ء گبید ڈوو زمتو ڈرمتو ڈرمو سے ڈوکیرو) میں لکھا تھا کہ "غالبًا اسکندری روایت کے موجب مرنفتاح خروج کے زمانے کا فرعون تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بحیرہ احمر (بحیرہ قلزم) میں ڈوب مرا تھا۔" میں ان دستاویزات کے حصول میں ناکام رہا جن کی بنیاد پر ماسپیرو نے یہ ادعاء کیا تھا لیکن اس شارح کی عظمت و برتری ہم سے متقضی ہے کہ اس کے دعویٰ کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیں۔

پی مانتے کے علاوہ بہت کم ماہرین مصریات یا بائبل کے ماہر مفسرین ایسے ہیں

جنہوں نے اس مفروضہ کی موافقت یا مخالفت میں جانے والے دلائل کے سلسلے میں تحقیقات کی ہو۔ لیکن پچھلے چند سالوں میں مختلف مفروضوں کا ایک سیلاب امنڈ آیا ہے جن کا واحد مقصد کتاب مقدس میں بیان کردہ کسی ایک تفصیل پر مبنی شہادت کو حق بجانب ثابت کرنا ہے حالانکہ ان مفروضوں کے حالق کتب مقدسہ کے دیگر پہلوؤں سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔ اس طرح ممکن ہے کہ یکایک کوئی ایسا مفروضہ نمودار ہو جائے جو کسی بیان کے ایک پہلو سے مطابقت رکھتا ہو۔ باوجودیکہ اس کے موجد نے کتب مقدسہ میں دی ہوئی (اور نتیجتاً بائبل میں پیش کردہ دیگر معلومات) جمع تاریخ، اثرات وغیرہ کے ذریعے فراہم شدہ نتائج سے اس کا موازنہ ومقابلہ کرنے کی زحمت نہ کی ہو۔

ایک عجیب ترین مفروضہ جو ابھی تک منظر عام پر آیا ہے وہ جے وی مائیکلی (۱۹۶۰ء) کا ہے جنہوں نے خروج کی تاریخ کا پوری طرح تعین دن کی حد تک کر دیا ہے یعنی ۹ اپریل ۱۴۹۵ ق م وہ اپنی معلومات کے لیے کلی طور پر ان حسابات پر بھروسہ کرتے ہیں جو انہوں نے تقویم سے حاصل کی ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ اس وقت مصر میں تحوتمس دوم حکومت کر رہا تھا۔ یعنی وہی خروج کے زمانے کا فرعون ہے۔ اس مفروضہ کی توثیق اس واقعہ سے کی گئی ہے کہ تحوتمس دوم کی ممی میں جسم کی کھال پر کچھ داغ دھبے نظر آتے ہیں۔ یہ شارح صاحب (یہ وضاحت کیے بغیر کہ ایسا کیوں ہے؟) ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ وہ برص کے مرض کے سبب سے ہیں اور مصر میں نازل ہونے والی بلاؤں میں سے جن کا بائبل میں تذکرہ ہے۔ یہ بلا جسم کے اوپر پھوڑے پھنسیوں کی شکل میں آئی تھی۔ اس تردد آمیز اختراع کی

بائبل کے بیان میں شامل دیگر حقائق کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ خصوصیت سے شہر رعمسس کا تذکرہ جو بائبل میں ہے اور جو ہر اس مفروضے کو جس میں خروج کے واقعہ کو رعمسس کے عہد سے پہلے کا بتایا گیا ہو مسترد کر دیتا ہے۔

جہاں تک تحوتمس دوم کے جسم پر داغ دھبوں کا تعلق ہے۔ وہ اس نظریہ کی تائید میں نہیں جاتے جو مصر کے اس بادشاہ کو خروج کے وقت کا فرعون ثابت کرتا ہے اس لیے کہ اس کے بیٹے تحوتمس سوم اور اس کے پوتے ایمینوفس دوم کے جسموں پر بھی جلدی پھوڑوں کے نشانات موجود ہیں۔ لہذا بعض شارحین نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ یہ ایک خاندانی مرض تھا۔ بنا بریں تحوتمس دوم کا نظریہ قابل قبول نہیں ہے۔

یہ بات وائل روپس کے نظریے کے لیے صحیح ہے جو انہوں نے کتاب ''بائبل کے لوگ'' (لو پیوپل دے لا بائبل) میں پیش کیا ہے۔ وہ ایمینوفس دوم کو خروج کے وقت کا فرعون قرار دیتے ہیں۔ اس کی بنیاد بھی سابقہ نظریہ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتی۔ یہ عذر پیش کر کے کہ ایمینوفس دوم کا باپ (تحوتمس سوم) بڑا قوم پرست تھا۔ دانیل روپس، ایمینوفس دوم کو بنی اسرائیل کو باندھے رکھنے والا شخص قرار دے دیتے ہیں۔ جس نے موسیٰ علیہ السلام کو اندر داخل کیا تھا (حالانکہ ہماری سمجھ میں اس کی وجہ کبھی نہ آئی)۔

فادر دے وو کا نظریہ کہ یہ شخص رعمسس دوم تھا کسی قدر مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ اپنی کتاب ''اسرائیل کی قدیم تاریخ'' (ہستوار آنسین اسرائیل) میں ان بنیادوں پر اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا نظریہ بائبل کے

بیان کے ہر نقطہ کی تائید نہیں کرتا۔تب بھی کم ازکم وہ ایک نہایت اہم شہادت کوتو منظر عام پر لاتا ہے۔رعمسس اور پتھوں کے شہروں کی تعمیر جو رعمسس کے عہد حکمرانی میں ہوئی تھی اس کا ذکر بائبل کے متن میں ملتا ہے۔اس لیے یہ خیال کرنا ممکن نہیں کہ خروج کا واقعہ رعمسس دوم کی تخت نشینی سے پہلے ہوا ہو۔ڈریوٹن اور وینڈرس کی توقیت کے مطابق یہ ۱۳۰۱ ق م کا وقوعہ ہے اور روٹن کے بموجب اس کا سنہ ۱۲۹۰ ق م میں قرار پاتا ہے۔باقی دو مفروضے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے حسب ذیل ضروری واقعہ کی بناء پر نا قابل قبول ہیں۔رعمسس دوم ظلم کرنے والا وہ فرعون ہے جس کا حوالہ بائبل میں دیا گیا ہے۔

فادر دے وو کا خیال ہے کہ خروج کا واقعہ رعمسس دوم کے عہد حکومت کے پہلے نصف حصہ میں یا اس کے وسط میں رونما ہوا۔اس اعتبار سے اس واقعہ کی تاریخیں غیر متعین ہیں۔وہ یہ زمانہ اس لیے تجویز کرتے ہیں۔تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اوران کے ساتھیوں کو کنعان میں آباد ہونے کا موقع نکال لیں اور رعمسس دوم کے جانشین فرعون مرنفتاح کو جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد سرحدوں پر امن وامان قائم کیا۔بنی اسرائیل کو منفق کرنے کے لیے وقت مل جائے جو اس کے دور حکومت کے پانچویں سال کے واقعات میں ریشمی کپڑے کے ایک ٹکڑے پر لکھا ہوا ملا ہے۔

اس نظریئے کے خلاف دو دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں۔

الف۔ بائبل سے ظاہر ہوتا ہے (خروج ۲،۲۳) کہ مصر کا بادشاہ اس زمانہ میں مرگیا تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں تھے۔اس

بادشاہ کو کتاب خروج میں وہ ۔۔۔ بادشاہ بتایا گیا ہے جس نے بنی اسرائیل سے بیگار میں رعمسس اور پتھوم کے شہر تعمیر کرائے تھے۔ یہ بادشاہ رعمسس تھا۔لہذا خروج کا واقعہ موخر الذکر کے جانشین کے دور حکمرانی میں ظہور پذیر ہوسکتا تھا۔لہذا فادر دے وو بائبل کی کتاب خروج کی آیت ۲۳ باب ۲ کے ذریعے پر شبہ کا اظہار کرتے ہیں۔

ب۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ فادر دے وو بائبلیکل سکول یروشلم کے ڈائریکٹر کی حیثیت کے باوجود اپنے خروج کے نظریے میں بائبل کی ان دو ضروری عبارتوں کا حوالہ نہیں دیتے۔ جو دونوں کی دونوں اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ بنی اسرائیل کے فرار کے وقت تعاقب کے دوران یہ بادشاہ مر گیا تھا۔ یہ تفصیل اس امر کو ناممکن بنا دیتی ہے کہ خروج کا واقعہ کسی دور حکومت کے ختم ہونے کے علاوہ کسی اور وقت پر رونما ہوا ہو۔

یہ چیز دہرانی پڑے گی کہ اس بات میں بہت کم شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں فرعون کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔خروج کے ابواب ۱۳، ۱۴ اس مسئلے سے متعلق قطعاً واضح ہیں۔ ''تب اس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا...'' (خروج ۱۴، ۶ اور ۱۴، ۸)۔ ''اور پانی پلٹ کر آیا اور اس کے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا۔'' (خروج ۱۴، ۲۸ اور ۲۹)

ان آیات کے علاوہ مناجات ۱۳۶ سے بھی فرعون کی موت کی تصدیق ہوتی ہے اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی تھا ''جس نے فرعون اور اس کے لشکر کو سینٹھوں کے سمندر میں غرق کر دیا۔'' (مناجات ۱۳۶، ۱۵) اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ حیات میں ایک فرعون تو اس وقت مرا جب وہ مدین میں تھے اور دوسرا خروج کے دوران مرا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک نہیں بلکہ دو فرعون تھے۔ ایک ظلم و زیادتی کے وقت اور دوسرا مصر سے خروج کے دوران صرف ایک فرعون (یعنی رعمسس دوم) کا نظریہ جو فادر دے وو نے پیش کیا تشفی بخش نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے ہر بات کی توجیہ و تاویل نہیں ہوتی۔ حسب ذیل مشاہدات اس نظریہ کے خلاف مزید دلائل ہیں۔

۳۔ رعمسس دوم۔ ظلم و ستم کرنے والا فرعون:

مرنفتاح۔ خروج کے وقت کا فرعون

پی مانتے نے نہایت فراست کے ساتھ اس ابتدائی سکندری روایت کو دہرایا ہے جس کا ذکر ماسپیرو نے کیا ہے۔ یہ اسلامی روایت میں کافی بعد میں ملتی ہے۔ نیز کلاسیکی عیسائی روایت میں بھی یہ بہت بعد میں ملتی ہے۔ یہ نظریہ مانتے کی کتاب مصر اور بائبل (لا ژیپت اے لو بیبل) میں ظاہر کیا گیا ہے اور اضافی دلائل

کے ساتھ اس کی حمایت کی گئی ہے۔ یہ دلائل بالخصوص اس بیان پر مبنی ہیں جو قرآن مجید میں دیا گیا ہے اور جس کا مشہور ماہر اثریات کوئی حوالہ نہیں دیتا لیکن ان کا جائزہ لینے سے قبل ہم بائبل سے رجوع کریں گے۔

کتاب الخروج میں لفظ رعمسس کا ایک حوالہ ملتا ہے اگرچہ فرعون کے نام کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بائبل میں رعمسس ان شہروں میں سے ایک کا نام بتایا گیا ہے جو بیگار کے طور پر بنی اسرائیل نے تعمیر کیے تھے۔ آج ہمیں معلوم ہے کہ یہ شہر تینس و قنطر کے علاقہ کا ایک حصہ ہیں جو نیل کے مشرقی ڈیلٹے میں ہے۔ اس علاقہ میں جہاں رعمسس دوم نے اپنا شمالی پایہ تخت بنایا تھا، اس سے پہلے کی دوسری تعمیرات بھی تھیں۔ لیکن وہ شخص رعمسس دوم ہی تھا جس نے اس کو ایک اہم مقام بنایا جیسا کہ ان اثریاتی کھدائیوں سے بخوبی ظاہر ہوا ہے جو گذشتہ چند سالوں میں کی گئی ہیں۔ اس کی تعمیر میں اس نے بنی اسرائیل کو جو غلام بنا لیے گئے تھے مزدوری میں پکڑا۔

آج جب کوئی شخص بائبل میں لفظ رعمسس پڑھتا ہے تو اس کو خصوصیت سے کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ ایک سو ساٹھ سال کا عرصہ ہوا جب سے شمپولین نے ان نشانات کا جائزہ لے کر جو اس لفظ کو ظاہر کرتے تھے۔ ہیروغلفی رسم الخط کی کنجی دریافت کی ہے اس وقت سے یہ لفظ ہمارے لیے بہت عام ہو گیا ہے۔ اس لیے آج ہم اس کو پڑھنے اور اس کا تلفظ کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور یہ بھی جان گئے ہیں کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہیروغلفی رسم الخط کا مفہوم تقریباً تیسری صدی قبل مسیح میں گم ہو گیا تھا اور یہ کہ رعمسس کا نام سوائے

بائبل اور چند اور کتابوں کے جو یونانی اور لاطینی زبانوں میں لکھی گئیں، مشکل سے ہی کہیں اور محفوظ رہ گیا تھا اور ان تحریروں میں بھی اس لفظ کو کم یا زیادہ حد تک بگاڑ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹاسی ٹس اپنے ''وقائع'' میں ''رہامسس'' کا ذکر کرتا ہے لیکن بائبل نے اس نام کو جوں کا توں رکھا ہے۔ اس کا تذکرہ اسفار خمسہ یا توریت میں چار جگہ ہوا ہے۔

(پیدائش ۴۷، ۱۱۔ خروج ۱، ۱۱ اور ۱۲، ۳۷۔ گنتی ۳۳، ۳ اور ۳۳، ۶)

رعمسس کے لیے عبرانی لفظ بائبل میں دو طرح سے لکھا جاتا ہے۔ رعمسس یا راعیس ''بائبل کے یونانی متن میں جو ''ہفتادی ترجمہ'' کے نام سے موسو ہے'' یہ ''رامیسے'' ہے۔ لاطینی متن (ولگیٹ) میں یہ لفظ ''راعمسیس'' لکھا ہوا ہے۔

بائبل کے ''کلیمنتی''، متن میں جو فرانسیسی میں ہے۔ (اشاعت اول ۱۹۲۱ء)

یہ لفظ اسی طرح ہے یعنی ''راعمسیس''، جس زمانہ میں شامپولین نے اس شعبہ میں کام کیا اس وقت فرانسیسی اشاعت ہی رائج تھی۔ اپنی کتاب ''قدیم مصریوں کے ہیروغلیفی طرز کے خلاصہ'' (بریسی ڈوسسٹم ہیروغلیفک دے آنسیا نا یژپسین۔ اشاعت ثانی ۱۸۲۸ء صفحہ ۲۷۸) میں شامپولین نے اس لفظ کے بائبل کے ہجوں کو اختیار کیا۔

اس طرح بائبل نے معجزانہ طور پر رعمسس کے نام کو اپنے عبرانی، یونانی اور لاطینی متون میں قائم و برقرار رکھا۔

صرف گذشتہ معلومات ہی حسب ذیل باتوں کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

الف۔ خروج کا کسی رعمسس کی مصر میں تخت نشینی سے قبل کوئی سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا۔ (یہ نام مصر کے ابا دشاہوں کا ہوا ہے)

ب۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس فرعون کے دور حکومت میں پیدا ہوئے جس نے رعمس اور پتھون کے شہر تعمیر کیے تھے یعنی رعمس دوم۔

ج۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں تھے اس وقت حکمران فرمانروا (یعنی رعمس دوم) مر گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت کا سلسلہ رعمس دوم کے جانشین مرنفتاح کے دور حکومت میں جاری رہا۔

جو بات اس سے بھی بڑھ کر ہے وہ یہ ہے کہ بائبل میں اور بھی انتہائی اہم معلومات ایسی موجود ہیں جو خروج کو فراعنہ کی تاریخ میں متعین کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ یہ وہ بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر اس وقت اسی سال تھی جب بحکم ربی انہوں نے فرعون کو ترغیب دی کہ وہ ان کے بھائی بندوں کو رہائی دے۔ ''اور موسیٰ علیہ السلام اسی برس اور ہارون تیراسی سال کا تھا جب وہ فرعون سے ہم کلام ہوئے۔'' (خروج ۷، ۷) لیکن دوسری جگہ بائبل سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے (خروج ۲، ۲۳) کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت کا حکمران فرعون مر گیا، جب کہ موخر الذکر کا قیام مدین میں تھا۔ اگر چہ بائبل کا بیان حکمران کے نام میں کسی تبدیلی کا ذکر کیے بغیر جاری رہتا ہے۔ بائبل کے یہ دونوں بیانات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قیام مصر میں تھا، اس وقت دونوں فرعونوں کے دور حکومت کے سالوں کی مجموعی تعداد کم از کم اسی رہی ہوگی۔ (۵)

کہا جاتا ہے کہ رعمسس دوم نے ۶۷ سال تک حکومت کی۔ (۱۳۰۱ تا ۱۲۳۵ ق م) ڈریوٹن اور ویینڈیر کی توقیت کے بموجب اور ۱۲۹۰ تا ۱۲۲۴ ق م (۶) راؤٹن کے مطابق لیکن جہاں تک اس کے جانشین مرنفتاح کا تعلق ہے ماہرین مصریات اس کے دور حکومت کی صحیح تاریخوں کا تعین نہیں کر سکے۔ تاہم اس کا دور کم از کم دس سال رہا۔ اس لیے جیسا کہ فادر دے وو بتاتے ہیں، دستاویزات اس کے دور کے دسویں سال کی شہادت پیش کرتی ہیں۔ مرنفتاح کے لیے ڈریوٹن اور ویینڈیر دو امکانات پیش کرتے ہیں یا تو دس سالہ دور ۱۲۳۴ الغایۃ ۱۲۲۴ ق م یا بیس سالہ دور حکومت ۱۲۲۴ تا ۱۲۰۴ ق م۔ ماہرین مصریات کے پاس کوئی صحیح وضاحتیں ایسی نہیں ہیں جن سے پتہ چل سکے کہ مرنفتاح کا دور حکومت کیسے اختتام کو پہنچا۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کا خاتمہ اس کی موت سے ہوا۔ مصر میں انتہائی داخلی انتشار کا دور رہا جو تقریباً ۲۵ سال چلا۔

اگر چہ ان ادوار پر تاریخ توقیت زیادہ صحیح نہیں ہے، تاہم نئی حکومت کے دوران کوئی اور دور ایسا نہیں ہے جو بائبل کے اس بیان کے مطابق ہو اس میں دو متواتر دور (سوائے رعمسس دوم۔ مرنفتاح کے) اسی سال کے برابر یا اس سے بڑھے ہوئے ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر سے تعلق بائبل کی فراہم کردی معلومات جب انہوں نے اپنے بھائیوں کو آزادی دلائی۔ صرف رعمسس دوم اور مرنفتاح (۷) کے متواتر دور حکومت کے دوران کے وقت سے ہی صحیح ہو سکتی ہیں۔ اس حقیقت کے لیے مکمل شہادت ملتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام رعمسس دوم کے عہد حکومت کے اوائل میں پیدا ہوئے۔ ان کا قیام اس وقت مدین میں تھا جب

رعمسس دوم اپنے سڑسٹھ سالہ دور حکومت کے بعد مرا اور انجام کار مرنفتاح کے آگے مصر میں مقیم بنی اسرائیل کے معاملے کے وکیل بنے۔ یہ واقعہ مرنفتاح کے دور حکومت کے دوسرے نصف حصہ میں رونما ہوا۔ یہ اس مفروضہ کی بنیاد پر ہے کہ اس نے بیس سال یا بیس سال کے لگ بھگ حکومت کی۔ راوٹن اس مفروضہ کو قطعاً معقول سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مرنفتاح کے دور حکومت کے اختتام پر خروج کے موقع پر قیادت کی ہوگی۔ حقیقت اس کے خلاف نہیں ہوسکتی کیونکہ بائبل اور قرآن مجید دونوں سے ہمیں یہی اطلاع ملتی ہے کہ فرعون اس وقت مر گیا تھا جب وہ بنی اسرائیل کا تعاقب کر رہا تھا جو ملک چھوڑ کر جا رہے تھے۔ (۸)

یہ خاکہ اس بیان کے مطابق مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی شیر خوارگی اور اس طریقہ سے متعلق صحائف میں مذکور ہے جس طریقہ سے ان کو فرعون کے گھرانہ میں داخل کیا گیا تھا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ موت کے وقت رعمسس دوم بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا سن نوے تا سو سال ہوا ہے۔ اس نظریے کے مطابق دور حکومت کے آغاز کے وقت اس کی عمر تیس یا تینتیس رہی ہوگی۔ اس لیے اس کا دور حکومت ۶۷ سال رہا۔ یہ عمر ایسی تھی جب وہ شادی کرنے کے قابل تھا اور کسی بات سے اس چیز کی مخالفت نہیں ہوتی کہ فرعون کے گھرانے کے کسی رکن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام ملے تھے (قرآن مجید کے بیان کے مطابق) یا اس واقعہ کی تردید نہیں ہوتی کہ فرعون کی بیوی نے اس سے کہا کہ "کیوں نہ ہم اس نوزائیدہ بچے کو پال لیں جو ہمیں دریائے نیل کے

کنارے پر ملا ہے۔'' بائبل کا بیان ہے کہ بچے کو پانے والی فرعون کی بیٹی تھی۔ رعمسس دوم کی عمر کے پیش نظر یہ امر کلی طور پر ممکن ہے کہ اس دور حکومت کے ابتدائی ایام میں اس کی اتنی بڑی لڑکی ہو جس کو وہاں چھوڑا ہوا ایک بچہ مل جائے۔ اس نکتہ پر قرآن اور بائبل کے بیانات ایک دوسرے کے متناقض نہیں ہیں۔

جو نظریہ یہاں پیش کیا گیا ہے، وہ قرآن سے مطلقاً مطابقت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں بائبل کے صرف ایک بیان سے مختلف ہے۔ یہ بیان (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) سلاطین ۶۱۱۰ میں ہے۔ (واضح رہے کہ یہ کتاب توریت میں شامل نہیں ہے) یہ عبارت نہایت متنازع فیہ ہے اور رفا درد ے وو عہد نامہ قدیم کے اس حصہ میں شامل ان تاریخی معلومات کو مسترد کر دیتے ہیں جو ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے تعلق سے خروج کے واقعہ کا تعین کرتی ہیں۔ اس حقیقت کی بناء پر کہ یہ نظریہ مشکوک و مشتبہ ہے، یہ بات ناممکن ہو جاتی ہے کہ جس نظریہ کا خاکہ یہاں پیش کیا گیا ہے اس کے خلاف اس چیز کو ایک حتمی دلیل بنا کر قائم رکھا جائے۔

مرنفتاح کے دور حکومت کے پانچویں سال سے:

تاریخوں کا تعین کرنے والے سنگی کتبوں کا مسئلہ

مرنفتاح کے دور کے پانچویں سال سے تاریخوں کا تعین کرنے والی مشہور سل (پتھر کے وہ تختے جس پر کوئی تحریر کندہ ہو) کے متن کو دیکھ کر ناقدین خیال کرنے

لگے ہیں کہ انہیں اس نظریے کے خلاف جو یہاں پیش کیا گیا ہے ایک اعتراض مل گیا ہے۔ اس نظریے میں بنی اسرائیل کا تعاقب اس کے دور حکومت کا آخری کام بتایا گیا ہے۔

یہ تحریر شدہ سل بڑی دلچسپی کی چیز ہے کیونکہ ہیروغلفی میں صرف یہی ایک معلوم دستاویز ہے جس میں لفظ "اسرائیل" (۹) آیا ہے۔ جس کتبہ میں مرنفتاح کے دور کے پہلے حصے کی تاریخیں درج ہیں وہ تبیہ کے مقام پر فرعونوں کے ماتم کدہ سے دستیاب ہوئی تھی۔ اس میں ان فتوحات کے ایک سلسلہ کا حوالہ ہے جو اس نے ہمسایہ حکومتوں پر حاصل کی تھی۔ خصوصاً ایک ایسی فتح کی اس دستاویز کے اختتام پر تذکرہ ہے جو ایک برباد شدہ اسرائیل پر "جس کا اب تخم بھی باقی نہیں رہا ..." حاصل کی۔ اس واقعہ سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اسرائیل کے اس لفظ کا وجود اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہودی مرنفتاح کے دور کے پانچویں سال تک کنعان میں آباد ہو چکے تھے اور نتیجتاً مصر سے بنی اسرائیل کا خروج بھی پہلے ہو چکا تھا۔

یہ اعتراض قابل قبول معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس تمام عرصہ میں جب یہودی مصر میں آباد تھے اس وقت کنعان میں کوئی یہودی آباد نہیں تھا، جو ایک ایسا مفروضہ ہے جس کو ماننا ناممکن ہے۔ لیکن فادر دے وو اس حقیقت کے باوصف کہ وہ اس نظریہ کے حامی ہیں جس سے رعمسس دوم خروج کے وقت کا فرعون قرار پاتا ہے۔ یہودیوں کے کنعان میں آباد ہونے کے بارے میں حسب ذیل بیان دیتے ہیں (۱۰) "جنوب میں وہ وقت جب وہ فرقے جن کا تعلق اسرائیلیوں سے قائم کیا جاتا ہے قدیش میں آباد تھے غیر واضح ہے اور خروج

سے قبل کے زمانہ کو ظاہر کرتا ہے۔'' لہٰذا وہ اس امکان کو جائز رکھتے ہیں کہ بعض گروہ اس وقت سے پہلے ہی سے مصر سے نکل گئے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے خروج کیا۔ ایپرو یا ہیبرو جن کی مطابقت بعض اوقات اسرائیلیوں سے کی جاتی ہے۔ رعمسس دوم اور خروج سے بہت پہلے سے شامی و فلسطینی علاقہ میں رہ رہے تھے۔ ہمارے پاس دستاویزی ثبوت موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمنیوفس دوم ۳۶۰۰ قیدی بیگار میں کام کرنے کے لیے مصر لے کر آیا تھا۔ مزید لوگ سیتی اول کے زمانے میں کنعان میں موجود تھے جہاں انہوں نے بیت شیئن کے علاقہ میں گڑبڑ کی تھی۔ پی مانتے اپنی کتاب مصر اور بائبل (لیزپت اے لابیبل) میں اس بات کی یاددہانی کراتے ہیں۔ اس لیے یہ امر عین ممکن ہے کہ مرنفتاح ان شوریدہ پشت عناصر سے جو اس کی سرحدوں پر گڑبڑ کر رہے تھے سختی سے نمٹنے پر مجبور ہوا ہو۔ جب کہ اندرونی طور پر وہ لوگ تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے گرد مصر سے فرار ہونے کے لیے مجتمع ہو رہے تھے۔ کتبہ کی سل کا وجود جس میں مرنفتاح کے دور کے پانچویں سال سے تاریخیں دی گئی ہیں کسی طرح بھی موجودہ نظریہ سے انحراف کرنے نہیں دیتا۔ (۱۱)

علاوہ ازیں یہ حقیقت کہ لفظ اسرائیل یہودی قوم کی تاریخ میں استعمال ہوا ہے۔ اس تصور سے کلیتاً غیر متعلق ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام آپ کے متبعین کنعان میں مقیم تھے اس کا مبداء حسب ذیل ہے:

کتاب پیدائش (۲۹، ۸۲) کے مطابق اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام بن حضرت اسحاق علیہ السلام و نبیرۂ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔

بائبل عہد نامہ قدیم کے عالمگیر ترجمہ کے شارحین (ترا ڈکسیاں اکیومنک دے لا بیل آنسیاں تیتا ماں ۱۹۷۵ء) کا خیال ہے کہ اس کے معنی غالباً یہ ہیں کہ ''خدا خود کو اپنی عظمت اور قوت میں ظاہر کرتا ہے۔'' چونکہ یہ نام ایک فرد واحد کو دیا گیا ہے لہذا یہ امر تعجب خیز نہیں ہے کہ بعد میں ایک ممتاز مورث اعلیٰ کی یاد میں ایک قوم یا لوگوں کی ایک جماعت کو بھی یہ نام دے دیا گیا ہو۔

اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے ہی یہ نام مشہور و معروف تھا۔ زیادہ صحت کو کام میں لایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کئی سو سال پہلے اس کی شہرت تھی۔ لہذا یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ مرنفتاح کے دور حکومت کے ایک سنگی کتبہ پر یہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ واقعہ کہ اس کا اظہار اس وقت سے ہوتا ہے قطعاً اس نظریہ کی حمایت نہیں کرتا، جس کے مطابق خروج مرنفتاح کے دور حکومت کے پانچویں سال سے پہلے ہو گیا تھا۔ (۱۲)

جو بات اس سے ظاہر ہوتی ہے وہ اس قدر ہے کہ یہ ایک ایسے گروہ کا حوالہ دیتا ہے جس کو یہ اسرائیل کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ لیکن مرنفتاح کا سنگی کتبہ کسی سیاسی طور پر مستحکم و متعین جماعت کو ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ یہ کتبہ ۱۳ ویں صدی قبل مسیح کے اختتام کی تاریخوں سے متعلق ہے اور اسرائیل کی حکومت دسویں صدی قبل مسیح تک قائم نہیں ہوئی تھی۔ لہذا یہ انتہائی واجبی تعداد کی ایک انسانی جماعت (۱۳) کو ظاہر کرتا ہے۔

اس وقت ہمیں علم ہے کہ اسرائیل کے تاریخی میدان میں آنے سے قبل اس کا آٹھ یا نو صدیوں کا ایک طویل تعمیری دور ہے۔ یہ دور بہت سے نیم وحشی قبائل کی

آبادی سے ممیز و ممتاز کیا جا سکتا ہے جن میں بالخصوص اموری اور آرامی قبائل تمام علاقہ پر پھیلے ہوئے تھے۔ اسی دور میں پیر کبیر اور بزرگ خاندان حضرات کا اپنے قبائل میں ظہور رہونا شروع ہو گیا تھا جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، اور حضرت یعقوب معروف بہ اسرائیل علیہ السلام کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ آخری بزرگ خاندان کا دوسرا نام ابتدائی قبیلہ کے تشخص کے لیے استعمال کیا گیا جو آئندہ زمانہ کی ایک سیاسی انفرادیت کا مرکز و محور بنا اور جو مرنفتاح کے دور حکومت کے بہت بعد میں ظہور پذیر ہوا اس لیے کہ اسرائیل کی حکومت ۹۳۱ یا ۹۳۰ سے ۷۲۱ ق م تک رہی۔ (۱۴)

۴۔ خروج کے دوران فرعون کی موت کا ذکر مقدس صحائف میں :

یہ واقعہ جو بائبل میں اور قرآن کے بیانات میں شامل ہے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ان متون میں یہ صاف طور پر بیان ہوا ہے۔ بائبل میں اس کا تذکرہ نہ صرف اسفار خمسہ یا توریت میں ہے بلکہ مناجاتوں میں بھی ہے۔ چنانچہ اس کے حوالجات پیش کیے جا چکے ہیں۔

یہ بات نہایت عجیب و غریب ہے کہ عیسائی شارحین نے اس کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ چنانچہ فادر دے وو یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ مصر سے خروج کا واقعہ رعمسس دوم کے عہد حکومت کے پہلے نصف یا وسط میں رونما ہوا۔ ان کے نظریے کے مطابق اس حقیقت کو قطعاً ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے کہ خروج کے دوران

فرعون کی موت واقع ہوگئی تھی، حالانکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہر نظریہ کے بموجب یہ واقعہ ایک دور حکومت کے اختتام پر ہونا چاہیے۔ اپنی کتاب ''اسرائیل کی قدیم تاریخ'' (استوار انسیان درائیل) میں بائبلیکل سکول یروشلم کے صدر اس تضاد و تناقض سے قطعاً کوئی پریشانی محسوس کرتے دکھائی نہیں دیتے جو ان کے اپنے قائم کردہ نظریہ اور بائبل کی دو کتابوں یعنی توریت اور مناجات میں شامل معلومات کے درمیان رونما ہو رہا ہے۔

پی مانتے اپنی کتاب ''مصر اور بائبل'' (لاژیت اے لابیبل) میں خروج کے واقعہ کو مرنفتاح کے دور حکومت میں بتاتے ہیں لیکن فرعون کی موت کا کوئی ذکر نہیں کرتے جو فرار ہونے والی عبرانی قوم کا تعاقب کرنے والی فوج کا سرغنہ تھا۔

یہ انتہائی حیرت خیز طرز عمل یہودیوں کے نظریہ سے متناقض ہے مناجات ۱۳۶، آیت ۱۵ میں خدا کا شکر ادا کیا گیا ہے جس نے ''فرعون اور اس کے لشکر کو سینچھے کے سمندر میں غرق کر دیا۔'' اور یہ آیت اکثر ان کی عبادتوں کے دوران پڑھی جاتی ہے۔ وہ اس آیت اور خروج (۱۴، ۲۸۔۲۹) کی عبارت کے درمیان مطابقت کو جانتے ہیں۔

''اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا۔''

ان کے لیے اس بات میں شبہ کا قطعاً کوئی پرتو نہیں ہے۔ ''کہ فرعون اور اس کی فوج کے دستے سب صاف ہو گئے تھے۔'' یہی متون عیسائیوں کی بائبلوں میں

بھی موجود ہیں۔

عیسائی شارحین بالکل دیدہ و دانستہ طور پر اور تمام شہادت کے برخلاف فرعون کی موت کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ جو بات ہے وہ یہ کہ ان میں سے بعض حضرات اس حوالہ کا جو قرآن میں دیا گیا ہے ذکر کرتے ہیں اور اپنے قارئین کی اس معاملہ میں ہمت افزائی کرتے ہیں کہ وہ عجیب طریقہ پر مقابلہ کریں۔ بائبل کے ترجمہ میں جو بائبلیکل سکول یروشلم (۱۵) کے ایما سے کیا گیا، ہمیں فرعون پر فادر کورویر کی حسب ذیل تشریح ملتی ہے:

''قرآن اس چیز (فرعون کی موت) کا ذکر کرتا ہے (سورۃ ۱۰ آیات ۹۰۔۹۲) اور عام روایت ہے کہ جو فرعون اپنے لشکر کے ساتھ ڈوب گیا تھا۔ (یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو مقدس صحیفہ میں مذکور نہیں ہے)(۱۶) وہ سمندر کے نیچے رہتا ہے اور سمندری مخلوق یعنی سیل مچھلیوں کے اوپر حکومت کرتا ہے۔''

یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس قاری کو قرآن کی کوئی واقفیت نہیں ہے، وہ اس کے ایک بیان کے درمیان تعلق پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو شارح کے نقطہ نظر سے بائبل کے متن اور اس بیہودہ داستان کی تنقیض کرتا ہے جو ایک ایسی نام نہاد مشہور روایت سے آئی ہے جس کا قرآن کے حوالے کے بعد تشریح کے اندر مذکور ہے۔

اس موضوع پر قرآن کے اندر جو بیان دیا گیا ہے اس کا اس بیان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے جو شارح صاحب تجویز کر رہے ہیں۔ سورت ۱۰ کی آیات ۹۰ تا ۹۲ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل نے سمندر کو پار کر لیا اور اس کے لشکران

کا تعاقب کرر ہے تھے اس وقت جب فرعون غرق ہونے کو ہوا تو وہ چلایا۔

قال امنت انه لا اله الا الذی امنت به بنو اسرآئیل

وانا من المسلمین.....

''میں اس بات پر ایمان لایا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔''

خداوند کریم نے جواب دیا:۔

آلـئـن وقـد عـصیت قبل و کنت من المفسدین ...

فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک ایة ط وان

کثیرا من الناس عن ایتنا لغفلون...

''اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنے اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں۔''

یہ وہ کل بیان ہے جو فرعون کی موت کے بارے میں قرآن میں دیا گیا ہے اس تو ہم کا کوئی سوال نہ اس جگہ ہے اور نہ کہیں اور جو بائبل کے شارح صاحب نے درج فرمایا ہے۔ قرآن کے متن میں صاف طور پر محض اس قدر بیان کیا گیا ہے کہ فرعون کا جسم بچالیا جائے گا اور یہ اس اطلاع کا اہم جز ہے۔

جب نبی کریم ﷺ نے قرآن کو لوگوں تک پہنچایا اس وقت ان تمام فرعونوں

کے جن کا آج تعلق (صحیح یا غلط) خروج سے بتایا جاتا ہے وہ تبسیہ کے گورستان میں اپنے اپنے مقبروں میں تھے جو الاقصر کے لحاظ سے دریائے نیل کے دوسری طرف واقع ہے۔ لہٰذا اس وقت اس حقیقت کا مطلقاً کسی کو کوئی علم نہیں تھا اور کہیں انیسویں صدی کے اختتام پر جا کر وہ دریافت ہوئے۔ جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے حقیقتاً خروج کے فرعون کی خواہ وہ کوئی تھا لاش بچالی گئی۔ سیاح اس کو مصری عجائب گھر قاہرہ کے شاہی ممی خانہ میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا حقیقت اس مضحک و مہمل داستان سے بالکل مختلف ہے جو فادر کورویر نے قرآن سے منسوب کی ہے۔

۵۔ فرعون مرنفتاح کی ممی:

مرنفتاح کا جو رعمسس دوم کا بیٹا اور خروج کے زمانہ کا فرعون تھا۔ جملہ شواہد اس کی حمایت میں ہیں۔ ممی شدہ جسم ۱۸۹۸ء میں تبسیہ کے مقام پر شاہوں کی وادی میں اوریت نے دریافت کی تھی۔ وہاں سے اس کو قاہرہ منتقل کر دیا گیا۔ ایلیٹ اسمتھ نے ۸ جولائی ۱۹۰۷ء کو اس کے جسم سے غلافوں کو اتارا۔ اس نے اس عمل کا تفصیلی تذکرہ اور جسم کے جائزے کا حال اپنی کتاب شاہی ممیاں (۱۹۱۲ء) میں درج کیا ہے اس وقت یہ ممی محفوظ رکھنے کے لیے تسلی بخش حالت میں تھی۔ باوجودیکہ اس کے کئی حصے شکستہ ہو گئے تھے۔ اس وقت سے یہ ممی قاہرہ کے عجائب گھر میں سیاحوں کے لیے سجی ہوئی ہے۔ اس کا سر اور گردن کھلے ہوئے ہیں اور باقی جسم کو ایک کپڑے میں چھپا رکھا ہے۔ حقیقتاً اس کو اس خوبی سے چھپایا گیا ہے

کہ اب سے بہت کم عرصہ پہلے تک ممی کے عام فوٹوگراف جو عجائب گھر میں تھے وہ وہی تھے جو ۱۹۱۲ء میں ای اسمتھ نے لیے تھے۔

جون ۱۹۷۶ء میں مصر کے مقتدر حضرات نے بڑی مہربانی سے مجھے فرعون کے جسم کے ان حصوں کا جائزہ لینے کی اجازت دے دی جو اس وقت تک ڈھکے ہوئے تھے انہوں نے مجھے فوٹو لینے کی بھی اجازت مرحمت فرمائی۔ جب ممی کی موجودہ حالت کا موازنہ اس کیفیت سے کیا گیا جو ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ پہلے تھی تو یہ بات بڑی حد تک واضح ہوگئی کہ وہ بہت بوسیدہ ہو چکی تھی اور اس کے کچھ حصے غائب ہو چکے تھے۔ ممی شدہ نسیجیں بڑی بری طرح سے متاثر ہوئی تھیں۔ یہ کیفیت بعض جگہ انسان کے ہاتھوں ہوئی تھی اور دوسری جگہ امتداد زمانہ سے۔

اس وقت خستگی کی جو اس کی دریافت کے بعد انیسویں صدی کے اختتام سے اس میں ہوئی وضاحت اس کے محفوظ رکھنے کی حالتوں کی تبدیلی کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ اس کی دریافت تبسیہ کے گورستان کے مقبرہ میں ہوئی تھی، جہاں یہ ممی ۳ ہزار سال سے زیادہ مدت کی رکھی ہوئی تھی۔ اس وقت یہ ممی ایک سادہ سے شیشے کے کیس میں سجی ہوئی ہے۔ جس میں باہر کے اثرات سے محفوظ ہوا بستہ ماحول نہیں پیدا کیا گیا تھا۔ نہ ہی ننھے ننھے جانداروں کی آلودگی سے اس کی کوئی حفاظت کی گئی تھی۔ ممی درجہ حرارت کے اتار چڑھاؤ اور موسمی اعتبار سے ہوا کی نمی میں تبدیلی کی زد میں بھی رہی۔ غرض یہ ان حالات سے بہت دور رہی جنہوں نے تقریباً تین ہزار سال تک اس کو کسی نوع کی فرسودگی سے محفوظ رکھا۔ اس کے لیے وہ حفاظت بھی نہ رہی ہو جو غلافوں میں لپٹے ہونے کی بناء پر تھی۔ نہ مقبرہ کے بند

ماحول میں رہنے کا فائدہ رہا جہاں کا درجہ حرارت زیادہ یکساں تھا۔ اور جہاں سال کے بعض حصوں میں قاہرہ کے مقابلہ میں نمی کم رہتی تھی۔ بے شک جب یہ ممی گورستان میں تھی اس وقت اس کو لٹیروں کا (غالباً بہت ہی ابتدائی زمانہ سے) خطرہ تھا۔ نیز کترنے والے جانوروں کا بھی سامنا تھا اور ان چیزوں نے اس کو کچھ نقصان پہنچایا بھی اس کے باوجود (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) آج کل کی بہ نسبت زمانے کے سرد و گرم کا مقابلہ کرنے کے لیے حالات کہیں زیادہ سازگار تھے۔

میرے مشورے سے اس ممی کی جون ۱۹۷۵ء میں جانچ پڑتال کے دوران خصوصی تحقیقات عمل میں لائی گئیں۔ ایک اعلیٰ درجے کی شعاعی مصوری کے ذریعے ڈاکٹر ایل میلیجی اور رامس نے مطالعہ کیا اور ڈاکٹر مصطفیٰ منیالوی نے صدری جدار کے ایک رخنہ سے سینہ کے اندرونی حصہ کا جائزہ لیا۔ علاوہ ازیں جوف شکم پر تحقیقات کی گئیں۔ اندرونی جائزہ کی یہ پہلی مثال تھی جو کسی ممی کے سلسلے میں ہوا۔ اس ترکیب سے ہم جسم کے اندر کی بعض اہم تفصیلات کو معلوم کر سکے اور ان کی تصویر لے سکے۔ پروفیسر سیکالدی نے ایک عمومی نوعیت کا طبی قانونی مطالعہ کیا۔ جو ان چند ننھے ننھے اجزاء کے خوردبینی مشاہدہ کے بعد مکمل ہو گا جو ممی کے جسم سے خود بخود جدا ہو گئے ہیں۔ یہ مشاہدہ پروفیسر مگنو اور ڈاکٹر دوریگون کریں گے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کے طبع ہونے کے وقت تک (۱۷) مختتم طور پر انکشافات و اعلانات نہیں ہو سکتے۔

اس مشاہدہ سے جو کچھ پہلے ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ وہ چوڑے چوڑے رخنوں کے ساتھ ہڈیوں کے متعدد صدموں کی دریافت ہے جن میں سے بعض مہلک

ثابت ہوئے ہوں گے۔ حالانکہ ابھی تک اس بات کا پتہ چلانا ممکن نہیں ہے کہ ان میں سے بعض فرعون کی موت کے پہلے ہوئے یا بعد میں۔ غالب گمان ہے کہ اس کی موت یا تو ڈوبنے سے ہوئی جیسا کہ صحیفہ کے بیانات سے پتہ چلتا ہے یا ڈوبنے سے قبل کے سخت صدموں یا بیک وقت دونوں سے۔

ان صدمات کے اس فرسودگی کے ساتھ تعلق نے جس کے ماخذات کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے۔ فرعون کی ممی کے صحیح طور پر محفوظ رکھنے کو ایک مسئلہ بنا دیا ہے جب تک کہ بہت جلد حفاظتی اور صحت بخش ذرائع اختیار نہ کیے جائیں۔ ان ذرائع سے یہ یقین دہانی ہونی چاہیے کہ خروج کے زمانہ کے فرعون کی موت اور خدا کی مرضی کے مطابق اس کے جسم کے بچنے کی واضح شہادت امتداد زمانہ کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔

ہمیشہ سے انسان کا دل پسند مشغلہ رہا ہے کہ وہ اپنی تاریخ کے آثار کو باقی رکھے لیکن یہاں ہمارے لیے ایک ایسی بات پیدا ہو گئی ہے جو اس سے بھی کچھ بڑھی ہوئی ہے۔ یہ اس شخص کے ممی شدہ جسم کی مادی طور پر موجودگی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے واقفیت رکھتا تھا جس نے ان کے دلائل کو رد کیا، جو اس وقت جب انہوں نے خروج کیا ان کے تعاقب میں گیا اور جس نے اس عمل میں اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔ اس کا دنیاوی وجود خدا کی مرضی سے تباہ ہونے سے بچا لیا گیا تا کہ وہ لوگوں کے لیے نشان عبرت بنے جیسا کہ قرآن کریم میں تحریر ہے۔ (۱۸)

جو لوگ صحف مقدس کی صداقت کے لیے جدید معلومات میں ثبوت تلاش کرتے ہیں، وہ مصری عجائب گھر، قاہرہ کے شاہی ممی خانہ کا معائنہ کر کے فرعون کے جسم سے متعلق آیات قرآنی کی ایک شاندار مثال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

حواشی

۱۔ یہ وہ سامی قبائل تھے جو عرصہ سے فلسطین، شام، کوہ سینا اور شمالی مغربی ریگستان میں آباد تھے۔ ان کا پیشہ گلہ بانی تھا۔ اسی لیے وہ تاریخ میں ہیکسوس یعنی گڈریئے مشہور ہوئے۔ انہوں نے مصر پر اس وقت سے حملے شروع کر دیئے تھے جب وہاں گیارہواں خاندان اپنا دور حکمرانی ختم کر رہا تھا لیکن بارہویں خاندان نے ہیکسوس کے حملوں کو پسپا کیے رکھا۔ پھر جب بارہواں خاندان ۱۸۹۸ ق م میں اپنی بساط حکومت لپیٹنے پر مجبور ہو گیا تو ملک کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ تیرہویں اور چودھویں خاندانوں کی حکومت ان ہی ریاستوں میں سے دو پر تھی۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہیکسوس نے پھر شدت سے حملہ کیا اور ۱۸۵۰ ق م کے قریب وہ مصر کے شمالی ڈیلٹے پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے اور ان کی ایک جداگانہ حکومت قائم ہو گئی، جو غیر ملکی حکومت سمجھی جاتی رہی۔ اسی کو پندرھواں خاندان کہا جاتا ہے اس کا دور حکمرانی ۱۸۵۸ ق م سے ۱۶۷۸ ق م تک رہا۔ ہمارے نزدیک اسی خاندان کے زمانے میں حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی مصر میں آ کر مقیم ہوئے اور اس طرح ان کی آمد اٹھارہویں صدی ق م کے بالکل اوائل میں ہوئی نہ کہ سترہویں صدی قبل مسیح میں (مترجم)

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ محققین کے نزدیک ۲۱۰۰ اور ۲۰۰۰ ق م کے درمیان کا ہے لیکن چونکہ عہدنامہ قدیم کے مطابق ان کی عمر ۱۷۵ سال ہوئی اس لیے ممکن ہے انہوں نے انیسویں ق م کے شروع میں رحلت کی ہو۔ (مترجم)

۳۔ ہم اس موضوع کی جانب بعد میں مراجعت کریں گے جب فادر دے ووکی مدد سے ہم ا۔ سلاطین میں اس کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

۴۔ شائع کردہ ویلا شا اورنیستلے نیوف شائیل ۱۹۵۹ء

۵۔ مصنف موصوف نے کھینچ تان کر کے ۸۰ کی تعداد کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ اس میں بھی پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ جب رعمسس کے دور حکومت کے ۶۷ سال میں مرنفتاح کے دور کے دس سال جمع کیے جاتے ہیں تو کل مدت ۷۷ سال ہوتی ہے، پھر وہ بھی اس صورت میں جب پورے پورے دور حکومت شامل کیے جائیں۔ لیکن جب کہا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام رعمسس دوم کے دور حکومت میں پیدا ہوئے تو اس سے یہ سمجھنا پڑے گا کہ اس کو حکومت کرتے ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ نیز دوسرے فرعون سے ہم کلامی خروج کے واقع کو کچھ پہلے ماننی پڑے گی۔ اس طرح کل مدت زیادہ سے زیادہ ۷۰ سال ہو سکے گی۔ ۸۰ سال کا حساب کسی طرح صحیح نہیں بیٹھتا۔ ہمارے نزدیک تو فرعون سے ملاقات کے وقت حضرت موسیٰ

علیہ السلام کی عمر ۴۰ اور ۵۰ سال کے درمیان تھی کیونکہ جب وہ مصر سے نکل کر مدین گئے۔ اس وقت نوجوان تھے۔ وہاں پندرہ بیس سال سے زیادہ قیام نہیں رہا۔ ایسی صورت میں ۸۰ سال کا سن کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ (مترجم)

۶۔ موخر الذکر سنین ہی صحیح ہیں۔ اس لیے کہ اکثر ماہرین مصریات اور مورخین نے ان ہی کو اختیار کیا ہے اور ان ہی کے مطابق فراعنہ مصر کے واقعات کا سلسلہ مرتب کیا ہے۔ (مترجم)

۷۔ اس دور کی مدت جو سیتی اول اور رعمسس دوم کے عہد حکومت پر مشتمل ہے قریب قریب اسی سال بتائی جاتی ہے لیکن یہ خارج از بحث ہے۔ سیتی اول کے عہد حکومت کا جو اس مقصد کے لیے نہایت مختصر ہے، مدین کے اس طویل قیام کے ساتھ معاملہ نہیں بنتا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے سن بلوغت کے دوران کیا اور جو ان دو فرعونوں میں سے جن سے ان کی واقفیت تھی پہلے فرعون کے زمانے میں رہا۔

۸۔ لائق مصنف نے اس موضوع سے متعلق نہایت مدلل طریقہ سے بحث کی ہے لیکن بعض وجوہ کی بناء پر اس نظریہ کو قبول کرنا ممکن نہیں ہے۔ جدید تحقیقات کی بنیاد پر یہ بات دریافت ہوئی ہے کہ مرنفتاح کے دور میں بنی اسرائیل فلسطین میں مقیم تھے۔ انہوں نے اس کے خلاف بغاوت کی جس کو اس نے دبا دیا۔ اس چیز کا ذکر مصنف موصوف نے بھی کیا ہے لیکن وہ اس کو رد کے بغیر دوسرے دلائل پیش

کرنے کی طرف مائل ہو گئے۔ پھر اگر خروج کا واقعہ مرنفتاح کے دور حکومت کے اختتام پر (۱۲۱۵ ق م یا ۱۲۰۴ ق م میں) ہوا اور اس کے پچاس سال بعد بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو ان کی فلسطین میں آمد سے حضرت داؤد علیہ السلام کے دور حکومت کے آغاز تک زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو سال کی مدت ہوتی ہے جو نہایت قلیل ہے۔ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مدت کئی سو سال تھی۔ لہٰذا بنی اسرائیل کا مصر سے خروج مرنفتاح کے دور حکومت سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ خروج کے زمانہ کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے واقعات کا جائزہ لیا جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سلطنت ار کے تیسرے شاہی خاندان کے پہلے فرمانروا ارنمو یا نمرود کے زمانہ میں تھے جو تقریباً ۲۱۱۲ ق م میں موجود تھا۔ مصر میں وہ بارہویں خاندان کے دور حکومت میں پہنچے۔ یہ زمانہ ۲۱۱۱ ق م سے ۱۸۹۸ ق م تک پھیلا ہوا ہے۔ لہٰذا اگر ہم حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی بعثت کا زمانہ ۲۱۰۰ اور ۲۰۰۰ ق م کے درمیان سمجھ لیں تو حضرت یوسف کے بھائیوں کی مصر میں آمد ۱۸۰۰ ق م کے قریب قرار پاتی ہے۔ اگر خروج کا واقعہ ان کے مصر میں داخلہ کے ۴۳۰ سال بعد ہوا تو ان کی آمد ۱۸۱۰ ق م میں ہوئی اور اگر ۴۱۰ سال بعد ہوا تو ان کے مصر میں داخلہ کا سنہ ۱۷۹۱ ق م کو قرار دینا پڑے گا۔ اس کے لیے قوی شہادت موجود ہے کہ خروج کا واقعہ ۱۳۸۱ ق م میں ہوا۔ اس وقت

مصر میں اٹھارہویں خاندان کا فرمانروا آمنجو طرف سوم برسر اقتدار تھا۔ اس کا دور حکومت ۱۴۱۱ ق م سے ۱۳۸۱ ق م تک ممتد ہے۔ خیال ہے کہ اسی کے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قبطی کو مارنے کے بعد مصر سے نکلے تھے اور مدین تشریف لے گئے تھے۔ کئی سال وہاں قیام فرمانے کے بعد مع اپنی اہلیہ حضرت صفورہ کے لوٹے تو منصب نبوت سے سرفراز ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مصر میں واپس آ کر فرعون پر تبلیغ کی۔ اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکل جانے کے لیے اجازت چاہی۔ جب وہ کسی طرح تیار نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ۱۳۸۱ ق م میں بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے فرعون نے پیچھا کیا اور پھر وہ اور اس کا لشکر سمندر میں ڈوب گیا۔ اس وقت اس کا لڑکا آمنجو طف چہارم صرف ۷ سال کا تھا۔ اس لیے ملکہ طائی نگران کی حیثیت سے حکومت کرنے لگی۔ چھ سال بعد ۱۳۷۵ ق م میں آمنجو طف چہارم نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اخناطون کے لقب سے ۱۷ سال تک حکومت کرتا رہا اور آخر کار ۱۳۵۸ ق م میں مر گیا۔ اپنی والدہ ملکہ طائی یا حضرت آسیہ کی تعلیم و تربیت کے سبب وہ مصر کا موحد بادشاہ ہوا جس نے سب دیوتاؤں کی پرستش بند کرا کے خدائے واحد کی عبادت کا حکم دیا۔ اسی وجہ سے پروہت اور پجاری اس کے خلاف ہو گئے۔ لیکن اس نے کسی کی مخالفت کی پروا نہ کی اور آخر وقت تک اپنے مسلک پر قائم رہا۔ واللہ اعلم بالصواب (مترجم)

۹۔ یہ لفظ ایک نسلی تشخص کے اظہار کے لیے آیا ہے جس کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ اصطلاح ایک ''انسانی جماعت یا گروہ'' کو ظاہر کرتی ہے۔

۱۰۔ اپنی کتاب ''اسرائیل کی قدیم تاریخ'' (استوار آنسیان وزائل) میں۔

۱۱۔ یہ سب باتیں قیاسات کی بنیاد پر کی گئی ہیں۔ ان کے لیے کوئی تاریخی شواہد پیش نہیں کیے گئے بجائے اس کے کہ اسرائیل کے چند گروہ خروج سے پہلے مصر سے نکل کر فلسطین میں جا بسے ہوں گے اور انہوں نے ہی بغاوت کی ہوگی۔ جس کو مرنفتاح نے دبایا ہوگا۔ یہ بات کیوں نہ مان لی جائے کہ خروج کا واقعہ ہی مرنفتاح سے بہت پہلے ہو چکا ہوگا اور بنی اسرائیل کے کسی سرحدی قبیلہ نے مرنفتاح کے زمانہ میں بغاوت کی ہوگی جس کو اس نے دبا دیا۔

۱۲۔ جب یہ بات مان لی گئی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی اور وہ سب حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے اٹھارہویں صدی ق م کے شروع میں مصر میں آ بسی تھی تو اس کا کسی بعد کے زمانہ میں فلسطین میں آباد ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خروج کا واقعہ ہو چکا تھا۔

۱۳۔ اسرائیل کا نام (جو سنگی کتبہ پر ہے) جنسی تشخص کے طور پر ایک قوم کے لیے استعمال ہوا ہے نہ کہ کسی ملک کی تشخیص کے لیے جیسا

کہ سنگی کتبہ میں مرقوم دیگر اسماء کا معاملہ ہے۔ یہ بات فادر پی کورو پر، پروفیسر بائبلیکل سکول یروشلم نے کتاب الخروج کے ترجمہ پر اپنی تشریح وتفسیر میں تحریر کی ہے۔ (مطبوعہ ایڈیشنز دوسرف پیرس ۱۹۶۸ء صفحہ ۱۲)

۱۴۔ مصنف موصوف نے تمام تاریخوں کو گھٹا کر لکھا ہے۔ چنانچہ وہ اسرائیل کی حکومت کی ابتداء ۹۳۱ یا ۹۳۰ ق م سے بتاتے ہیں حالانکہ حضرت داؤد علیہ السلام ہی کا زمانہ ۱۰۱۳ ق م سے ۹۷۳ ق م تک قرار دیا جاتا ہے۔ ان سے پہلے ساؤل کا دور حکومت ۱۰۲۵ ق م سے شروع ہوا تھا۔ اس لیے اسرائیل کی حکومت کا آغاز اسی آخری سنہ کو قرار دینا چاہیے۔

۱۵۔ لیگزوڈ (ایگزوڈس یعنی خروج) ۱۹۶۸ء صفحہ ۳۷ شائع کردہ لے ایڈیسیوں دوسرف باری پیرس

۱۶۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ شارح بائبل کا حوالہ دے رہا ہے۔

۱۷۔ پہلی فرانسیسی اشاعت۔ نومبر ۱۹۷۵ء

۱۸۔ رعمسس دوم کی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا ایک دوسرا شاہد ہے۔ ممی اس قسم کے مطالعہ کا ایک موضوع رہی ہے۔ جس قسم کا مطالعہ مرنفتاح کی ممی کا کیا گیا ہے۔ اسی نوع کا تجدیدی کام اس کے لیے بھی درکار ہے۔

مترجم کے حواشی :۔

اس طبی مطالعہ کے جو قاہرہ میں ۱۹۷۵ء میں کیا گیا تھا نتائج مصنف نے کئی فرانسیسی علمی انجمنوں کے سامنے ۱۹۷۶ء کے ابتدائی حصہ کے دوران پڑھے جن میں اکادیمی ناسیونال دے میدے سین (قومی طبی اکیڈمی) بھی تھی۔ ان نتائج کا علم جب مصری عہدیداروں کو ہوا تو انہوں نے رعمسس دوم کی ممی کو فرانس میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۲۶ ستمبر ۱۹۷۶ء کو یہ ممی اس عمل کے لیے پیرس پہنچی۔

قرآن، حدیث اور جدید سائنس

اسلام میں ضوابط وقوانین کا واحد ذریعہ قرآن ہی نہیں ہے، حضرت محمد ﷺ کی حیات کے دوران اور آپ کی رحلت کے بعد قانون شریعت کی نوعیت کی زائد معلومات فی الحقیقت نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال کے مطالعہ سے حاصل کی گئی تھیں۔

اگرچہ روایت حدیث کے لیے تحریر کے ذریعہ کو بالکل ابتداء سے اختیار کیا گیا۔ لیکن اس کا بہت سا حصہ زبانی روایت سے حاصل ہوا۔ جن حضرات نے ان کو جمع کرنے کا کام کیا۔ انہوں نے ایسی تحقیقات کیں جو ماضی کے واقعات کا تذکرہ مرتب کرنے سے پہلے نہایت مشقت طلب ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے معلومات کی فراہمی کے کٹھن کام میں صحت کا بڑا خیال رکھا۔ یہ بات اس حقیقت سے واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کی جملہ احادیث کے لیے انتہائی مستند و مقدس مجموعوں میں ہمیشہ ان حضرات کے نام شامل ہوتے ہیں جو ان احادیث کو روایت کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ نام پیچھے کی طرف اس شخص تک پہنچ جاتے ہیں جس نے سب سے پہلے حضرت محمد ﷺ کے اہل بیت اطہار یا اصحاب کرام رضی اللہ عنہ سے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔

اس طرح نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال کا ایک بہت بڑا ذخیرہ حدیث کے عنوان کے تحت حاصل ہوا۔ اس لفظ کے اصلی معنی ''الفاظ میں اظہار یا تقاریر'' کے ہیں۔ لیکن دستور کے مطابق افعال کے تذکرے کے لیے بھی اس لفظ کو استعمال کیا

جاتا ہے۔

بعض مجموعے ان دہ سالوں میں ہی منظر عام پر لے آئے گئے تھے جو حضرت محمد ﷺ کی رحلت کے بعد تھے لیکن دو سو سال سے زیادہ عرصہ گذرنے کے بعد نہایت اہم مجموعے ظہور پذیر ہوئے۔ واقعات کا سب سے زیادہ مستند تذکرہ البخاری اور مسلم کے مجموعوں میں ہے جن کا زمانہ حضرت محمد ﷺ کے دو سو سال سے زیادہ عرصہ بعد کا ہے اور جن میں زیادہ قابل اعتماد مواد پیش کیا گیا ہے۔ چند سال پہلے ایک دولسانی عربی/ انگریزی ایڈیشن اسلامی یونیورسٹی مدینہ کے ڈاکٹر محمد محسن خان نے مرتب کیا ہے۔ البخاری کو عام طور پر قرآن کے بعد سب سے مستند سمجھا جاتا ہے۔ اس کو فرانسیسی میں ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۴ء میں ہڈاس اور مرکائس نے "لے ترادیسیوں اسلامک" (اسلامی روایات) کے عنوان سے ترجمہ کیا تھا۔ لہذا جو لوگ عربی زبان نہیں بول سکتے حدیثیں ان کی بھی دسترس میں ہیں۔ تاہم بعض ان ترجموں کے معاملے میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے جو یورپی لوگوں نے کیے ہیں۔ ان میں فرانسیسی ترجمے بھی شامل ہیں۔ ان میں غیر صحیح باتیں اور غلط بیانیاں شامل ہیں جو اکثر حقیقی ترجمہ کی جگہ تشریحات ہیں۔ بعض اوقات ان میں حدیث کا صحیح مفہوم بڑی حد تک بدل دیا گیا ہے اور حقیقتاً کو اس حد تک بدلا گیا ہے کہ جو مفہوم اس کا کسی طرح بھی نہیں ہوسکتا وہ بیان کر دیا گیا ہے۔

جہاں تک کہ ان کے ماخذ کا تعلق ہے بعض احادیث اور مواعظ میں ایک بات مشترک ہے کہ ان کو کسی ایسے مصنف نے مرتب نہیں کیا جو اپنے بیان کردہ واقعات کا عینی گواہ ہو۔ نہ وہ اس وقت تک ضبط تحریر میں آئیں جب تک ان

واقعات کو ظہور میں آئے کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اناجیل کی طرح احادیث بھی سب کی سب مستند نہیں سمجھی جاتیں۔ ان میں سے تھوڑی تعداد ایسی ہے جن کو اسلامی روایات کے ماہرین متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہوں۔ چنانچہ سوائے موطاء، صحیح مسلم اور صحیح بخاری کے ایک ہی کتاب میں ایسی حدیثوں کے ساتھ ساتھ جن کو مستند سمجھا جاتا ہے ایسی حدیثیں بھی ہیں جو مشکوک و مشتبہ ہیں اور ایسی بھی ہیں جن کو کلیتہ مسترد کر دینا چاہیے۔

تسلیم شدہ اناجیل کے برخلاف جن پر بعض جدید دور کے فضلاء اعتراض کرتے ہیں لیکن جو عیسائیوں کے مقتدر حضرات میں کبھی مابہ النزاع نہیں رہیں، وہ حدیثیں بھی جو انتہا درجے کی مستند سمجھی جاتی ہیں، نقد و تبصرہ کا موضوع رہی ہیں۔ تاریخ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں اسلامی ذہن رکھنے والے حضرات نے حدیثوں کا نہایت گہری نظر سے جائزہ لیا۔ حالانکہ بنیادی کتاب (قرآن کریم) ہمیشہ حوالے کی کتاب سمجھی جاتی رہی اور اس پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔

میں اس چیز کو دلچسپی کا ایک موضوع سمجھتا ہوں کہ حدیث کے ادب کا یہ معلوم کرنے کے لیے جائزہ لوں کہ کس طرح حضرت محمد ﷺ وحی سے ہٹ کر ان موضوعات پر گفتگو کرتے تھے جن کی توضیح و تشریح سائنسی ترقی کے مطابق آئندہ صدیوں میں کی جاتی تھی۔ اگرچہ صحیح مسلم بھی ایک مستند مجموعہ ہے لیکن اس مطالعہ کے لیے میں نے خود کو ان احادیث کے متن تک محدود رکھا ہے جو عموماً سب سے زیادہ مستند سمجھی جاتی ہیں یعنی البخاری کی احادیث۔ میں نے ہمیشہ اس حقیقت کو ذہن میں رکھنے کی کوشش کی ہے کہ ان متون کو جن لوگوں نے مرتب کیا ہے ان کی

ترتیب اس معلومات کے مطابق تھی جس میں روایت جزوی طور پر زبانی تھی اور یہ کہ انہوں نے بعض حقائق کو زیادہ یا کم درجہ میں صحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان انفرادی غلطیوں پر بھروسہ کیا ہے جو ان لوگوں سے سرزد ہوئیں جنہوں نے ان روایتوں کو منتقل کیا تھا۔ یہ متون ان دوسری احادیث سے مختلف ہیں جو کثیر تعداد میں لوگوں نے روایت کیں اور جو مسلمہ طور پر مستند ہیں۔(۱)

میں نے ان معلومات کا جو ان احادیث کے جائزہ کے دوران حاصل ہوئیں ان معلومات سے مقابلہ کیا جو قرآن اور جدید سائنس کے حصہ میں پہلے ہی پیش کی جا چکی ہیں۔ اس مقابلہ کے نتائج آپ اپنے شاہد ہیں۔ حقیقت میں جدید سائنسی معلومات سے مقابلہ کرتے وقت قرآن میں شامل معلومات میں جو صحت دکھائی دیتی ہے اور ان موضوعات پر جو بنیادی طور پر سائنسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ احادیث میں انتہائی قابل اعتراض نوعیت کے جو بیانات دیئے ہوئے ہیں۔ دونوں میں فرق نہایت حیران کن اور شش و پنج میں مبتلا کرنے والے ہیں۔ صرف ایسی ہی حدیثیں ہیں جن سے اس مطالعہ میں بحث کی گئی ہے۔

جو حدیثیں اپنے موضوع کے لحاظ سے قرآن کی بعض آیات کی توضیح و تفسیر ہیں وہ بعض اوقات ایسی تاویلات کی جانب لے جاتی ہیں جو اس وقت مشکل سے قابل قبول ہیں۔

ہم نے ایک آیت کی انتہائی اہمیت کا پہلے ہی جائزہ لیا ہے (سورۃ ۳۶ آیت ۳۸) میں سورج کے متعلق کہا گیا ہے کہ والشمس تجری لمستقر لھا (اور سورج وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے) اس کی تشریح ایک حدیث میں اس

طرح کی گئی ہے "غروب آفتاب پر سورج عرش کے نیچے سجدہ ریز ہوتا ہے اور دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ اجازت مل جاتی ہے اور پھر (ایک وقت ایسا آئے گا جب) وہ سجدہ ریز ہونے کے قریب ہوگا۔۔۔وہ اپنے سفر کو جاری رکھنے کی اجازت چاہے گا۔ اس کو حکم ہوگا کہ پھر اسی جگہ لوٹ جاؤ جہاں سے آئے ہو چنانچہ وہ مغرب میں طلوع ہوگا۔۔۔

(صحیح بخاری) ابتدائی متن (کتاب آفرینش جلد۴ صفحہ ۲۸۸، جز ۵۴ باب ۴ شمار ۴۲۱) مبہم اور نا قابل ترجمہ ہے۔ اس کے باوجود اس عبارت میں ایک تمثیل ہے جو سورج کے اس دور کے تصور کو پیش کرتی ہے جس میں سورج زمین کے اعتبار سے حرکت کرتا ہے۔ سائنس اس چیز کے برعکس تصور پیش کرتی ہے۔ اس حدیث کا استناد مشتبہ (ظنی) ہے۔

اسی کتاب کی ایک دوسری عبارت (کتاب آفرینش جلد۴ صفحہ ۲۸۸، جز ۵۴ باب ششم۔ شمار ۴۳۰) میں وقت کے لحاظ سے بڑے عجیب طریقہ پر جنین کے ارتقاء کے ابتدائی مدارج کا حساب پیش کیا گیا ہے۔ ان عناصر کو جو وجود بشری کی تشکیل کرتے ہیں، باہم ملنے میں چالیس دن کی مدت صرف ہوتی ہے۔ مزید چالیس دن اس بات میں لگتے ہیں جب جنین اس چیز میں تبدیل ہوتا ہے جو ایک پھٹکی کی شکل میں ہوتی ہے اور تیسرے چالیس دن کی مدت وہ ہوتی ہے۔ جب جنین کو بندھی بوٹی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر جب فرشتے یہ تعین کرنے کے لیے دخل انداز ہو جاتے ہیں کہ اس فرد کا مستقبل کیا ہوگا۔ اس وقت اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ جنینی ارتقاء کا یہ بیان جدید معلومات سے مطابقت نہیں رکھتا۔

جب کہ قرآن فن طب پر قطعاً کوئی عملی مشورہ سوائے ایک اشارہ (سورۃ ۱۶، آیت ۷۹) کے نہیں دیتا جس میں شہد کو معالجاتی امداد کے امکان کے طور پر بیان کیا گیا ہے (بغیر اس اشارہ کے کہ کون سی بیماری کا علاج ہے) حدیث اس موضوع پر نہایت تفصیلی بحث کرتی ہے۔ البخاری کے مجموعہ کا ایک پورا جز (جز ۷۶) ادویہ سے متعلق ہے۔ فرانسیسی ترجمہ میں جو ہوداس اور مرکائیس نے کیا ہے۔ یہ موضوع جلد ۴ کے صفحہ ۶۲ سے صفحہ ۹۱ تک چلا گیا ہے اور ڈاکٹر محمد محسن خان کے دولسانی عربی/انگریزی ایڈیشن میں جلد سات کے صفحہ ۳۹۵ سے صفحہ ۴۵۲ تک ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ان صفحات میں کچھ ایسی حدیثیں شامل ہیں جو قیاسی (ظنی) ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ اس لحاظ سے دلچسپ ہیں کہ ان میں مختلف طبی مضامین پر جن کے متعلق اس وقت بحث کرنا ممکن تھا، آراء کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں کئی حدیثیں جو البخاری کے دوسرے اجزاء میں شامل کی گئی ہیں اور طبی رنگ اختیار کیے ہوئے ہیں ملائی جاسکتی ہیں۔

اس طرح ہمیں ان میں ایسے بیانات بھی ملتے ہیں جن میں نظر بد کے اثرات، جادو سحر اور جھاڑ پھونک کے اثرات بتائے گئے ہیں۔ اگرچہ پیسے لے کر قرآن کو اس کام کے لیے استعمال کرنے پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ ایک حدیث ایسی ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ بعض تاریخیں ایسی ہوتی ہیں جو جادو کے اثرات کے خلاف بطور حفاظت کے کام میں لائی جاسکتی ہیں اور جادو منتر کو زہریلے سانپ کے کاٹے کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔

لیکن ہمیں یہ بات جان کر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ ایسے زمانے میں جب ادویہ

کے سائنسی استعمال کے امکانات بہت محدود تھے، لوگوں کو معمولی ترکیبوں پر بھروسہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا۔ قدرتی معالجات جیسے خون نکالنا، پچھنے لگوانا، گرم لوہے داغنا، جوؤں سے بچنے کے لیے سر منڈانا، اونٹ کے دودھ، بعض بیجوں مثلاً سیاہ زیرہ اور ہندی قسط (ہندی کٹ) جیسے پودوں کا استعمال کرنا بتایا جاتا تھا۔ یہ مشورہ بھی دیا جاتا تھا کہ خون کو روکنے کے لیے کھجور کی پتیوں سے بنی ہوئی چٹائی کو جلا کر زخم میں اس کی راکھ بھر دی جائے۔ ضرورت کے وقت تمام قابل حصول ذرائع جو واقعی مفید ہو سکتے ہیں، کام میں لائے جاتے تھے۔ لیکن لوگوں کو اونٹ کا پیشاب پینے کا مشورہ دینا بنیادی طور پر کوئی زیادہ اچھا خیال نہیں ہے۔

اس وقت ان موضوعات سے متعلق جو بعض بیماریوں کے بارے میں ہیں تاویلات وتشریحات پیش کرنا مشکل ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بخار کے اسباب:۔

اس واقعہ کی شہادت کے طور پر چار بیانات ہیں۔ ''بخار دوزخ کی گرمی سے ہوتا ہے۔'' (بخاری۔ کتاب الدواء جلد ہفتم باب ۲۸ صفحہ ۴۱۲)

ہر بیماری کے لیے ایک دوا ہے:۔

''خدا نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی جس کا اس نے علاج نہ پیدا کیا ہو۔''

(۲)(ایضاً باب اول صفحہ ۸۹۶)

اس تصور کو حدیث ذباب (مکھی کی حدیث) سے واضح کیا گیا ہے۔ ''اگر تم میں سے کسی شخص کے برتن میں مکھی گر جائے تو اس پوری مکھی کو اس (برتن) میں ڈبوؤ اور پھر اس کو پھینک دو۔ کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہے اور دوسرے میں شفا ہے۔'' (اس کا تریاق) یعنی اس بیماری کا علاج (ایضاً ابواب ۱۵، ۱۶ صفحات ۴۵۲۔۴۵۳ نیز کتاب آفرینش جز ۵۴۔ ابواب ۱۵، ۱۶)

سانپ کو دیکھنے سے اسقاط حمل (جس سے اندھا بھی ہوسکتا ہے) یہ بات کتاب آفرینش جلد چہارم (باب ۱۳ اور ۱۴۔ صفحات ۸۸۰ تا ۸۸۴) میں مذکور ہے۔

ایام کے دوران سیلان خون۔ (ایام حیض) کتاب الحیض جلد چہارم جز ۶ صفحات ۴۹۰، ۴۹۵ پر ایام کے دوران سیلان خون کے سبب پر دو حدیثیں دی گئی ہیں۔ (ابواب ۲۱ اور ۲۸) ان میں دو عورتوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ پہلی عورت کے سلسلے میں علامات کا غیر تفصیلی بیان ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ سیلان خون، خون کی ایک نالی سے ہوتا ہے۔ دوسری میں بتایا گیا ہے کہ کسی عورت کو سات سال تک ایام کے دوران سیلان خون ہوتا رہا اور اس کا سبب بھی وہی نالی سے خون کا اخراج بتایا گیا ہے۔ مذکورہ بالا کے اصل اسباب کے لیے مفروضے قائم کیے جاسکتے تھے۔ تاہم یہ بات بالکل صحیح ہوسکتی ہے۔

یہ بیان کے بیماریاں متعدی نہیں ہوتیں۔ البخاری کے مجموعہ حدیث میں کئی جگہ (ابواب ۱۹، ۲۵، ۳۰، ۳۱، ۵۳ اور ۵۴ جلد چہارم جز ۷۶ کتاب الدواء) بعض

مخصوص حالتوں کا ذکر ہے۔مثلاً جذام (صفحہ ۴۰۸) طاعون (صفحات ۴۱۸اور ۴۲۲) خارش (صفحہ ۴۴۷) اور عمومی بیانات بھی پیش کیے گئے ہیں۔لیکن موخر الذکر نہایت نمایاں متضاد بیانات کے پہلو بہ پہلو رکھے گئے ہیں۔مثلاً یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ ان علاقوں میں نہ جاؤ جہاں طاعون پھیلا ہوا ہو اور جذامی شخص سے دور رہو۔

لہذا یہ نتیجہ نکالنا ممکن ہے کہ بعض ایسی حدیثیں بھی موجود ہیں جو سائنسی اعتبار سے نا قابل قبول ہیں۔ان کے مستند ہونے میں شبہ ہے۔ان کے حوالہ دینے کا مقصد صرف اس مقابلہ کی وجہ سے ہے کہ وہ قرآن مجید کی ان آیات کے ساتھ آئی ہیں جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔حالانکہ ان آیات میں ایک بیان بھی غیر صحیح نہیں ہے۔ظاہر ہے کہ یہ جائزہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ بات یقیناً یاد رکھنی پڑے گی کہ نبی کریم ﷺ کی رحلت پر دو تحریرات جو اس ذریعہ سے آئیں۔دو گروہوں میں بٹ گئی ہیں۔

اولاً مومنین کی ایک جماعت کو قرآن مجید حفظ یاد تھا۔نبی کریم ﷺ کی طرح انہوں نے بھی متعدد بار پڑھا تھا۔علاوہ ازیں قرآن کریم کے متن کی تحریر پہلے سے موجود تھی۔یہ تحریر رسول ﷺ کے زمانہ میں اور ہجرت سے قبل بھی محفوظ کر لی گئی تھی۔(۳)

ثانیاً حضور ﷺ کے وہ صحابہ جو آپ ﷺ سے قریب ترین تھے اور مومنین جنہوں نے آپ ﷺ کے اقوال و افعال سنے اور دیکھے تھے انہوں نے ان باتوں کو یاد رکھا اور جب اصول و ضوابط اخذ کر کے مرتب کیے جانے لگے تو قرآن کریم

کے علاوہ تائید کے لیے ان پر بھی بھروسہ کیا۔(۴)

نبی کریم ﷺ کی رحلت کے بعد کے سالوں میں وہ متون جمع کیے گئے جن میں اس تعلیم کی جو آپ ﷺ نے چھوڑی تھی، دو قسمیں موجود تھیں۔ حدیثوں کو جمع کرنے کا کام ہجرت کے تقریباً چالیس سال بعد شروع کیا گیا۔ لیکن قرآنی سورتوں کو جمع کرنے کا کام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زیر نگرانی پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ خصوصیت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ کام ہوا۔ موٴخر الذکر نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک مخصوص (۵) متن کی اشاعت کی یعنی حضرت محمد ﷺ کی رحلت کے بارہویں اور چوبیسویں سال کے درمیان یہ کام انجام پایا۔

جس بات پر نہایت کراہت کے ساتھ زور دینا پڑتا ہے۔ وہ ان دونوں متون کے درمیان ناموافقت اور غیر یکسانیت ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے بھی اور مضمون کے اعتبار سے بھی۔ قرآن کریم کی طرز کا حدیث کے طرز سے مقابلہ کرنا حقیقتاً ناقابل تصور ہے۔ جو بات اس سے بھی بڑھ کر ہے وہ یہ ہے کہ جب دونوں متون کا مقابلہ جدید سائنسی معلومات سے کیا جائے تو دونوں میں تبائن وتخالف کو دیکھ کر انسان حیران وششدر رہ جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جو بات اس سے نکلتی ہے۔ میں اس کے اظہار میں کامیاب ہوگیا ہوں۔

ایک طرف قرآن مجید کے بیانات ہیں جو اکثر عام باتیں معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں وہ معلومات پنہاں ہیں جو آئندہ چل کر سائنس منصۂ شہود پر لانے والی تھیں۔

دوسری طرف احادیث کے بعض بیانات ہیں جو اپنے زمانہ کے خیالات سے مکمل طور پر مطابقت رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن جن میں وہ رائیں شامل ہیں جو آج سائنسی اعتبار سے ناقابل قبول معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ان بیانات کے مجموعہ میں پیش آتی ہیں جن کا تعلق ان اسلامی ضوابط وقوانین سے ہے جن کا استناد بغیر شک وشبہ کے تسلیم کرلیا گیا ہے۔

بالآخر یہ بات بتانی پڑے گی کہ حضرت محمد ﷺ کا رویہ قران مجید کے بارے میں اپنی ذاتی احادیث سے بالکل مختلف تھا۔ قرآن مجید کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ وہ وحی آسمانی ہے۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ تک نبی کریم ﷺ نے نہایت توجہ سے اس صورت میں جیسی کہ ہم اسے دیکھ رہے ہیں، سورتوں کے اعتبار سے اس کو ترتیب دلایا۔ قرآن کریم وہ چیز تھی جس کو آپ کی حیات طیبہ میں تحریری شکل میں لایا گیا۔ اور نمازوں کے پڑھنے کے لیے اس کو حفظ یاد کیا گیا۔ حدیثوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اصولی طور پر آپ کے افعال اور ذاتی غور وفکر کا ایک تذکرہ ہیں۔ لیکن آپ ﷺ نے ان کو دوسروں پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے طرز زندگی میں ان کو اپنے لیے نمونہ سمجھیں اور اگر چاہیں تو ان کو عوام میں پھیلائیں۔ اس سلسلے میں آپ نے کوئی ہدایت جاری نہیں کیں۔ (۲)

اس حقیقت کے پیش نظر کہ ایک محدود تعداد میں حدیثیں ایسی ہیں جو یقینی طور پر نبی کریم ﷺ کے خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ باقی احادیث کے متعلق یہ خیال کرنا پڑے گا وہ آپ کے زمانے کے دوسرے لوگوں کے خیالات ہیں۔ خصوصیت سے ان مضامین سے متعلق جن کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے۔ جب ان

مشتبہ اور غیر مستند احادیث کا مقابلہ قرآن مجید کے متن سے کیا جاتا ہے تو ہمیں ان میں زبردست اختلاف دکھائی دیتا ہے۔ یہ موازنہ اس دور کی ان تحریروں کے جو سائنسی طور پر غیر صحیح بیانات کی وجہ سے چیستان بن گئی ہیں اور قرآن کے جو تحریر میں آئی ہوئی وحی کی کتاب اور اس قسم کی غلطیوں سے پاک ہے۔(۷) درمیان زبردست فرق کو نمایاں کرتا ہے۔(اگر اب بھی اس کی کوئی ضرورت ہے۔)

حواشی

۱۔ مسلم ماہرین پہلی قسم کا لفظ ''ظنی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسری کو لفظ ''قوی'' سے۔

۲۔ کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نہ کی ہو نہ پیدا
(مسدس حالی)

۳۔ ہجرت کا واقعہ ۶۲۲ء میں یعنی حضرت محمد ﷺ کی رحلت سے دس سال قبل ہوا تھا۔

۴۔ یہ توجیہہ معقول نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن مجید سے متصادم احادیث کو موضوع قرار دینا مناسب ہوگا۔ (مترجم)

۵۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں صرف قریش کی قرأت پر سب کو جمع کیا گیا۔ (مترجم)

۶۔ یہ سب قیاسات ہیں۔ ورنہ آپ کا یہ ارشاد حدیث کی اہمیت وضرورت پر پوری طرح دلالت کرتا ہے۔ ''میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسری اپنی سنت۔ جب تک ان دونوں کو پکڑے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔'' حقیقت میں مصنف علام نے یہ مفروضہ اس بنیاد پر قائم کرلیا کہ ان کے نزدیک ''تمام احادیث آپ کے اقوال وافعال ہیں۔'' یہ مفروضہ ہی سرے

سے غلط ہے۔ دراصل جو باتیں قرآن سے متصادم نہیں ہیں صرف وہ آپ کی احادیث ہیں اور جو قرآن کی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہیں وہ موضوعات میں شامل کی جانی چاہیے۔ کیونکہ قرآن کریم میں صاف طور پر بتادیا گیا ہے۔

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی

''آپ کوئی بات بھی اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ وہی بات ہوتی ہے جو آپ پر وحی کی جاتی ہے۔'' ایسی صورت میں یہ کہہ دینا کہ کچھ باتیں آپ کی قرآنی حقائق کے خلاف بھی ہوتی تھیں قطعاً خلاف واقعہ ہے۔ آپ جو کچھ فرماتے یا عمل کرتے وہ سراسر قرآن کریم کی توضیح و تشریح ہوتا تھا۔ اس لیے اس کے قرآن سے متبائن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۷۔ مذہبی نقطۂ نظر سے احادیث کی سچائی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن جب ان میں دنیاوی زندگی سے متعلق معاملات بیان ہوتے ہیں تو نبی کریم ﷺ اور دوسرے انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایک حدیث ایسی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی ایک گفتگو کا بیان ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا۔ ''جب کبھی میں تمہیں دین سے متعلق کوئی حکم دیتا ہوں تو تمہارے لیے لازمی ہے کہ اس کی تعمیل کرو اور اگر میں اپنی ذاتی رائے سے کوئی بات کہوں (اس بات کو یاد رکھیے) تو میں بھی ایک بشر ہوں۔'' السرخسی نے اپنی کتاب ''الاسوی'' میں

اس بیان کو حسب ذیل طریقہ پر بیان کیا ہے۔ ''اگر میں تمہارے دین کے بارے میں کوئی چیز تمہارے پاس لاؤں تو اس کے مطابق عمل کرو اور اگر میں کوئی بات اس دنیا سے متعلق لاؤں تو تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے بہتر جانتے ہو'' لیکن یہ باتیں وہ ہیں جو ہماری روزانہ زندگی میں رونما ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں آپ سے منسوب نہیں کی جاسکتیں جو قرآن کے مضمون سے متصادم ہوں اور چیستان بن کر رہ جائیں۔ جیسے بخار دوزخ کی گرمی سے ہوتا ہے۔ ایسی حدیثوں کو موضوع قرار دینا پڑے گا۔ (مترجم)

عام نتائج

اس مطالعہ کے اختتام پر ایک حقیقت جو نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ صحف مقدسہ کے متون پر مغرب میں جو غالب رائے اس وقت دکھائی دیتی ہے وہ مشکل سے حقیقت پر مبنی قرار دی جاسکتی ہے۔ ہم نے ان حالات، ان زمانوں اور ان طریقوں کا جائزہ لیا ہے جن میں عہد نامہ قدیم اناجیل اور قرآن کے عناصر کو جمع کیا گیا اور تحریر میں لایا گیا۔ وہ حالات جو ان الہامی صحیفوں کے وجود میں آنے کے وقت تھے، آپس میں ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف تھے جو ایک ایسی حقیقت ہے کہ ان متون اور ان کے مضامین کے بعض پہلوؤں کے استناد سے متعلق بے انتہا اہمیت کی حامل ہے۔

عہد نامۂ قدیم ایسی متعدد ادبی تحریروں پر مشتمل ہے جو تقریباً نو سو سال کی مدت میں لکھی گئیں۔ یہ ایک انتہائی غیر یکساں اور مختلف النوع پچی کاری کا کام ہے جس کے ٹکڑوں کو صدیوں کے دوران انسان نے بدل دیا ہے۔ جو چیز پہلے سے موجود تھی۔ اس میں کچھ حصوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ آج یہ بتانا بعض اوقات نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ ابتداً وہ کہاں سے آئے تھے۔

اناجیل کا مقصد حضرت یسوع مسیح کے اقوال و افعال کے ذریعہ لوگوں کو وہ تعلیمات پہنچانا تھا جو وہ اپنی حیات دنیوی کے مشن کی تکمیل کے وقت لوگوں کو دینا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے اناجیل کے مصنفین ان معلومات کے جوانہوں نے درج کیں عینی شاہد نہیں تھے۔ وہ صرف ترجمان تھے جنہوں نے ان معلومات کا اظہار

کیا جو سیدھے طریقے پر ایسی خبریں تھیں جن کو مختلف یہودی، عیسائی فرقوں نے حضرت یسوع مسیح کی قومی زندگی سے متعلق محفوظ کیا تھا اور جو زبانی روایات اور ایسی تحریروں کے ذریعے منتقل ہوئی تھیں جن کا آج کوئی وجود نہیں ہے اور جو زبانی روایت اور قطعی متون کے بیچ میں ایک درمیانہ درجہ تھا۔

آج اس روشنی میں یہودی و عیسائی صحف کا جائزہ لینا چاہیے اور معروضی طریقہ اختیار کرنے کے لیے وہ کلاسیکی تصور ترک کر دینا چاہیے جو ماہرین نے تفاسیر میں پیش کیا ہے۔

ذرائع کی کثرت کا ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ تناقضات اور اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کی بہت سی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔ اناجیل کے مصنفین کا (جب وہ یسوع مسیح کے متعلق گفتگو کرتے ہیں) بعض واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے میں وہی رویہ ہوتا تھا جو اپنی بیانیہ نظموں میں فرانسیسی متوسط دور کے ادب کے شعراء کا ہوتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ واقعات ہر انفرادی بیان کرنے والے کے نقطہ نظر کو ظاہر کرتے تھے اور اس لیے اکثر حالتوں میں جو واقعات بیان کیے جاتے تھے ان کا استناد بے انتہا مشکوک و مشتبہ ہو گیا ہے۔ اس چیز کے پیش نظر یہودی عیسائی صحیفوں میں سے ان چند بیانات کا جو جدید معلومات سے کچھ علاقہ رکھتے ہیں جائزہ ہمیشہ اس خزم و احتیاط سے لینا چاہیے جو ان کے استناد کی مشتبہ نوعیت کا اقتضا ہے۔

تضادات، ناممکنات اور تناقضات جو جدید سائنسی معلومات سے ہوتے ہیں۔ ان کو ان الفاظ میں بہ آسانی بیان کیا جا سکتا ہے۔ جن کے بارے میں صدر

میں بتایا جا چکا ہے لیکن عیسائیوں کو زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ جدید مطالعہ کے بہت سے بدیہی نتائج میں دھوکہ دینے کی غرض سے متعدد سرکاری شارحین کی ایسی مسلسل اور دوررس کوششیں رہی ہیں کہ انہوں نے عذر خواہانہ ترنم ریزی سے نغمہ کے سروں کو ترتیب دے کر بڑی چالاکی کے ساتھ منطقی نوعیت کے مداریوں کا کردار ادا کیا ہے۔ اس کی واضح مثال حضرت یسوع مسیح کے وہ نسب نامے ہیں جو متی اور لوقا نے دیئے ہیں جن میں باہم تضاد ہے اور جو سائنسی اعتبار سے ناقابل قبول ہیں۔ بعض ایسی مثالیں پیش کی گئی ہیں جن سے اس رویہ کا صاف طور پر اظہار ہوتا ہے۔ یوحنا کی انجیل پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ اس میں اور باقی تین انجیلوں کے درمیان بڑے اہم اختلافات ہیں۔ بالخصوص یہ حقیقت سامنے ہے کہ اس انجیل میں مقدس عشائے ربانی کا تذکرہ نہیں ہے اور یہ بات عام طور پر لوگوں کے علم میں نہیں ہے۔

نزول قرآن کی ایک تاریخ ہے جو بنیادی طور پر ان دونوں سے مختلف ہے اس کا پھیلاؤ لگ بھگ بیس سال کی مدت پر ہے۔ جیسے ہی یہ حضرت جبرائیل کے ذریعے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پاس پہنچتا تھا ویسے ہی اہل ایمان اس کو حفظ کر لیتے تھے پھر اس کو حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کے دوران ضبط تحریر میں بھی لے آیا گیا تھا۔ قرآن کریم کی آخری تنقیحات خلیفہ الرسول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کی گئیں۔ جس کی ابتداء نبی کریم ﷺ کی رحلت کے بارہ سال بعد اور انتہا چوبیس سال بعد ہوئی۔ اس وقت یہ فائدہ حاصل تھا کہ جن لوگوں کو قرآن پہلے ہی سے حفظ یاد تھا ان سے اس کا موازنہ کر لیا جاتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے بوقت

نزول ہی اس کو یاد کر لیا تھا۔ اور بعد میں برابر اس کی تلاوت کرتے رہے تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ متن کو اسی وقت سے پوری دیانت داری سے محفوظ کیا گیا ہے اس کی وجہ سے استناد کا کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن مجید ان دونوں صحیفوں سے جو اس سے قبل نازل ہوئے تھے بڑھ چڑھ کر اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہے اور اپنے بیانات کے لحاظ سے تضادات و تناقضات سے پاک ہے۔ جب کہ اناجیل میں انسان کی کارگزاریوں کی علامت پائی جاتی ہے قرآن کریم کی ان لوگوں کے لیے جو معروضی طور پر اور سائنسی اعتبار سے اس کا جائزہ لیتے ہیں ایک الگ خوبی ہے۔ وہ خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسے بیانات موجود ہیں (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) جو سائنس سے مربوط ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات ناقابل تصور ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے زمانہ کا کوئی شخص اس کا مصنف ہو سکتا۔ (۱) یہی وجہ ہے کہ جدید سائنسی معلومات ہی نے ہمیں قرآن کریم کی بعض آیات کو سمجھنے کا موقع دیا ہے جن کی توضیح کرنا اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔

بائبل اور قرآن کے ایک ہی مضمون کے کئی بیانات کے موازنہ سے وہ بنیادی اختلافات ظاہر ہوتے ہیں جو اول الذکر کے بیانات کے جو سائنسی اعتبار سے ناقابل قبول ہیں اور موخر الذکر کے بیانات کے جو جدید معلومات سے ہم آہنگی رکھتے ہیں، درمیان دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً تخلیق اور طوفان عالمگیر کے واقعات ہیں۔ البتہ بائبل کا ایک انتہائی ضروری تکملہ جو قرآن مجید کے متن میں خروج کی تاریخ کے موضوع پر ہے اثریاتی تحقیقات کے ساتھ بے انتہا مطابقت رکھتا ہے۔

یہ تحقیقات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے تعین سے متعلق ہے۔علاوہ ازیں دیگر موضوعات پر قرآن اور بائبل میں بڑے اختلافات ہیں۔ یہ اختلافات اس دعویٰ کو غلط ثابت کر دیتے ہیں جس میں بغیر ذراسی شہادت کے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے قرآن کا متن پیش کرنے کے لیے بائبل کی نقل کر ڈالی۔ جب سائنس سے متعلق بیانات کا جو ان احادیث کے مجموعہ میں پائے جاتے ہیں۔ جن کا انتساب حضرت محمد ﷺ سے کیا جاتا ہے لیکن جن میں سے اکثر مشتبہ ہیں (حالانکہ وہ اس دور کے عقائد کی عکاسی کرتے ہیں) قرآن میں شامل اسی قسم کی معلومات سے تقابلی موازنہ کیا جاتا ہے تو غیر یکسانیت اس قدر واضح ہوتی ہے کہ ان دونوں کے ایک ہی ماخذ ہونے کا تصور خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے زمانہ کی معلومات کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے یہ بات نا قابل تصور معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کے بہت سے وہ بیانات جو سائنس سے متعلق ہیں کسی بشر کا کام ہو سکتے ہیں لہذا یہ بات مکمل طور پر صحیح ہے کہ قران کو وحی آسمانی کا اظہار سمجھا جائے لیکن ساتھ ہی اس استناد کے سبب جو اس سے فراہم ہوتی ہے نیز ان سائنسی بیانات کی وجہ سے جن کا آج بھی مطالعہ کرنا بنی نوع انسان کے لیے ایک چیلنج ہے، اس کو ایک انتہائی خصوصی مقام حاصل ہے۔

تمت

. . . .

حواشی

۱۔ مصنف علام کا مقصد یہ بتانا ہے کہ جب قرآن میں اس زمانہ کے خیالات سے مختلف خیالات ملتے ہیں تو لازمی طور پر یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اس کو کسی انسان نے خود تصنیف نہیں کیا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔اختتام۔۔۔۔۔۔۔۔